زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

سوادِ حُور

ساتھ لے چل ہمیں خلاباز ن
ہوں سماوات میں بھی تیرا امن

سال نوری ہو یا جام قنطاری
ہم رہیں آسمان پر بھاری

برق پاشی کیا کریں نیوران
لفظ ڈھل جائیں حفظ ہو فرمان

پھر زمیں رنگ ہو نئی آباد۔
دھوم اپنی زبان کی ہو اُستاد

تیری دنیا سے امید ہو صعوبت
عالیہ روح و مسکن عظمت

زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

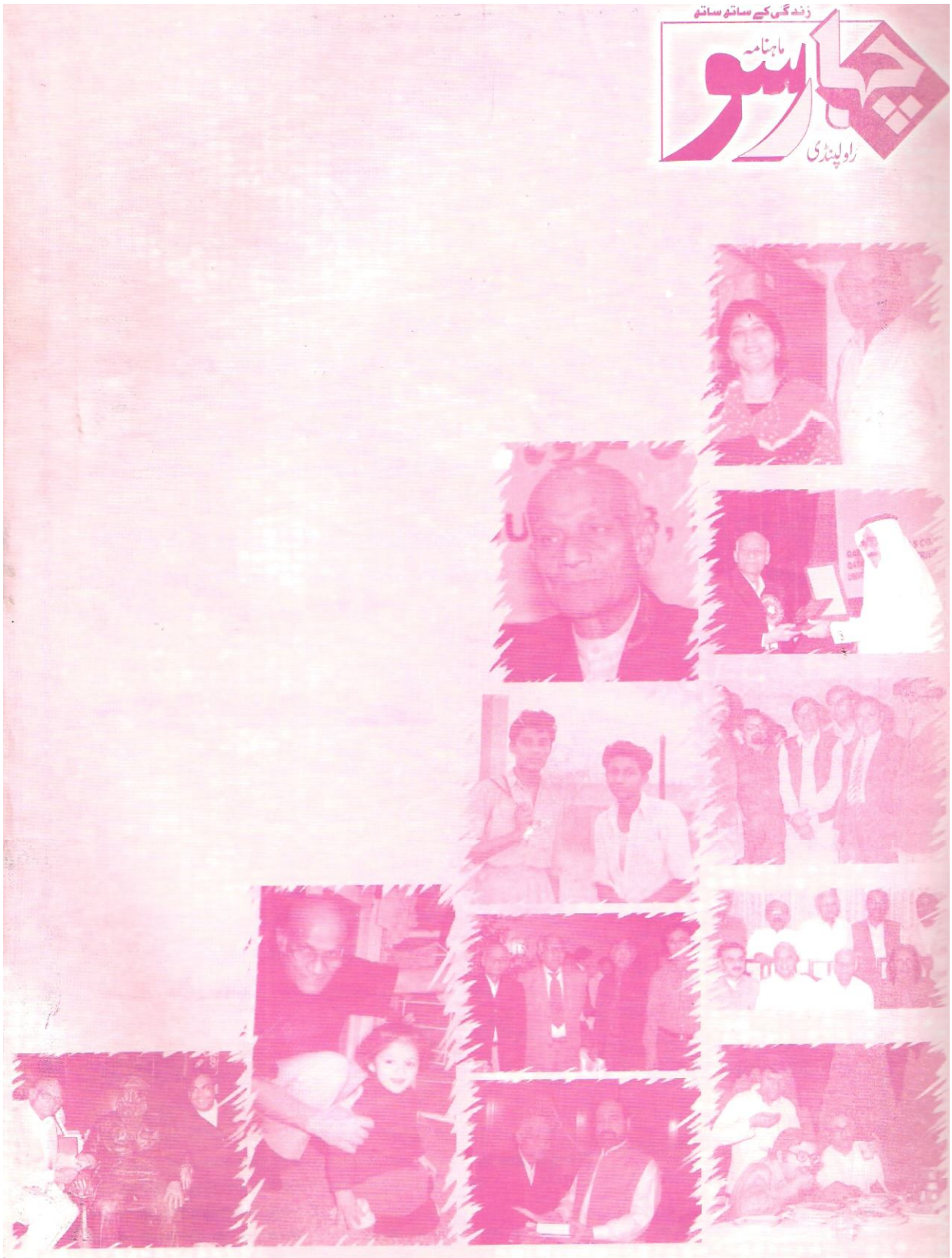

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہار سو

جلد:۱۷ شمارہ جنوری، فروری ۲۰۰۸ء

مجلس مشاورت

قارئین چہار سو

زرسالانہ

دل مضطرب نگاہ شکیبانہ

چہار سو کا زیر نظر شمارہ!

عالمی استعمار کے حضور

امن کی خواہش

امن کی آرزو

امن کی التجا

اور

امن کی درخواست

سے

منسوب ہے

بانی مدیر اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

مدیر معاون

رابطہ: 537، سیکٹر جی-III، راولپنڈی۔ فون: 92-51-5462495 فیکس: 5467235 ای میل: waqars_oma@yahoo.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس مکہ نگر راولپنڈی

متاعِ چہار سُو

سرِ ورق، پسِ ورق.......... شعیب زیدی
کمپوزنگ..................حافظ انعام الحق

قرطاسِ اعزاز......

WITH DUE APOLOGY........اسد محمد خان 4
میں کیوں لکھتا ہوں............اسد محمد خان 6

افسانہ.......

برجیاں اور مور..................اسد محمد خان 7

نظمیہ کلام............

منظر پر کوئی چاند.......... صفوت علی صفوت 10
دعائے جنگ.................اسد محمد خان 15
براہِ راست..................... گلزار جاوید 17

مقالے..........

جمالیاتی ذوق کا امین.......... عقیلہ اسمٰعیل 23
نئے زمین نئے آسمان.......... مبین مرزا 28
اسد محمد خان کا جہانِ فن .... مظہر جمیل 38

افسانہ........

مئی دادا..................اسد محمد خان 42

خطوط..........

زندگی سے مجھ کو پیار ہے.........فاری شا 48

ریگِ صحرا....... 54

سعید رحمانی، اسلم راہی، حامدی کاشمیری، خورشید انور رضوی، علیم صبا نویدی، کرشن پرویز، مظہر بخاری، ناصر عباس ناصر

افسانے..........

بلا چیمپئن ....اصغر ندیم سید 58
دل کی آبروریزی...............سلطانہ مہر 62
مانوسیوا اسمیتی................. کوثر صدیقی 65

گل و گلزار کا رنگ......... 66

محمود الحسن، محسن احسان، مشکور حسین یاد، مظفر حنفی، شبنم شکیل، مامون ایمن، انور سدید، کرشن کمار طور، خالد حمید، جبین جوہر، سرور انبالوی، غالب عرفان، غلام مرتضیٰ راہی، قیصر نجفی، تشنہ بریلوی، رب نواز مائل، رضا رامپوری، ماجد سرحدی، گلشن کھنہ، اسلم راہی، خورشید انور رضوی، مہندر پرتاب چاند۔

افسانے..........

یہ وفا کی سخت راہیں................ مشتاق اعظمی 77
بھرم............................ یحییٰ یوسفی 78
مشرقی لڑکی.........................رینو بہل 82

گھر سے باہر کرنیں.......... 84

زہیر کنجاہی، ملک زادہ جاوید، انوار فیروز، سیفی سرونجی، صدیق شاہد، محسن جلگانوی، کرامت بخاری، کرشن پرویز، شاہد رحمٰن، پنہاں، شاہد عزیز، محمد ظہیر، حسیر نوری، اکرام تبسم، صابر عظیم آبادی، شگفتہ نازلی، علی آذر، فیصل عظیم، عرفان عابدی، جواز جعفری، اختر رضا سلیمی، عبداللہ سلیم، مشتاق شبنم، علی شاہ، عارف شفیق، شارق بلیاوی، شہاب صفدر، سجاد مرزا، احمد ظہور، پرویز ساحر۔

نشانِ راہ.............

کافکا کی کہانی........................ ممتاز احمد 94

آئینہ فن...........

پیرہن عشق ....ڈاکٹر اسماعیل آزاد 96

حیاتِ جاوداں...............

حادثہ غم...........................حماد خاور 98

معبود کے در پر.............. 99

ستیہ پال آنند، عبد العزیز خالد، ندا فاضلی، غالب عرفان، شگفتہ نازلی، یوگیندر بہل تشنہ، قیصر نجفی، رفعت سروش، محمد سالم، حمیدہ معین رضوی، یونس صابر، خیال آفاقی، ممتاز احمد، بھگوان داس، انوار فیروز، علی آذر۔

تخلیقِ عصر................

تازہ تصانیف کا تعارف.......... عطیہ سکندر علی 109

رس رابطے................ 112

درشن

"انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند"

کیسی انوکھی بات رے
تن کے گھاؤ تو بھر گئے، داتا
من کا گھاؤ نہیں بھر پاتا
جی کا حال سمجھ نہیں آتا
کیسی انوکھی بات رے

"انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند"

پیاس بجھے کب اک درشن میں
تن سلگے بس ایک لگن میں
من بولے رکھ لوں نینن میں
کیسی انوکھی بات رے

"انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند"

○○○

قرطاسِ
اعزاز
اسد محمد خان
کے
نام

○○○

(WITH DUE APOLOGY)

اسد محمد خاں

میں پٹھانوں کے قبیلے 'اورکزئی' خاندان میر عزیز خیل میں ۱۹۳۲/۹/۲۶ء کو شہر بھوپال میں پیدا ہوا۔ ریاست بھوپال کے بانی خان معظم سردار دوست محمد خاں (آٹھ راست واسطوں سے) میرے جد ہیں۔ والد میاں عزت محمد خاں صاحب کی تعلیم بھوپال، علی گڑھ اور کچھ عرصے ٹیگور کے شانتی نکیتن میں ہوئی تھی۔ وہ مقامی ہائی اسکول میں مصوری کی تعلیم دیتے رہے۔ (with due apology) دادا جاگیردار/زمیندار تھے تا ہم انھوں نے کاشتکاری سے اور مزارعین سے متعلق رہ کر جاگیرداری کی برکات ' سے خود کو بچائے رکھا۔ والدہ محترمہ رجہاں بیگم صاحبہ غالب کے شاگرد نواب یار محمد خاں شوکت کی پوتی تھیں۔ نانا سردار سلطان محمد خاں سلطان کو ریاست سے جاگیر ملی تھی۔ انھیں بھی شاعری سے شغف تھا۔

میں نے ۱۹۴۹ء میں شاہجہانی ماڈل ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ کچھ ماہ حمیدیہ کالج بھوپال میں پڑھا۔ پھر مئی ۱۹۵۰ میں تنہا پاکستان آ گیا۔

یہاں آ کر ریلوے والٹن ٹریننگ اسکول، والٹن، لاہور میں اسٹیشن ماسٹری کی یکسالہ تربیت کے بعد تعیناتی ہوئی تاہم ریلوے کا ماحول ساز گار نہ پا کر ملازمت ترک کر دی اور کراچی میں جناح کالج میں انٹرمیڈیٹ مکمل کیا۔ جے جے اسکول اوف آرٹ، بمبئی سے کمرشیل آرٹ کا ڈپلوما کیا تھا تو کچھ روز کمرشیل آرٹسٹ کی طور پر کام کیا پھر کراچی پورٹ ٹرسٹ کے ٹریفک ڈپارٹمنٹ میں ملازمت اختیار کی۔

دوران ملازمت سندھ مسلم آرٹس کالج سے بی اے کیا۔ پھر کراچی یونیورسٹی کے انگریزی ادب کے شعبے میں داخلہ لیا، دو سال گزارے۔ مالی مسائل کی بنا پر ماسٹرز ڈگری لیے بغیر تعلیم منقطع کی۔ اس تمام عرصے کے پی ٹی کی ملازمت (جون ۱۹۹۳ء تک) جاری رہی۔ انسپکٹر امپورٹس کے فرائض ادا کرتے ہوئے ریٹائرمنٹ لی۔ ۱۹۶۰ سے شاعری کا آغاز ہوا تھا۔ ساتھ ہی ریڈیو کے لیے خاکے لکھتا رہا تھا۔ افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۷۰ سے ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں شادی ہوئی۔ اس سے قبل دہلی کلاتھ مل کے ہند و پاک مشاعرے میں دہلی مدعو کیا گیا تھا۔ اس سال کراچی سے نا بش دہلوی، مولانا ماہر القادری، برادرم اطہر نفیس صاحبان اور یہ خاکسار پہلی بار دہلی کلاتھ مل کے مشاعرے میں شریک ہوئے تھے۔ ان ساتھ ہی سے دونوں ملکوں کی ادبی رسائل میں میری نظمیں اور گیت چھپتے رہے تھے۔ بعد کو علی گڑھ کے شعبہ اردو کے سربراہ، شاعر و نقاد پروفیسر خلیل الرحمن اعظمی نے اپنی تصنیف "نئی نظم کا سفر" میں میری ایک نظم کو اس دور کی نمائندہ نظموں کی فہرست میں شامل کیا۔ یہ کتاب علی گڑھ یونیورسٹی اور ہندوستان کی چند اور یونیورسٹیوں میں ایم اے کے extended مطالعے کے نصاب میں شامل کی گئی ہے۔

عرض ہے کئی سال دو سال پہلے تک میری ایک کہانی "ترلوچن" برطانیہ کے A-Level کے اردو مطالعے کے نصاب میں شامل تھی۔

میں نے ٹی وی کے لیے ۱۵۰ سے زیادہ گیت لکھے ہیں جن میں سے بعض خاصے مشہور ہوئے:

مثلاً ☆ انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند ☆ سورج بن کے جیا آدمی آئے دیا جلائے رکھنا ہے ☆ رخصتی کا گیت نہیں تو چلی اے دی سکھیو بدیسوا اپنی سہیلیوں سے دور بابل کی گلیوں سے دور ☆ زمیں کی گود رنگ سے، امنگ سے بھری رہے ☆ تم سنگ نیناں لاگے مانے نہیں جیا رے پیا پیا بولے پیا من کا پپیہا را...

ٹی وی کے لیے کئی ڈراما سیریل لکھے تھے، یہ کام اب چھوڑ چکا۔ جنھیں مقبولیت ملی ان میں ایک "شاہین" ہے جسے میں نے سلیم احمد کے ساتھ مل کر لکھا تھا

-2-

علاوہ ازیں، میرے سیریلوں میں "منڈی" ـ "الزام" ـ "سفر" ـ "دل دریا" ـ "پارٹیشن ایک سفر" ـ "زبیدہ" وغیرہ اور کئی لانگ پلے "مثلاً" شیر شاہ سوری" شامل ہیں۔

سال ۱۹۹۱ء میں مجھے ایک ادبی کانفرنس میں بریڈفرڈ (انگلینڈ) بلایا گیا جہاں میں نے ایک پیپر "انگلستان میں اردو تخلیقی سرگرمیاں" پڑھا اور کئی شہروں میں مشاعروں میں شریک ہوا۔ ٹی وی تحریروں کی مصروفیات کے سلسلے میں انگلستان کے علاوہ فرانس، پرتگال، اسپین اور تھائی لینڈ کے دورے کیے۔ فی الحال نئیں مکالمہ میں اُن یادداشتوں کو ادب کے قارئین کے لیے سفرنامے کی صورت میں لکھ رہا ہوں، ۷ قسطیں شائع ہو چکی ہیں۔

تصانیف کی تفصیل یہ ہے:

(۱) کھڑکی بھر آسمان (افسانے، نظمیں) 1982 (۲) برج خموشاں (افسانے) 1990 (۳) غصے کی نئی فصل (افسانے) 1997 (۴) رکے ہوئے ساون (گیت) 1997 (۵) نربدا اور دوسری کہانیاں (افسانے) 2003۔ ان دو ہزار چھ میں "تیسرے پہر کی کہانیاں" اور اب تک کی لکھی کہانیوں کا مجموعہ "جو کہانیاں لکھیں"۔

Oxford University Press نے 2002 میں (اپنے سلسلے Pakistan Writers Series کے تحت چھٹی کتاب (The

Harvest of Anger & Other Stories شائع کی۔ جس میں ۱۴ کہانیوں کے انگریزی تراجم پر مشتمل ہے۔ اس سے پہلے اسی ادارے نے آصف فرخی کی مرتب کردہ ایک انتھولجی Fires in an Autumn Garden کے عنوان سے شائع کی تھی جس میں میری ایک کہانی کا ترجمہ شامل کیا گیا تھا۔

2004 میں Penguin Books (India) نے "*A LETTER FROM INDIA,Contemporary stories from Pakistan*" کے عنوان سے ایک انتھولجی شائع کی جس میں میری ایک کہانی کا ترجمہ شامل کیا گیا۔

جرمن مستشرق ڈاکٹر این میری شمل اور پاکستانی اسکالر ڈاکٹر منیر ڈی احمد کا مدوین کیا ہوا پاکستانی ادب کا ایک جائزہ ہیمبرگ سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا جس میں میری ایک نظم "کھڑکی بھر آسمان" کا جرمن ترجمہ شامل ہے۔

Indian Institute of Advanced Studies,Simla نے Breakthrough_Modern Hindi & Urdu Short Stories کے عنوان سے ایک انتھالجی (انتخاب و مدوین ڈاکٹر شنکر بیلا پل گمار) ۱۹۹۳ء میں شائع کی جس میں میری کہانی "زہر پی خموشاں" شامل ہے۔

جن ملکی اور غیر ملکی جرائد میں میری تحریریں اور ان کے تراجم شامل کیے جاتے ہیں ان میں وسکانسن، میڈیسن کے جنوبی ایشیا مرکز کا جریدہ The Annual of Urdu Studies بھی ہے جسے علامہ میمن کے لائق فرزند، اسکالر، ڈاکٹر محمد عمر میمن ترتیب دیتے ہیں۔

بہ یک وقت پاکستان اور امریکہ میں فعال ایک غیر سرکاری ادبی تنظیم فیض محمد فاؤنڈیشن نے مجھے سال ۲۰۰۲ کا "احمد ندیم قاسمی ایوارڈ برائے فکشن" عطا کیا۔ میرے افسانوں کے مجموعے "ترجا" کو سال ۲۰۰۳ کی بہترین تصنیف کا قومی ایوارڈ (بابائے اردو مولوی عبدالحق ایوارڈ) عطا کیا گیا۔ گیارھواں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ ۲۰۰۷ء (دوحہ، قطر) عطا کیا گیا۔ ۲۰۰۷ء میں سندھ کا شیخ ایاز ایوارڈ عطا ہوا۔

۱۹۹۳ء میں بہاء الدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان کی ایم اے کی ایک طالبہ نے یونیورسٹی کے صدر شعبہء اردو کی زیر نگرانی ایک تھیسس پیش کیا جسے بعد میں اشاعت کے لیے منظور کیا گیا۔ عنوان تھا "اسد محمد خاں شخصیت اور فن"۔

-3-

پنجاب یونیورسٹی، ایم اے سال ۲۰۰۳ء کی ایک طالبہ نے ایک تھیسس "اسد محمد خاں شاعر اور کہانی کار" کے عنوان سے ۲۰۰۴ء میں پیش کیا جسے اشاعت کے لیے منظور کیا گیا۔ اطلاع ہے کہ طالبہ کو وسیع تر تحقیق کے لیے، ایم فل کی سطح پر اسی موضوع کی منظوری دی گئی ہے۔

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے شعبہ اردو نے فکشن میں میرے کام پر ایک اسکالر کو پی ایچ ڈی کی سطح کی تحقیق پر مامور کیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ سن ۲۰۰۸ء میں تحقیقی کام تکمیل کو پہنچے گا۔

مجھے ایک ٹیلی ویژن سیریل کی اسکرپٹ رائٹنگ پر آڈیو وژول میڈیا کا معروف و مقبول "نگار ایوارڈ ۱۴" عطا کیا گیا ہے۔

ضیا محی الدین میری دو کہانیوں، "باسودے کی مریم" اور "مئی دادا" کو بار ہا BBC پر اور بیرون ملک کی تہذیبی مراکز اور یونیورسٹیوں کے اردو ڈپارٹمنٹس میں اپنے مخصوص تخلیقی انداز میں پڑھ کر سناتے رہے ہیں۔

میری تحریروں کو ہندی، گجراتی، پنجابی، مراٹھی اور مختلف علاقائی زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کیا جا چکا ہے۔

ان مرحمتوں کے لیے میں اپنے پروردگار کا شکر گزار ہوں۔

ای میل: asadmkhan@yahoo.com

☆☆☆

بقیہ: تخلیق عصر

خیال کی تھی مگر ملک کے دو قد آور اہل قلم کی جناب سے علی شاہ کی بابت تحسین کے بعد ہمارے لئے کچھ کہنے سے زیادہ اپنے سینئر و بلند قامت اہل قلم کی رائے کو ولیت دینا ہے۔

''جب کبھی پاکستان کے مضافات میں لکھی گئی کوئی خوبصورت تخلیق مجھے دستیاب ہوتی ہے تو مجھے فوراً صحرائی پھول کا خیال آجاتا ہے۔ ہماری دھرتی بانجھ نہیں ہے۔ ہماری نوجوان نسل باصلاحیت، جفاکش اور محب وطن ہے۔ علی شاہ کے یہ کالم مقامی اخبارات کی زینت بنے ہیں مگر کسی قومی اخبار کے معیار سے کم نہیں۔ علی شاہ ہر موضوع پر لکھتا ہے اور بے تکان لکھتا ہے۔ علی شاہ کو زبان و بیان پر دسترس بھی حاصل ہے اور اس کا مشاہدہ عمیق بھی ہے اور تخلیقی بھی..... ''بشریٰ رحمن

''علی شاہ نے بہت خوبصورت کالم لکھے ہیں۔ مقامی لہر کو قومی دھارے میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ علاقائی معاملات اور مسائل بھی قومی معاملات اور مسائل ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں علی شاہ قومی سطح کا مقامی کالم نگار ہے جس کی نذر میں اپنا ایک بھولا ہوا مصرعہ کرنا چاہوں گا۔ ع

اس دی اکھ وچ تکنے تینوں دھرتی دے سب رنگ..... ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

''دھرتی کے رنگ'' ایک سو بیس روپے کے عوض تعمیر فاؤنڈیشن پریس کلب مظفر گڑھ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

☆☆☆

میں کیوں لکھتا ہوں

اسد محمد خاں

قارئین! اس بارے میں بہت سی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔

یعنی: میں اس لیے لکھتا ہوں کہ میرا Personal اپنا اظہار چاہتا ہے۔

اور میں اس لیے لکھتا ہوں کہ ایک یہی کام مجھے آتا ہے۔ اب تک یہی کام میں ڈھنگ سے کرسکا ہوں۔

اور میں اس لیے لکھتا ہوں کہ میرے پاس کہنے کے لیے بہت سی باتیں ہیں اور (شاید) یہ باتیں، میں بہت سوں سے زیادہ دل چسپ اور پُر اثر انداز میں کہہ سکتا ہوں.....وغیرہ وغیرہ۔

بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ صفحے کے صفحے سیاہ کیے جا سکتے ہیں۔

اور ایک بات تو رہ ہی گئی۔ جی ہاں، میں اس لیے بھی لکھتا ہوں کہ بعض چیزیں لکھنے کے پیسے وصول کرتا ہوں اور سنا ہے پیسے کے بغیر ڈھنگ سے زندہ نہیں رہا جا سکتا۔

اوپر کہی گئی سبھی باتیں درست ہیں اور کوئی ایک بات بھی قطعی اور حتمی اور مطلق نہیں ہے۔

قصہ یہ ہے کہ لکھنے والے کو "بیان کر دینے" یا بیان کیا ہوا "بار بار پڑھنے کے لیے محفوظ کرنے" کی سہولت ہمیشہ سے حاصل رہی ہے اور اس طرح محفوظ کر دیا جانا، ایک اعتبار سے چھوٹا موٹا دوام حاصل کرنے کے برابر ہے۔

مگر یہ سہولت تو مصور اور بت تراش کو بھی حاصل ہے۔

اور جناب والا! ٹکنالوجی کی ترقی کے بعد آواز کو اور شبیہ کو محفوظ کرنے کا طریقہ آ گیا تو بیان کرنے اور اس بیان کیے ہوئے کو بار بار سننے اور دیکھ سکنے کی یہ سہولت موسیقار کو اور گائیک کو، رقاص اور تمثیل کار کو بھی حاصل ہو گئی۔

لیجیے.... لکھنے والے کا افتخار اور انوکھا پن اور اوپر بیان کیا گیا چھوٹا موٹا دوام سب دھرا کا دھرا رہ گیا!

اب اگر لکھنے والے کو مصور پر اور بت تراش پر —— اور موسیقار، گائیک، رقاص اور تمثیل کار پر سبقت لے جانے کا شوق ہے تو اسے کچھ ایسا کر کے دینا پڑے گا کہ جو اپنے جوہر میں..... اپنے Concept میں تازہ، طاقت ور، سچا اور خالص ہو۔

پھر ہو سکتا ہے اس کے لکھے ہوئے کو اپنے اپنے میڈیم سے مصور اور موسیقار اور تمثیل کار وغیرہ وغیرہ بیان کریں اور لکھنے والے کا بول بالا ہو۔

گویا گھوم پھر کر اور ٹھہر کر بالآخر یہی سامنے آیا کہ دیانت داری سے کہی گئی تازہ، طاقت ور اور دلآویز بات ہر فنِ لطیف کا بنیادی جوہر بن سکتی ہے۔

"بات"..... یعنی لفظوں میں بیان کی گئی، لکھی گئی بات۔

معزز قارئین! میں اس تازہ کار، طاقت ور اور دلآویز "بات" ہی کی تلاش میں لکھ رہا ہوں اور کسی بھی مصور، بت تراش، موسیقار، گائیک، رقاص، تمثیل کار وغیرہ پر سبقت لے جانے کا ہوس مند ہوں۔

میرے پاس سنانے کو بہت دل چسپ قصے ہیں۔ بہت سے دلآویز کردار ہیں جن سے میں اپنے پڑھنے والوں کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ بات کہنے کے بہت سے پیرائے، بہت سے ڈھنگ میں نے سیکھ لیے ہیں جن کا کوئی Atractive Package بنا کر میں اپنے پڑھنے والوں کو لبھا سکتا ہوں۔ انھیں اپنی لکھت کی طرف توجہ دلا سکتا ہوں۔

بہت سے دل چسپ کردار میں نے اس بساط پر کھیل بھی دیے ہیں مثلاً: "مئی دادا"، "باسودے کی مریم" اور کہانی "ترلوچن" کا عین الحق، "گھس بیٹھیا" کا ہیر یا رخاں، "چاکر" کا فضل علی قریشی اور حافظ شکر اللہ خاں گینڈا، جو گینڈا "غصے کی نئی فصل" میں ظہور کرتا ہے۔

ان کے علاوہ بھی بہت سے کردار اپنا اظہار چاہتے ہیں.....وہ برابر چلے آ رہے ہیں۔

وہ اپنے لکھے جانے پر برابر اصرار کر رہے ہیں۔ مجھے ستائے جاتے ہیں۔

اُن میں کا ایک مہا مائی گنج کا کی کاری (یا ہاری) مٹھو مام کا، میرا تقریباً ہم عمر ہے جو میرے عزیزوں کے آڑو کے درختوں کو پانی دیتا تھا اور جسے ایک روز آڑو کے ایک درخت سے باندھ کر پیٹا گیا تھا کیوں کہ اس نے ایک پھل توڑ کے کھا لیا تھا۔ مٹھو کے پیٹے جانے پر میں نے اپنے بڑوں کے خلاف "خروج" کیا تھا اور خود پٹتے پٹتے بچا تھا تاہم بڑوں نے میرے احتجاج پر (یا خود اپنے اندر کی کسی ڈھیٹ آواز سے مجبور ہو کر) مٹھو کو فوراً ہی درخت سے کھلوا دیا تھا اور تالیفِ قلب کے لیے اسے اپنی جاگیر سے دو روپے عطا کیے تھے۔ میرے منع کرنے پر بھی مٹھو نے اُن کے وہ دو روپے لے لیے تھے، جس کا مجھے آج تک افسوس ہے۔

باقی: براہ راست میں۔

بُرجیاں اور مور

اسد محمد خاں

لاجی بائی امیر گڑھ والی نے تقسیم کے فوراً بعد یہاں آ کر نیپئر روڈ کا یہ فلیٹ بسالیا تھا۔

لاجی بائی اپنی ایک نوچی اور ایک لے پالک لڑکے کے ساتھ بمبئی کے بیلارڈ پیئر سے جہاز پر سوار ہوئی تھی اور جہاز سے اُتر کر یہاں کیماڑی کے میول مینشن میں سوتی سیٹھ شکار پوری کے فلیٹ میں پندرہ روز ٹھہری تھی۔

وہ ایسے ہی نہیں چل پڑی تھی، بڑا مال لائی تھی۔ اسی لیے سوتی سیٹھ کے مشورے سے اس نے نیپئر روڈ پر چوراہے کا یہ فلیٹ خرید لیا۔ پھر ایک شاگرد سے چار شاگردیں ہو گئیں اور وہ جم کر اپنی بیٹھک چلانے لگی۔ گلابی شیڈ والی یہ لائٹیں، پنکھے صوفہ سیٹ، قالین، مخمل والے گاؤ تکیے...... جواب کملائے ہوئے، میلے میلے سے لگتے ہیں...... لاجی نے اُسی زمانے میں خریدے تھے۔

رنڈیوں، ڈیرے دارنیوں کے بارے میں افواہیں نہیں اُڑا کرتیں۔ اسکینڈل، افواہیں تو شریف زادیوں کا کھیدا ڈالنے کے لیے پھیلائی جاتی ہیں، مگر عجیب بات تھی، لاجی بائی کے بارے میں جا پانی روڈ پر اور شہر میں طرح طرح کی باتیں اُڑی ہوئی تھیں۔

کوئی کہتا تھا اس کا اصل نام لیلا ہے کوئی کہتا تھا نہیں، لیلی ہے اور یہ امیر گڑھ کے مہاراج کی درباری گائیکا تھی۔ کوئی کہتا تھا ناں جی ناں، مہاراج نے بس ڈال رکھا تھا، اسے گانا وانا تو آتا نہیں، پنڈت کوکا کاشمیری کے سب شاستر پڑھے بیٹھی تھی، سمجھو علم مسہری کی شتی تھی یہ لیلا بائی، اسی لیے تو مہاراج نے......

یہ آخری بات دل کو لگتی تھی، کیوں کہ گانے والی آواز تو لاجی کی کبھی کسی نے سنی نہ تھی۔ خیر خواہوں نے مشہور کر دیا تھا کہ نوعمری میں کویل کی طرح کوکتی تھی لاجی بائی، مگر دشمنوں نے سیندور کھلا دیا، بس بیٹھ گئی ہمیشہ کے لیے۔ خود لاجی بائی نے یہ بات کبھی مان کے نہ دی کہ اسے سیندور کھلایا گیا تھا، نہ کبھی اس نے یہ کہا کہ اسے سیندور نہیں کھلایا گیا تھا۔

جانے کس سن میں ایک بہت قریب کے آدمی نے، جواب زندہ بھی نہیں، لاجی بائی سے گانے کی فرمائش کی تھی تو لاجی نے کہا تھا کہ ڈپٹی صاحب (قریب کا آدمی ڈی ایس پی ریٹائر ہوا تھا) تو لاجی نے کہا تھا، ''ڈپٹی صاحب! ہم ایک کے لیے گاتے تھے یا ایک لاکھ کے لیے۔ اب نہ وہ ایک رہا نہ ایک لاکھ۔ اب کیا گائیں۔ ہمارے تو بول بھی یہاں سمجھ نہ آن گے کسی کو۔''

مگر یہ سب چالاکی کی باتیں تھیں۔

لاجی بائی کو گانے بجانے سے کیا ملتا جو چار مسہریاں چلانے میں یافت ہو جاتی تھی۔

گل بدن، لاجو، بیلا اور یاسمین...... دو چار برس بعد لڑکیاں بدل جاتی ہوں گی، مگر چاروں نام یہی رہتے تھے۔ اُنھیں واجبی سا گانا سکھا دیا جاتا ہوگا تا کہ مجروں کی آڑ میں سب چلتا رہے۔

مختصر یہ کہ لاجی بائی کی چار ''شاگردیں'' تھیں اور وہ لمڈا، جس کا اوپر ذکر آیا ہے، سب اُسے ''لاجی والا'' کہتے تھے۔

☆

سب مجھے لاجی والا جاوید کہتے تھے۔

ہم لوگ جب یہاں آئے تھے اور لاجی صاحب نے یہ فلیٹ خریدا تھا، اُسوقت بہت ہوا تو میں سولہ سال کا ہوں گا۔

فلیٹ پر آنے والوں سے میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی مجھ سے کام کے لیے بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ نہ ہی مجھے کسی سے کچھ لینے کی اجازت تھی۔ لاجی صاحب اس معاملے میں بہت سخت تھیں۔

پھر مجھے لوگوں میں بیٹھنے کا ڈھنگ آیا، بات کرنے کی تمیز آ گئی۔ ویسے میل جول میں نے کم ہی رکھا۔ بس ایک مظہر علی خاں تھے، بینک افسر، جن سے میری دوستی سی ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی میں اُن کے دفتر چلا جاتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ مظہر علی خاں کوٹھے پر آتے ضرور تھے مگر تماش بین نہیں تھے۔ لاجی صاحب کے ''پرستار'' تھے وہ۔ اُن کی عمر اس وقت چوبیس پچیس سال ہوگی...... مجھ سے بڑی عمر کے ہوں گے۔

میں یہ قصہ اپنی یا لاجی صاحب کی وجہ سے نہیں، مظہر علی خاں کی وجہ سے سنا رہا ہوں۔ بڑے دلیر آدمی تھے، جانے کہاں ہوں گے اب۔

مجھے یاد ہے پہلی بار وہ فلیٹ میں آئے تو دوپہر کا وقت تھا۔ خبر نہیں کیسے فلیٹ کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ لاجی صاحب لاؤنج میں بڑے تخت پر گاؤ تکیہ اور ٹیبل فین لگائے، ململ کی چادر گیلی کر کے پیروں پر ڈالے آرام سے پڑی کچھ گنگنا رہی تھیں کہ ایک خوب صورت جوان، سفید قمیص پر سرخ عنابی ٹائی باندھے، سرج کی کالی پتلون اور چمچماتے ہوئے بوٹ پہنے فلیٹ کے دروازے پر طبلہ سا بجا کے چلو کہتا ہوا گھس آیا۔

لاجی بولیں، ''کیا وحشت ہے؟ کہاں گھسے آ رہے ہو میاں؟''

یہ ''میاں'' مظہر علی خاں تھے۔ انھوں نے بڑھ کر لاجی صاحب کے پیر چھوئے۔ لاجی نے پیر سمیٹ لیے۔ وہ آنکھیں پھاڑے خاں صاحب کو دیکھے جا رہی تھیں۔

مظہر علی خاں ہنستی ہوئی آواز میں بولے، ''بہت دن سے آپ کے درشن کرنا چاہتا تھا آپ موسیقی کی تاج دار ہیں، بادشاہ ہیں اس فن کی۔''

لاجی کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ بولیں، ''برخوردار، غلط جگہ آ گئے ہو...... وہ ادھر نہیں رہتیں۔''

خاں صاحب ہنس کر بولے،''ہمارے لیے تو آپ ہی ملکہ موسیقی ہیں۔ اِس علاقے میں تو بس آپ ہی کا حکم چلتا ہے باقی سب آپ کی رعایا ہیں۔''

اس خوشامدانہ جھوٹ اور ڈھٹائی پر لاجی ایک دم ہنس پڑیں۔ وہ ہنسیں تو مظہر علی خاں خود بھی ہنسنے لگے۔ بولے،''میڈم! اِسی مہینے سامنے بینک میں اسسٹنٹ منیجر ہو کر آیا ہوں۔ اِس وقت آپ کا اکاؤنٹ مل جائے تو بہت اچھا ہے۔ کھاتا کھلوا لیجیے میری برانچ میں۔''

لاجی صاحب انھیں دلچسپی سے دیکھتے ہوئے اب گاؤ تکیے سے ٹک گئی تھیں۔ ہنس کے کہنے لگی،''برخوردار، ایسی کیا مصیبت پڑ گئی ہے جو اکونٹ کے لیے کوٹھے جھانکنا شروع کر دیے؟''

بولے،''ایک حرام الدہر المرکز گیا ہے۔ کہتا ہے اسسٹنٹ سے پکا منیجر اُس وقت تک نہیں بننے دوں گا جب تک اِتنی رقم کے اِتنے اِتنے کھاتے نہیں کھلواؤ گے۔''

''پھر؟ کوئی کھاتا کھولا بھی یا ایسے ہی؟''

مظہر علی خاں کہنے لگے،''میں تو آپ کے سوا یہاں کسی کو جانتا نہیں۔ اور میرا منیجر، وہ بالکل ہی گیا گزرا دنُو آدمی ہے۔ وہ تو آپ کو بھی نہیں جانتا، اتنا ٹھیک ہے۔ صبح پونے نو بجے گاڑی سے اتر کر بینک میں گھس جاتا ہے پھر پونے پانچ بجے اندر سے نکل کے گاڑی میں...... اور چالیس کی اسپیڈ سے اُڑتا ہوا اس علاقے سے باہر۔''

لاجی صاحب نے کہا،''سبحان اللہ!''

مظہر خاں بولے،''تو پھر بسم اللہ کیجیے...... بچیوں کو بھی بلوا لیجیے۔ میں کھاتوں کے بارے میں اُنھیں بھی سمجھا دوں گا۔'' پچیس چھبیس برس کے اِن خاں صاحب نے ''بچیوں'' کا ذکر جس طرح کیا تھا اس سے لاجی بس نہال ہو گئیں۔ بہت دیر تک منھ پر ہاتھ رکھے ہنسی روکنے کی کوشش کرتی رہیں، پھر ایک دم ہنسی میں جیسے پھوٹ پڑیں۔

مظہر علی خاں معصوم شکل بنائے کبھی لاجی کو کبھی مجھے دیکھتے رہے۔ لاجی ہنسے جا رہی تھیں تو خاں صاحب مجھ سے بولے: ''بھیا، ذرا بلا لو سب کو...... ٹائم کم ہے۔''

میں نے لاجی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے ہنستے ہنستے ہاں میں سر ہلا کے مجھے لڑکیوں کو بلانے کا کہہ دیا۔

مظہر علی خاں ہنستی ہوئی لاجی کو سمجھانے لگے،''میڈم، ہنسی کی بات بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔ دیکھیے نا، گنتی کے دن ہیں اور لاکھوں روپے کے اکاؤنٹ کھولنا ہیں۔ آپ ہی بتایے، میں گھٹنوں اور پیروں کو ہاتھ نہ لگاؤں تو اور کیا کروں؟''

فرصت کا وقت تھا۔ لڑکیوں نے لاجی صاحب کی ہنسی کی آواز سن لی تھی۔ انھوں نے لاؤنج میں جمع ہونا شروع کر دیا تو خاں صاحب ایک ایک کو سمجھا کر بچت اور بینکاری کے فائدے بتانے لگے کہ دیکھیے، انسان کتنا غیر محفوظ ہوتا ہے اور عورتیں تو آپ جانتی ہیں بہت ہی زیادہ غیر محفوظ ہوتی ہیں...... خاص طور پر وہ خواتین جنھیں اپنے پیشے میں چمکنے کے لیے بہت کم ٹائم ملتا ہے جیسے آپ لوگ......

''خواتین'' اور ''پیشے'' کے لفظ سن کے تو لاجی کے ساتھ سب ہی نے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔

خاں صاحب کی تقریر چل رہی تھی۔ کہہ رہے تھے،''آپ لوگوں کے لیے تو بینک اکاؤنٹ رکھنا اور پیسے بچانا بہت ضروری ہے تا کہ برسات کے دنوں میں جب...... جب کہ سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے...... سمجھ رہی ہیں نا آپ؟ جب قدردان، نیازمند، پیسا کوڑی خرچ کرنے والے، ناز اٹھانے والے نہیں رہتے تو ایک بینک اکاؤنٹ ہی ہوتا ہے جو سہارا بنتا ہے......''

لڑکیوں میں سے کچھ ابھی تک منھ پر ہاتھ رکھے ہنسے جا رہی تھیں۔ خاں صاحب ذرا دیر کو رکے ہوں گے کہ گل بدن ایسے شروع ہو گئی جیسے مشاعرے میں داد دے رہی ہو،''واہ بھائی جان! واہ سبحان اللہ! بہت اچھی تقریر کرتے ہو!''

خاں صاحب نے بھی مشاعرے کے شاعر کی طرح چار انگلیاں سیدھی کر کے اُن پر انگوٹھا ٹکایا، پیشانی سے لگا کر آداب عرض کیا اور اُسی رفتار میں پھر چل پڑے۔

گل بدن پیچھا چھوڑنے والی کب تھی، سب سے کہنے لگی،''یہ بہت ڈھیٹ، بہت پکا ہے۔ کوٹھوں پر بہت آنا جانا رہا ہے اس کا...... سارنگی بجاتا تھا پہلے۔''

لاجی صاحب کی ہنسی رک گئی تھی، انھوں نے گل بدن کو گھورنا شروع کر دیا تھا۔

مگر مظہر علی خاں نے گل بدن کے فقرے کے جواب میں خود اپنے گالوں پر طمانچے لگائے بولے،''توبہ کروائی توبہ...... سارنگی بڑا مشکل ساز ہے۔ گنی، گن وان لوگوں کا کام ہے سارنگی بجانا......''

گل بدن بے سرا بول گئی۔ لڑکیوں کی طرف دیکھ کے کہنے لگی،''تو پھر کوٹھوں کے لیے گاہک گھیر کے لاتا ہوگا۔''

لڑکیاں سب سُنٹ ہو گئیں۔ ہر ایک کو احساس تھا کہ گل بدن اوچھا بول گئی ہے۔ لاجی صاحب تو جیسے پیلی پڑ گئیں۔ مظہر علی خاں کا گورا چٹا رنگ ایک دم سرخ ہو گیا تھا۔ مگر انھوں نے کھنکھار کر سر جھٹکا، ہونٹوں پر زبان پھرا کر اور گل بدن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگے،''نہیں بائی جی! اب ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں ہم...... قصہ یہ ہے کہ بزرگوں نے اپنے وقتوں میں، اللہ بخشے، بڑی رنڈی بازیاں کی تھیں، تو وہ بے غوفی ہے خون میں۔''

گل بدن کھیا کے لاجواب ہو گئی۔ لاجی صاحب نے ہاتھ بڑھا کر مظہر علی خاں کا شانہ تھپک دیا، ''برخوردار، کچھ خیال مت کرنا۔ پاگل ہے یہ مسری!''

خاں صاحب کچھ دیر بیٹھ کے لاجی سے وعدہ لے کے کہ وہ اکاؤنٹ کھلوانے کا سوچیں گی، چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد لاجی نے دھیرے سے کہا تھا، ''کیا لڑکا ہے بھئی...... مالک خوش رکھے!''

دو چار بار مظہر میاں پھر آئے۔ لاجی صاحب نے کشمیر لنک انڈلسی شاپ کے مالک کو کھلوا دیا تھا، اس نے اور پانی فلٹر بیچنے والے نیمن ماسٹر نے سب سے پہلے خاں صاحب کے حساب میں کھاتا کھلوایا، پھر سگریٹ کا ہول سیل والا گجراتی بھائی بھی دھیرے دھیرے لائن پر آ گیا۔

مظہر علی خاں ان سب اکاؤنٹس کے لیے لاجی صاحب کا شکریہ ادا کرنے آئے تو کرسی پر بیٹھتے ہی انھوں نے اپنا بریف کیس کھولا اور چپٹا سا ایک ڈبا نکالا۔ وہ شہر کی سب سے بڑھیا دکان سے لاجی کی پسند کی مٹھائی لائے تھے۔ یہ ڈبا انھوں نے ہاتھوں پر رکھ کر لاجی کی طرف بڑھا دیا۔

لاجی نے پوچھا، ''یہ کس واسطے؟''

کہنے لگے، ''سوچ لیا تھا لیلا جی کا منھ میٹھا کراؤں گا۔''

''مگر کیوں برخوردار؟ نیمن ماسٹر اور کشمیر لنک والے نے کھاتا کھول لیا، کیا اس واسطے؟'' خاں صاحب بولے: ''نہیں لیلا جی، کھاتے والے تو کھلتے رہتے ہیں...... وہ سب نہیں۔''

''تو پھر؟'' لاجی نے کہا، ''پہیلیاں کیوں بجھواتا ہے برخوردار؟ ہاں بھلا؟''

''دیکھیے، اس طرح ہے'' مظہر میاں نے مٹھائی کا ڈبا کرسی پر رکھ دیا، خود تخت پر لاجی صاحب کے برابر آ بیٹھے، ''اس طرح ہے میڈم! کہ میں...... اس روز جو میں آپ کے فلیٹ میں گھس آیا تھا اور چپڑ چپڑ باتیں کرتا تھا تو یہ مت سمجھیے کہ یونگی مانا تھا۔ مجھے اس روز بھی خبر تھی کہ آپ کون ہیں۔ صرف خبر ہی نہیں، اس وقت تک میرے پاس آپ کے پانچ گراموفون ریکارڈ آ چکے تھے۔ چھٹا، جس کی بہت دن سے تلاش تھی، کل ملا ہے لیلا جی! میں نے سوچ لیا تھا، وہ ریکارڈ جس دن میرے ہاتھ لگ جائے گا تو آپ کا منھ میٹھا کراؤں گا۔ وہ آپ کے آنے کے بعد نکالا تھا کمپنی نے۔ آپ کے پاس بھی نہیں ہوگا۔ وہی البیلا بلاول کر...... دنا ری کہاں گئے وہ لوگ......''

لاجی بس مظہر علی خاں کی طرف دیکھے جا رہی تھیں۔ خاں صاحب نے ابھی بولنا ختم بھی نہ کیا تھا کہ لاجی نے جیسے نیند میں دہرایا، ''دنا ری کہاں گئے......'' پھر وہ جیسے پوچھنے لگیں۔ ''البیلا بلاول؟ تا یک صوری البیلا؟''

مظہر میاں نے سر ہلایا، ''جی وہی۔''

لاجی صاحب نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر آہستہ سے پوچھا، ''کون ہو تم؟ کیسے جانتے ہو مجھے؟''

''میں؟ میں نے بتایا تو تھا، بینک میں نوکر ہوں، آپ کی اسی سڑک پر جو بینک ہے...... اور میڈم! آپ کو کیسے جانتا ہوں؟ تو آپ کو لیلا جی! آپ کو تو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ ہزاروں، شاید لاکھوں...... سن بیس کے بعد ٹھمریاں کس نے گائی ہیں آپ کے سوا؟ کون ہے؟ کس نے گائی ہوں گی؟ لیلا بائی امیر گڑھ والی کی طرح کون گا سکتا تھا؟...... میڈم! اِدھر اتوار کو صبح سے شام تک سنتا ہوں آپ کے ریکارڈ۔ امیر گڑھ کے نئے نویلے جنگل ہو سکتے ہیں آپ کے سروں میں، وہ سوہنی لیلا جی! امیر گڑھ کے قلعے کی برجیوں پر بیٹھے ہوئے مور اور مورنیاں بولتی ہیں۔ میں نے وہ آوازیں نہیں سنیں...... مگر ایک جانکار نے، ایک خوب سنے ہوئے نے مجھے سب آوازوں کی پہچان کرا دی ہے لیلا بائی! میڈم! خدا جانتا ہے مجھے موسیقی کی سمجھ آتی نہیں ہے مگر آپ کی گائی ٹھمریوں کے ایک ایک نوٹ کی شکل کاغذ پر بنا کے دکھا سکتا ہوں۔''

لاجی صاحب سختی سے اپنے منھ پر ہاتھ جمائے بیٹھی مظہر میاں کی باتیں سن رہی تھیں۔ انھوں نے لیلا بائی امیر گڑھ والی کہا تو لاجی نے چہرے پر ایک بار ہاتھ پھیر کر بے آواز دہرایا، ''لی لا!''

فلیٹ میں سناٹا تھا۔ میں دیوار سے لگا سب سن رہا تھا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے لاؤنج میں، سامنے، کسی گزرے زمانے کی میت رکھی ہے۔

مظہر علی خاں نے لاجی صاحب کے آنسو دیکھ لیے تھے۔ وہ اٹھے۔ انھوں نے بریف کیس اٹھا لیا۔

لاجی صاحب زانو پر کہنی ٹکائے، مہندی لگی اپنی گول سڈول ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے بت بنی بیٹھی تھیں۔

اپنا بریف کیس ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جھلاتے ہوئے خاں صاحب نے اشارے سے لاجی صاحب کے بت کو سلام کیا اور فلیٹ کے دروازے کی طرف بڑھے۔

لاجی صاحب نے دھیرے سے کہا، ''ٹھہرو!'' خاں صاحب رک گئے۔ لاجی نے کہا، ''پھر آنا!'' مظہر علی خاں نے کہا، ''جی میڈم! آؤں گا۔ ریکارڈ اور باجا بھی لاؤں گا۔''

''نہیں! وہ مت لانا۔''

''جی اچھا'' اور مظہر میاں اس روز پنجوں کے بل چلتے ہوئے فلیٹ کی دہلیز پار کر گئے۔

جیسے اپنے پیارے کی موت پر خاموشی سے پرسا دے کے کوئی نکل جاتا ہے بالکل اسی طرح۔

منظر پر کوئی چاند

جناب اسد محمد خان کے نظمیہ کلام سے مختصر انتخاب (صفوت علی صفوت، نیوارک)

آنجہانی باپ کے لیے

سرویشور دیال سکسینہ ...... ترجمہ: اسد محمد خان

سورج کے ساتھ ساتھ شام کے منتر ڈوب جاتے ہیں۔

گھنٹی بجتی تھی یتیم خانے میں
بھوکے بھٹکے بچوں کے لوٹ آنے کی:
دور دور تک پھیلے کھیتوں پر،
دھوئیں میں لپٹے گاؤں پر،
برکھا سے بھیگی کچی ڈگر پر،
جانے کیسا بھید بھرا اندھیرا پھیل جاتا تھا
اور ایسے میں آواز آتی تھی، پتا!
تمہارے پکارنے کی
میرا نام اس اندھیارے میں بج اُٹھتا تھا
تمہارے سُروں میں۔

مَیں اب بھی ہوں
اب بھی ہے یہ روتا ہوا اندھیرا چاروں طرف
لیکن تمہاری آواز نہیں ہے
جو میرا نام بھر کر
اُسے شانت سُروں میں بجا دے۔

" دھکا دے کر کسی کو
آگے جانا پاپ ہے۔"
اِس لیے تم بھیڑ سے الگ ہو گئے۔

"بڑی خواہش ہی سب دکھوں کی قیمت ہے۔"
اِسی لیے تم جہاں تھے وہیں بیٹھ گئے۔
"صبر و اطمینان اصل ایمان ہے۔"
مان کر تم نے سب اُٹ جانے دیا۔

پتا! ان قدروں نے تو تمہیں
بے سہارا، بے آسرا اور دکھی ہی بنایا۔
تم سے نہیں مجھ سے کہتی ہے
موت کے سمے
تمہارے بجھے ہوئے چہرے پر پڑتی ظالم، بھیانک پرچھائیں۔

"سادگی سے رہوں گا"
تم نے سوچا تھا
اس لیے ہر جشن پر تم دروازے پر کھڑے رہے۔
"جھوٹ نہیں بولوں گا"
تم نے عہد کیا تھا
اس لیے ہر محفل میں تم تصویر کی طرح چپ رہے۔
تم نے جتنا خود کو معنی دیے
دوسروں نے اتنا ہی بے معنی سمجھا
کیسی مسخرگی ہے کہ
جھوٹ کے اس میلے میں
سچے تھے تم، اس لیے بیراگیوں کی طرح پڑے رہے۔

تمہارے آخری سفر میں وہ نہیں آئے
جو تمہاری خدمتوں کی سیڑھیاں لگا کر
شہر کی اونچی عمارتوں میں بیٹھ گئے تھے:
جنھوں نے تمہاری سادگی کے سکوں سے
بھرے بازار، بھڑکیلی دکانیں کھول رکھی تھیں:
جو تمہاری ملنساریت کو
اپنی فرم کا اشتہار بنا کر
ڈگڈگی کے ساتھ شہر میں بانٹ رہے تھے۔

پتا! تمہارے آخری سفر میں وہ نہیں آئے۔
وہ نہیں آئے۔

چیونٹیاں اگر چاہیں تو

چیونٹیاں خطِ تنسیخ کھینچ سکتی ہیں
چیونٹیاں اگر زچ ہو جائیں، اور اگر چاہیں، اور طے کر لیں
تو تاریخ کے نتھنوں میں
داخل ہو سکتی ہیں

چیونٹیاں
اُس کے مغز تک فوری انہدام لے جا سکتی ہیں
چیونٹیاں اگر طے کر لیں تو۔

ذلت سہتے اور موچڑے کھاتے آدمی میں
باہر کے مُطیع، "تابعدار" سے چُھپا ہوا
اندر کہیں اندھیرے میں ایک منکر ابلیس جیسا بیٹھا ہوتا ہے
جو ایک لفظ "نہیں" کہنے کو اُتاؤلا رہتا ہے
اور اپنے دل کی بات کبھی کسی پہ کھلنے نہیں دیتا...
ذلت اور خواری کے کُوس میں دھیمی آنچ پکتا رہتا ہے سَسُرا۔

پھر جیسے ہی اسے موقع ملتا ہے
یا باہر سے دیکھنے والے کو اونگھ آجاتی ہے
یہ نتھنوں سے داخل ہو، دماغ میں جا پہنچتا ہے
اور وہ سب کرتا ہے جو اسرائیل کے قیام کے بعد سے اسرائیلی کر
رہے ہیں۔

مگر بہت آسانی سے بُھلا دی جاتی ہے یہ بات
کہ چیونٹیاں زچ ہو جاتی ہیں
اور طے کر لیتی ہیں، تو خطِ تنسیخ بھی کھینچ دیتی ہیں چیونٹیاں۔

ہارمنی

صبح جب مشینیں ایک دوسرے کی مدد کر رہی ہوتی ہیں
مَیں شکر گذاری میں جھک جاتا ہوں
شکریہ دوستو! شکریہ!

ایک ٹرک دوسرے کو ٹو کرتا لے چلتا ہے

ایک موبائل کرین بٹے ہوئے تاروں کا رسہ الجھا کر
دوسری موبائل کرین کو کھینچتی
اور جھٹکے سے اسٹارٹ کر کے چھوڑ دیتی ہے:
شکریہ! شکریہ دوست!

۴۵ درجے زاویے کے انکلائن پر تُلا ہوا چھوٹا شٹر
بے بس کریلے کو حیوانی خواہش کے ساتھ اوپر دھکیلتا ہے،
انکلائن گذار کر
دُہری شدت سے رگیدتا ہموار پلیٹ فارم پر لے آتا ہے،
ایک آخری جھٹکے سے دھکیل کر اسٹارٹ کر دیتا ہے
اب کریلا ہاتھ ہلاتا گودام کے کھلے دروازے میں گھوم سکتا ہے،
خدا حافظ دوست! مہربانی! بہت مہربانی!

میں شکر گذاری میں جھک جاتا ہوں
شکریہ، چیزو! شکریہ!
کہیں نہ کہیں ہارمنی موجود ہے!

☆

سلامتی کا گیت

مَیں : سلامتی سلامتی
کورس: سلامتی سلامتی سلامتی
مَیں: لچیمیں کا کام ہی لچ کرنا ہے
کورس: لچیمیں کا کام ہی لچ کرنا ہے
مَیں : اگر اپنی پسند سے وہ یوں کرتے
کہ سب لچیمیں مل کر
بڑی طاقت سے
دو مضبوط درختوں کے لچک دار تنے
ایک دوسرے کے قریب لاتے
اور ایک تنے سے میرا ایک ہاتھ اور ایک پیر
اور دوسرے تنے سے میرا دوسرا ہاتھ اور دوسرا پیر
باندھ دیتے
اور جب تک مَیں اچھی طرح دونوں تنوں سے
باندھ نہ دیا جاتا
اس وقت تک درختوں کو جھکائے رکھتے
پھر ایک ساتھ ان درختوں کو
اپنی فطری ایستادگی پر لوٹ جانے کے لیے چھوڑ دیتے
تو بات سمجھ میں آنے والی تھی
اس لیے کہ وہ لچیمیں تھے

کورس: اور لچیمیں کا کام ہی لچ کرنا ہے۔
مَیں : یا وہ یوں کرتے
کہ کسی ایک درخت کی افقی شاخ پر
میرے ہی کمر بند سے پھانسی کا پھندا ڈالتے
اور مجھے لٹکا دیتے

یا
مجھے آرے سے چیر دیتے

یا
کسی ستون سے باندھ کر جلا دیتے

یا
میری کھال اتار کر مجھ پر نمک چھڑکتے
تو یہ بھی باتیں سمجھ میں آنے والی تھیں

اس لیے کہ وہ لچیمیں تھے
کورس: اور لچیمیں کا کام ہی لچ کرنا ہے۔
مَیں : مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا.....
انھوں نے مجھے

میرے باہر
زندہ رکھا
(ہچکیاں) سلامتی سلامتی
کورس: ہمیں

ہمارے باہر
زندہ رکھا
(ہچکیاں اور بَین) سلامتی سلامتی سلامتی

☆

تو پھر یہ دیکھا

تو پھر یہ دیکھا کہ روشنی کے حصار میں ایک دیو قامت شجر کھڑا ہے
کہ جس نے شانوں پہ بے شمار شاخیں اٹھا رکھی ہیں
کہ بے شمار شاخوں پہ ان گنت کونپلیں کھڑی ہیں
جو اپنی آنکھوں کی زمیوں سے نمو کا اعجاز دیکھتی ہیں
اور اپنی زندہ سماعتوں میں
لہو کی آواز سن رہی ہیں

تو پھر یہ دیکھا نہ کوئی کونپل نہ وہ شجر ہے
بس ایک میں ہوں کہ بے نمو ہوں
اور اک ازل ہوں
بس ایک میں ہوں کہ بے نیابت ہوں

اور ابد ہوں
بس ایک میں ہوں
کہ زرد مٹی میں پنڈلیوں تک دھنسا ہوا ہوں۔
بس ایک... میں... ہوں

☆

لٹریری راونڈ اَپ

وہ اپنی پتلون کے پچھلے سوراخ میں چاندی کا چمچا لے کر پیدا ہوا تھا۔
وہ اگر تمہیں چشتی صاحب کہتا ہے
تو اس میں بُرا ماننے کی کونسی بات ہے

وہ بڑا اچھا آدمی ہے
اگر تم پر مقدمہ چلایا جائے تو شاہ ولایت ٹاؤن سے اکوڑہ خٹک تک
تمہاری حمایت میں ایک بھی آواز نہیں اُٹھے گی
مگر وہ بول پڑے گا
اگرچہ وہ تمہیں چشتی صاحب سمجھتا ہے
اور تمہیں پڑھتا بھی نہیں
[تم وہ لکھنا ہی نہیں چاہتے جو وہ پڑھنا چاہتا ہے]

مسئلہ یہ ہے کہ تم اپنا کیک کھانا بھی چاہتے ہو
اور اپنا کیک بچائے رکھنا بھی چاہتے ہو
تو پھر کیپیٹل والی گلی میں دن بھر اسٹول ڈالے بیٹھے رہو
اور ایک ایک رُوپیا
اور دو دو رُوپے
اور پانچ پانچ رُوپے
اور دس دس رُوپے
اور سو سو.....
اور ایک دن خود اپنا پرنس اوف مڑ وامووی ٹون کھول لینا
اور پتلونوں کے پچھلے سوراخوں میں تھوک دینا
جہاں چمچے اڑے ہوئے ہیں
سنا ہے گینڈوں کی نظر کم زور ہوتی ہے

وہ مڑ کے نہیں دیکھیں گے۔

اسی ایک آدمی کو لو
اس کا سالانہ انگریمینٹ "اوڈ ٹو دی وسٹ ونڈ" کے
بعد سے بند ہے
پچھلے سال پرانے بہنوں کے ساتھ بدسلوکی کے جرم میں
اسے دُرّے لگائے جانے تھے
سو اسے ترّقی دے دی گئی
وہ اب اپنے شعبے کا سربراہ ہے
اور اب اپنے خوابوں میں
یاہ یاہ یاہ
یاہ یاہ یاہ
یاہ یاہ یاہ
یاہ
یاہ
اپے یے
کہتا ہے اور پسینے پسینے ہو جاتا ہے
[یہی اس کی مادری زبان ہے۔]

وہ ان دو عورتوں کو پسند کرتا ہے
جو اپنے اپنے وظیفہ زوجیت لکھ دینے کے بعد
قبولِ عام اور حبسِ دوام حاصل کر چکی ہیں
اور اب استعمال شدہ 'ناول' سکھاتی رہتی ہیں
یا ایک دوسرے کے ساتھ ' بیٹھے سے بیگار بھلی' کرتی رہتی ہیں

اللہ بڑا مسبّب الاسباب ہے
اکادمی کے افتتاحی اجلاس میں
اس کی شیروانی کا دامن کھینچتے ہوئے
اے ڈی سی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر درخواست کی تھی
کہ نہیں برس سے باتیں کر رہے ہو
اب کچھ لکھو بھی

اس نے وعدہ کر لیا ہے
اور ایک ریم سادہ کاغذ لے کر شعبے میں واپس آ گیا ہے...
اور اب چھت پر کھڑا ہوا کھُجا رہا ہے۔

☆

ایک عبادت کا گیت

ہیلے لویاہ! ہیلے لویاہ!
مَیں بڑی قدرت وشان والا ہوں
کے نیم قد بوزنوں کے درمیان سے گذرتا ہوں
تو اپنے قامت کا اثبات کرتا ہوں
اور زمین پر اینڈتا ہوا چلتا ہوں
اور زمین پر بڑی دھمک سے میرے قدم پڑتے ہیں
(تو مَیں ایسا، اور ایسا، اور ایسا کیوں نہ کروں؟)

ہیلے لویاہ! ہیلے لویاہ!
مَیں بڑی قدرت وشان والا ہوں
کہ نیم قد بوزنوں کو تو موت نے آلیا
اور وہ ختم ہوئے تو بس ختم ہی ہو گئے
پر مَیں، لفظ میں
اور احساس میں
اور جذبے میں سانس لیتا اور کلام کرتا ہوں
کہ بڑی قدرت وشان والا ہوں ....
(تو مَیں ایسا، اور ایسا، اور ایسا کیوں نہ کروں؟)
ہیلے لویاہ! ہیلے لویاہ!!

☆

قرض

اک عدن جل رہا تھا... نگہباں خدا
اُس گھڑی ساتویں آسماں پر نہ تھا
اور ازل سے ابد تک احاطہ کیے
ایک افعی کی منحوس آواز تھی

اور خدا میرے شام وسحر میں نہ تھا
میرے گھر میں نہ تھا

اور خدا؟
جو دبے پاؤں کھڑکی سے پیچھے ہٹا
جو مرے ساتھ سونی سڑک پر رکا
یک بیک منفعل ہچکیوں میں بکھرنے لگا
اک جلالِ رواں میرے ہم راہ گلیوں میں چلنے لگا

اور خجالت کی یہ رات
اک سرد پتھر پہ تکیہ کیے
میری بانہوں میں بانہیں دیے
میرے معبود نے قہرماں کرب میں کاٹ دی
اور عدن جل بُجھا

ذوالجلال آنسوؤں کے طفیل آج بھی
ہر نفس اک سلگتا ہوا قرض ہے
اک نیا گھر... مقدس گھروں کی قسم!

میرے معبود پر آج بھی قرض ہے۔

دُعائے جنگ

Mark Twain's Short Story **A War Prayer**

ترجمہ: اسد محمد خان

زبردست جوش وخروش کے دن تھے، ملک ہتھیار بند ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جنگ جاری تھی۔ لگتا تھا ہر دل میں حُبِ وطن کی آگ روشن ہے۔ اِدھر نقارے پہ چوب پڑتی تھی اُدھر بینڈ بج رہے تھے۔ کہیں کھلونا پستول پھٹ پھٹ کرتے اور پٹاخے سُلگتے چٹختے تھے۔ ہر ہاتھ میں جھنڈا تھا۔ دور تک جاتی چھتوں چباروں کی دھندلی پڑتی نچھات پہ لہراتے پرچموں کا ایک دشت بے نہایت دھوپ میں پڑا لشکتا تھا۔ بھڑک دار نئی نفیس وردیوں میں نوجوان رضاکاروں کے جیش چوڑی شاہراہ سے قواعد پریڈ کرتے روز گزرتے تھے۔ یہ ٹکڑیاں جھولتی لہراتی برابر سے نکلتیں تو اُن پہ ناز کرتے ماں باپ بہنیں اور محبوبائیں فرطِ جذبات سے پھنسی ہوئی اور مسرت سے چھلکتی آوازوں میں تحسین کے نعرے سر کرتے تھے۔ راتوں کو عام جلسوں میں جہاں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی، لوگوں کے ہانپتے ہوئے ہجوم حُبِ وطن میں ڈوبی خطابت سُنتے۔ یہ خطابت دلوں کو ہلا کے رکھ دیتی، اور گہرائیوں میں اترتی تو سب کچھ اتھل پتھل کر دیتی۔ پھر اگر ایک لمحے کا وقفہ بھی آتا تو لوگ اُسے تابڑ توڑ تالیوں سے بھرتے جاتے۔ اس دوران میں آنسو اُن کے رُخساروں پہ لکیریں بنا کے بہتے رہتے۔

گرجا گھروں میں خطیب اور پادری صاحبان اپنی خطابت سے اس قیامت کا طوفان اُٹھا رہے تھے کہ رہنما م مالک کا۔ وہ ملک اور پرچم سے وفاداری کی تلقین کرتے، خدائے حرب وجدال کی دُہائی دیتے اور اُس سے اِلتجا کرتے کہ اس عظیم مقصد میں وہ ان کی مدد فرمائے۔

بے شک یہ دور مسرتوں کا اور خدا کی عنایتوں اور بخششوں کا دور تھا۔ تاہم چار چھ ناعاقبت اندیش افراد نے جنگ کو ناپسند کیا اور اس نیک وصالح صراطِ مستقیم پر شک سا ظاہر کرنے لگے۔ ان کو ایسی غضبناک وارننگ دی گئی کہ دوبارہ یہ سب کرنے اور لوگوں کی خفگی مول لینے کی اُن کی پھر ہمت نہ ہوئی۔

اتوار کی صبح ہوئی، اگلے روز فوجی دستوں کو محاذ پر جانا تھا؛ گرجا گھر میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی؛ بھی رضاکار موجود تھے، اُن کے چہرے حقیقت کے رنگوں میں رنگے ہوئے خوابوں سے روشن تھے جن میں سخت پیش قدمی اور رفتار پکڑتی، ہوتی یلغار اور لشکتی شمشیروں کی تصویریں تھیں اور شوروغوغا کے اور غنیم کی پسپائیوں، گھیرتے ہوئے دھوئیں اور غضبناک تعاقب سے لے کر ہتھیار ڈالنے تک کے زندہ مناظر تھے! ان خوابوں میں میدانِ جنگ سے گھر لوٹتے دلاوروں کے سنولائے ہوئے چہرے تھے کہ جن کے سواگت میں خوب بجے بجے کا ر ہوئی تھی؛ جنھیں خوب سراہا گیا تھا، جنھیں عظمت و اقبال مندی کے سنہرے سیلاب میں گلے گلے ڈبو دیا گیا تھا۔

رضاکاروں کے ساتھ اُن کے عزیز پیارے بیٹھے تھے ... بہت مغرور وشاداں۔ اُن کی قسمت پر وہ ہمسائے اور دوست رشک کرتے تھے جنھیں عزت کی رزم گاہ میں بھیجنے کے لیے وہ بیٹے اور بھائی نصیب نہیں تھے جو یا تو پرچم کے لیے فتح یاب ہو کر لوٹتے یا انتہائی بلند رتبہ موت سے سرفراز ہوتے۔

عبادت کا آغاز ہوا؛ عہد نامہ عتیق سے جنگ کے ایک باب کی تلاوت کی گئی۔ دُعائے اول پڑھی گئی؛ جس کے بعد ارگن باجے کے نعر اِس شدت سے پھوٹے کہ گرجا کی عمارت لرزنے لگی۔ حاضرین ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دھڑکتے دلوں اور چمکتی آنکھوں سے انھوں نے خدائے منتقم کی دُہائی دی، اُس کی زبردست جبروت کی ثنا اور استمداد اِس ٹکڑے کی کہ اے صاحبِ جلال، اے قہار! بجلی کا کڑکا تیری تکفیری، اُس کا لشکارا تیری تلوار ہے!

سو ہمیشہ تیرا ہی امر باقی رہے

اِس کے بعد "دُعائے طویل" شروع ہوئی۔ کسی کو یاد نہیں کہ اتنی گرم و پُر جوش استدعا اتنے رقت انگیز اسلوب میں پہلے کبھی کی گئی ہو۔ اس التجا میں ٹیپ کا بند یہ تھا کہ ہمیشہ کرم کرنے والا ہمارا ارحم الراحمین باپ، ہمارے عالی رتبہ نوجوان سپاہیوں کو اپنی حفظ وامان میں رکھے، ان پر اپنی برکتیں نازل فرمائے اور حُب الوطن کے اس فرض کی ادائی میں ان کی اعانت کرے، ہمت دے ان کا حوصلہ بڑھائے؛ انھیں اپنے دستِ زورآور کی پناہ میں لے لے۔ اِس خوں ریز پیکار میں انھیں مضبوط، ثابت قدم اور ناقابلِ تسخیر رکھے؛ غنیم کو کچلنے میں ہر طرح ان کی مدد فرمائے انھیں، ان کے پرچم اور ملک کو لازوال سربلندی اور شکوہ عطا کرے۔

اُسی وقت ایک عمر رسیدہ اجنبی گرجا میں داخل ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ بے آواز قدموں سے نشستوں کے درمیانی رستے پر بڑھنے لگا۔ اُس کی نظریں پادری پر لگی ہوئی تھیں، اُس کا لانبا قد پیروں تک آتے لبادے سے ڈھکا تھا۔ سر کھلا تھا اور سفید بال جھاگ اُڑاتے چشمے کی طرح شانوں تک آرہے تھے، جھریوں بھرا چہرہ غیر فطری زردی لیے ہوئے تھا، یوں لگتا تھا جیسے مُردنی چھائی ہو۔ سب آنکھیں، جاننے کے اشتیاق میں اُس پر لگی تھیں۔ وہ خاموشی سے چلتا رہا؛ بے رُکے سیڑھیاں چڑھ کر پادری کے برابر جا کھڑا ہوا اور انتظار کرنے لگا۔

اس کی موجودگی سے بے خبر، آنکھیں بند کیے، پادری نے اپنی رقت انگیز دُعا جاری رکھی۔ آخر کار ولولہ انگیز استدعا کے ساتھ اِن لفظوں پر اُسے ختم کیا اور

کہا: "اے مالک! اے خداوند! اے مُلکِ عظیم اور پرچم کے محافظ! اے ہمارے باپ! ہمارے ہتھیاروں پر نزولِ برکت فرما، ہمیں فتح مندی عطا کر۔"

آنے والے نے پادری کا بازو چھوا، اسے ایک طرف ہونے کا اشارہ کیا، بوڑھے پادری نے تعمیل کی۔ اجنبی نے اُس کی جگہ سنبھال لی۔ چند لمحوں تک اُس نے اپنی گمبھیر آنکھوں سے، جن میں ایک پُراسرار جوالا روشن تھی، سحرزدہ حاضرین کا جائزہ لیا پھر گہری گونجیلی آواز میں کہا:

"میں خدا کا فرستادہ، باری تعالیٰ کا پیغام لے کر آیا ہوں۔"

اُن لفظوں سے حاضرین کو جیسے جھٹکا سا لگا۔ آنے والے نے محسوس کیا ہوگا تو بھی اُس نے توجہ نہ دی، کہنے لگا:

"وہ فرماتا ہے کہ اُس نے اپنے خادم، تمہارے گلہ بان کی یہ دُعا سن لی اور قبولیت عطا کی... یعنی یہ جاہد، پیغام رساں اِس دُعا کے مُضمرات

... سارے ہی مُضمرات، تمہیں سمجھا چکے گا۔ تس پہ بھی اگر تمہاری یہی خواہش ہوئی تو باری تعالیٰ دُعا قبول فرمائے گا۔ کیوں کہ انسانوں کی کتنی ہی دُعاؤں کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے کہ مانگنے والا حقیقت میں جو طلب کرتا ہے دُعا اُس سے زیادہ مانگ لیتی ہے۔ اِس لیے ایک بار رُکنا اور سوچنا ضروری ہے۔

"خداوند کا اور تمہارا خادم اپنی دُعا کر چکا ہے۔ پر کیا یہ دم بھر کو رُکا ہے کیا غور کیا ہے اس نے؟ اور سوچا کیا یہ ایک دُعا تھی؟ نہیں! یہ دو دُعائیں تھیں --ایک وہ جو زبان سے ادا کی گئی، دوسری وہ جو نہیں کی گئی۔ دونوں، اُس سمیع مطلق کے گوش شنوا تک پہنچیں جو تمام التجائیں سنتا ہے زبان سے ادا کی گئی دُعا بھی اور ادا نہ کی گئی دُعا بھی۔ یہ بات سوچو، ذہن نشین کر لو۔ جب تم اپنے لیے ایک برکت کی التجا کر رہے ہوتے ہو خبردار! کہیں ایسا تو نہیں کہ ٹھیک اُسی وقت تم، قصد و ارادے کے بغیر، کسی ہمسائے کے لیے قہرِ الٰہی مانگتے ہو۔ اگر تم اپنی فصل کے لیے رحمتِ باراں کی دُعا کرتے ہو، جس کی اُسے ضرورت ہے؛ تو اِس عمل سے ممکن ہے کسی ہمسائے کی فصل کے لیے... جسے باراں کی ضرورت نہیں، جو اس سے برباد ہو سکتی ہے... تم عذاب و زحمت طلب کر رہے ہو۔

"اپنے خادم کی دُعا تم نے سُنی۔ یعنی اُس کا وہ حصہ جو زبان سے ادا ہوا۔ مجھے خداوند کا حکم ہے کہ اُس دوسرے حصے کو لفظوں کا جامہ پہناؤں جو پادری نے، اور تم نے بھی، اپنے دلوں میں خاموشی کے ساتھ، بہت شوق او ر ولولے سے مانگی تھی۔ اور اپنی لاعلمی میں، بے سوچے سمجھے مانگی تھی؟ خدا کرے ایسا ہی ہوا ہو... تم نے یہ الفاظ سُنے: ' اے مالک! اے خداوند! ہمیں فتح مندی عطا کر! ' بس یہ کافی ہے۔ ادا کی گئی پوری دُعا ان پُرمعنی لفظوں سے پیوستہ ہے۔ تفصیلات اور وضاحتیں ضروری نہیں تھیں۔ جب تم نے جیتنے کی دُعا مانگی، تم نے بیان نہ کیے گئے اُن بہت سے نتائج کی بھی دُعا کی جو فتح کے بعد ظاہر ہوتے ہیں، لازماً ظاہر ہوتے ہیں، رہ نہیں سکتے۔ دُعا کا وہ حصہ جو لفظوں میں بیان نہ ہوا تھا سمیع مطلق کے گوشِ شنوا تک پہنچا۔ اُس نے مجھے حکم دیا ہے کہ اُسے لفظوں میں بیان کر دوں۔ تو سنو!....

(تم نے یہ دُعا مانگی کہ)

"اے مالک، اے باپ ہمارے! دیکھ یہ جواں سال مُحبِ وطن، ہماری آنکھوں کے تارے، دلوں کے ٹکڑے، رزم گاہ میں نکلتے ہیں، تو اُن کے نزدیک رہ! ہم بھی، اپنے پیارے گھر آنگنوں کا دلاویز اَمن و شانتی چھوڑ کر، دشمن پر ضرب لگانے صورتِ جاں ساتھ چل پڑے ہیں۔ اے مالک ہمارے خداوند! ہماری مدد کر، تاکہ ہم اپنے گولوں سے اُن کے (حامی) سپاہیوں کے چیتھڑے اُڑا دیں۔ اِجازت فرما کہ ہم اُن کے مسکراتے کھیتوں میں اُن کے مُردہ مُحبِ وطنوں کے زرد لاشے بچھا دیں۔ درد میں تڑپتے کراہتے اُن کے زخمیوں کی چیخوں سے توپوں کی گھن گرج کو دبانے میں، خداوند! ہماری معاونت فرما۔ مدد کر ہماری کہ ہم اُن کے ادنیٰ گھروں کو ایک آگ کے طوفان میں نیست و نابود کر دیں۔ اُن کی بے ضرر بیواؤں کے دل ایک رنجِ لاحاصل سے اچھی طرح کچلنے مسلنے میں، یا الٰہا! ہماری اِعانت فرما۔ اُنھیں اُن کے چھوٹے بچوں کے ساتھ گھروں سے ہنکا کر بے چھت، بے یار و مددگار کرنے میں اور خود اُن کی اپنی اُجڑی ہوئی زمینوں کے خرابوں سے چیتھڑوں میں لپیٹ کر بھوک اور پیاس کا ستم کراتے ہنکاتے، اور ہنکاتے رہنے میں اے مالک کُل! ہمارا ہاتھ بٹا۔ کچھ ایسا ہو کہ وہ (سورج کے تموز) گرمائی شعلہ زنِ آفتاب کا اور سرمائی تُند و برفیلی ہواؤں کا کھیل بن جائیں۔ اپنی روح میں کچلے ہوئے، جاں کاہ مشقت سے تھکے ہوئے، قبر کی پناہ کے لیے وہ تجھ سے التجا کریں اور جواب میں تیرا انکار ہی سُنیں۔ ہماری خاطر، کہ جو تیری پرستش اور تیری ثنا کرتے ہیں، اے آقا! اُمیدیں اُن کی خاک میں ملا دے۔ اُن کی زندگیاں مُرجھا دے، اُن کی کڑوی مسافت کو طویل تر بنا، بار الٰہا! اُن کے قدموں کو گراں بار کر دے۔ اُن کے رستے میں خود اُن کے آنسوؤں کا چھڑکاؤ کر اور سفید برف کو اُن کے زخمی پیروں کے خون سے لالہ رنگ کر دے!

ہم یہ سب اُس کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر طلب کرتے ہیں کہ جو سر چشمہ ہے محبت کا، جو ہر حال میں اور ہمیشہ وفا کرنے والا دوست ہے۔ جو سبھی گھر جانے والوں کی اور عاجز و پشیماں دلوں کے ساتھ مدد چاہنے والوں کی پناہ گاہ ہے آمین!

تم نے یہ دُعا مانگی تھی۔ اگر اب بھی تم یہی چاہتے ہو تو کہہ دو۔ ربِ اعلیٰ کا یہ حقیر پیغام رساں انتظار کر رہا ہے۔"

بعد میں لوگوں کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ آدمی پاگل تھا، کیونکہ جو کچھ اُس نے کہا اُس کی کوئی تُک نہیں تھی۔

براہِ راست

تجربات کی نئی دنیا 'مشاہدات کا نیا جہان' کرنوں کی انہونی بستیاں' زبان و بیان کی نئی لذت اور چاشنی کو اگر کوئی نام دیا جا سکتا ہے تو وہ اسد محمد خان صاحب کے علاوہ دوسرا کوئی نام ہو ہی نہیں سکتا! ہماری کوشش اور خواہش ہے کہ آج کی محفل میں جناب اسد محمد خان کی شخصیت و فن کچھ اسطرح آپ کے روبرو پیش کئے جائیں کہ فن اور فنکار باہم یکجا ہو کر اپنا دل' دماغ اور روح آپ کے سامنے آئینہ کر کے سرخرو و سرفراز ہو جائیں!! ہماری جستجو اور لگن آج بھی آپ کے حسنِ نظر کی اسی قدر محتاج ہیں جس قدر پہلے دن ہوا کرتی تھیں!!!

گلزار جاوید

☆ آپ کا نام اسد محمد خان کس کا تجویز کردہ ہے اور آپ کی شخصیت پر اس کے اثرات کس قسم کے ہیں؟

☆☆ نہیں معلوم کہ نام کس نے رکھا تھا۔ گمان غالب ہے کہ میرے دادا نے رکھا ہوگا۔ یا نانا کا تجویز کردہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور حضرت! نام کے اثرات کیا ہوتے ہیں؟ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں ساری زندگی خوش ہوتا رہا ہوں کہ میرا ایک نام ہے اور یہ نام اچھا ہے۔

☆ والدہ محترمہ کی شخصیت کا اثر آپ کے ہاں کس رنگ اور کس طور تلاش کیا جا سکتا ہے؟

☆☆ وہ دوسروں کا احترام کرنے والی، self-respecting خاتون تھیں۔ جس بات کو سچ سمجھتی تھیں، اُسے برملا کہنے میں تامل نہیں کرتی تھیں۔ جلد غصہ آتا تھا، بہت جلد مَن جایا کرتی تھیں۔ درجات ان کے بلند ہوں۔ میں سیکھنا تو بہت کچھ چاہتا تھا پر اُن کا ایک وصف: (سچ کو برملا کہنے میں تامل نہ کرنا) مجھے اکثر، اپنی 'اوقات' سے زیادہ لگا ہے۔

☆ والد محترم کے مشاغل اور شانتی نکیتن میں ان کے قیام کے حوالے سے کچھ تفصیل بیان فرمایئے؟

☆☆ مضمون اور پیشے کے اعتبار سے آرٹ ماسٹر۔ نوجوانی میں وہ اور اُن کے بڑے بھائی ہاکی کے کھلاڑی تھے۔ سنا یا علی گڑھ یونیورسٹی اور ریاست بھوپال کی ٹیموں میں کھیلتے رہے تھے۔ کسی ٹورنامنٹ میں کھیلنے لاہور آئے تھے، چھاتی پر گیند لگنے سے گرے اور جانبر نہ ہو سکے۔ وہ کلکتہ میں بھی پڑھتے رہے تھے۔ والد اُن کے ہمراہ کئی بار کلکتہ گئے تھے۔ شانتی نکیتن دیکھ آئے تھے۔ انھوں نے دادا صاحب کو راضی کیا، وہاں کچھ دن بھی گذارے۔ دادا صاحب کے ایک راجپوت دوست ٹھاکر صاحب جگنپور رابندرناتھ ٹیگور کی صوفیانہ فکر سے نہ معلوم کیوں کدی سی تھی۔ انھوں نے دادا صاحب کو قائل کیا کہ لڑکا آپ کا، ٹیگور کے وہاں سے کچھ کھوکری آئے گا، سو دادا صاحب نے بلا لیا۔ میرے والد اُن دنوں کو بہت یاد کرتے تھے۔

☆ آپ کی زندگی پر حقیقی مریم اور 'ہٹلر شیر کا بچہ'' کے اثرات کے بابت بھی ہمارے دل میں اشتیاق ہے؟

☆☆ مریم بی نے خدا انھیں اجر عظیم دے میرے والد کو، اور خود مجھے بھی، ہاتھوں سے کام کرنے والوں کا احترام کرنا سکھایا۔ وہ ناخواندہ تھیں لیکن مجھے یاد ہے کہ بہت کم لفظ استعمال کرتے ہوئے اپنے محاورے میں، حضورؐ کے اُن دنوں کا ذکر ضرور کرتی تھیں جب آپؐ، دائی حلیمہ کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔ کسی نے ایک بار بتایا کہ آپؐ اپنے پاپوش تک مرمت کر لیتے تھے، تو بڑھ کر اُس کے ہاتھ چوم لیے؛ یعنی کہنے کو اب انھیں ایک اور خوب صورت بات مل گئی تھی۔

ہٹلر کا کیریکٹر جس حوالاتی کی ذہن سے وہ بھوپال پولیس میں سب انسپکٹر تھا، مضافات میں کہیں اس کی تعیناتی تھی۔ کسی ملزم سے زیادتی کے الزام میں ماخوذ تھا اور دوسرے حوالاتیوں کو خوش ہو ہو کے بتانے لگا تھا کہ اس کے علاوہ بھی اس نے بہت کچھ کرم کیے ہیں۔ ایک گینگسٹر، افیون کے آڑھتی "بھائی" نے، جو پہلے سے بند تھے، عجب وضع داری کا مظاہرہ کیا؛ ہٹلر مونچھ والے سب انسپکٹر کو خاصی درشتی سے منع کر دیا کہ وہ چپ بیٹھے، پڑھنے لکھنے والے لڑکے کے سامنے 'ایسی بک بک' نہ کرے۔ تو بھائی 'ہٹلر مونچھ' سے زیادہ مجھے گینگسٹر نے متاثر کیا تھا۔

☆ عین اسٹیج میں بائیں بازو کی جانب جھکاؤ اور جیل یاترا کی بابت کچھ ارشاد فرمایئے؟

☆ سنا ہے آپ نے معافی نامہ داخل کر کے رہائی حاصل کی تھی جبکہ اس وقت کے ساتھیوں نے آپ پر پارٹی کو نقصان پہنچانے کا الزام بھی لگایا تھا؟

☆☆ میری تحریر بہ عنوان "لو جی عمر گزار دی" میں آپ نے پڑھ ہی لیا

ہوگا۔ حوالات اور سحافی نامہ اوربایاں بازو یہ سب کچھ اُس میں لکھا ہے۔ بیسویں صدی کے بیچ کے اُن برسوں میں، سترہ برس کا، ایک چھوٹے شہر کا طالب علم، کوئی بہت بھاری انقلابی تو بن نہیں سکتا تھا۔

بلاشبہ لکھنے والوں کی ایک زبردست تحریک اُٹھی تھی اور اردو پڑھنے لکھنے والوں میں قیامت رفتار سے چل پڑی تھی۔

ترقی پسند تحریک کے مثبت اثرات میں یہ بھی شامل تھا کہ متوسط گھرانوں کے لڑکے، اردو نظموں اور کہانیوں میں زمینی حقائق، یعنی بھوک اور مزدور اور ظلم اور اُجرت اور کمیون سازی کے بارے میں کچھ نہ کچھ جاننے لگے تھے۔ (بے شک، ایک بھاری تعداد بربر، 'قتل تیرزن اصلی' پڑھتی رہتی تھی)

اور جناب! ترقی پسند تحریک نے زبان و بیان کے اسالیب بھی بدل دیے تھے۔ غرض کہ مزا آرہا تھا۔ بعضوں نے تو کارل مارکس کی "داس کیپی تال" میں بھی ناک جھانک شروع کر دی تھی۔ تو یہ ہمت بندھانے والا ماحول تھا۔

اتنی دہائیاں گذار کر میں خود کو بیری پوٹر' پڑھتے کئی ملین لڑکوں لڑکیوں کے درمیان دیکھ کر حوصلہ ہار دیتا ہوں۔ کیا وقت گذاری کرتے اور 'قتل تیرزن' پڑھتے نوعمروں کے جیش پھر لوٹ آئے ہیں؟ اور کیا تیسری دنیا کے زمینی حقائق اور ایشیا افریقہ لاطینی امریکہ کی بھوک، محرومی اور وغیرہ وغیرہ کے بارے میں (ورنا کیولر میں) جانکاری دینے کے لیے میڈیا، کافی اور موثر (اور رضا مند) ہے؟ اور کیا شعر میں اور کہانی میں بھی سننے، پڑھنے والے کو لبھانے، گرفت میں لینے کو کہیں کوئی تحریک چل پڑی ہے؟ کوئی جواب نہیں ملتا اور میں حوصلہ ہار دیتا ہوں۔

☆ پہلی شادی کی ناکامی کے اسباب کیا تھے اور اکلوتے صاحبزادے سے مراسم کی نوعیت کیا ہے؟

☆☆ وہ زندگی ختم ہوئی۔ کچھ کہنے کے لیے نہیں ہے۔ بیٹے کے بارے میں یہ ہے کہ مجھ سے، میری بیگم سے، اپنی بہنوں سے برابر رابطے میں ہے اور خدا خوش رکھے، ہمیں نہال کرتا رہتا ہے۔

☆ اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ شاعری کی تحریک آپ کو والدین سے ورثے میں ملی مگر افسانے کی تحریک کہاں سے ملی یہ کوئی نہیں جانتا، نہ کسی کو اس قدر تاخیر سے افسانہ لکھنے کی وجوہات کا علم ہے؟

☆☆ جی نہیں والدین شعر نہیں کہتے تھے۔ صرف ماما اور پاپا کو شاعری سے شغف تھا۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے صرف ایک مُجرا اور دو مشاعرے سنے تھے۔ افسانہ تاخیر سے لکھنے کی وجہ یہ تھی کہ مجھے گیت اور نظمیں لکھنے میں لطف آرہا تھا۔ گھر کی ذمہ داریاں بڑھیں تو احباب نے پیسہ کمانے کے لیے ریڈیو پروگراموں کے لکھنے کی راہ سجھائی۔ پھر پی ٹی وی نے گیت لکھنے پر آمادہ کیا۔ مگر کیوں کہ پی ٹی وی ڈراما لکھنے کی اُجرت، گیت کی اُجرت سے زیادہ تھی اس لیے ڈرامے لکھنے لگا۔ As simple as that

☆ پہلی نظم کی زبردست پذیرائی کے باوجود بطور شاعر آپ اپنی شناخت کیوں نہ قائم کر سکے؟

☆☆ شناخت قائم ہوتی ہے sustained efforts سے کر بھیا لکھے جاؤ، لکھے جاؤ، تو دو ڈھائی سو گیتوں میں سے صرف پچاس یا باون ایسے تھے جنہیں میں نے own کیا اور چھپوایا۔ نظمیں اچھی ہیں، اب بھی سال میں دو چار ضرور لکھتا ہوں پر نظموں کی کل تعداد ۴۵/۵۰ سے زیادہ کیا ہوگی۔ نثر نے مجھے نہال کیا ہے اور ٹکے کما کے دیے ہیں تو بس، لوگ میری کہانیاں پڑھتے اور سراہتے ہیں، اور خود مجھے کہانی لکھنے میں لطف آرہا ہے تو سب سے بڑی بات یہی ہے کہ اسد محمد خاں کہانی سناتے رہنا چاہتا ہے۔

☆ افریقی ادب سے آپ کی دلچسپی کے اسباب اور اس سے استفادہ کی بابت کچھ بتلایئے؟

☆☆ سب سے بڑی وجہ یہ کہ افریقہ گم راہ ارض پر ہمیشہ سے موجود تھا۔ میں نے اپنے 'جووی نائل' دور میں رائیڈر ہیگرڈ کی She "گویا" عذرا" اور 'واپسی' وغیرہ سے شروع کر کے خوب افریقہ پڑھا۔ انگریزی میں 'یہ والا افریقہ' اپنی کولونیئل فتوحات اور "ڈارک کونٹیننٹ" کی تاریک شکل کے ساتھ مجھ براؤن طالب علم کو نفرت اور ایک طرح کے غصے کی کیفیت میں ڈال دیتا تھا۔

اور یہاں ایک گذارش کرتا ہوں کہ کسی طرح کے موازنے کا وہم بھی درمیان میں نہ آنے دیجیے، اور دیکھیے:

ایک بہت بڑا آدمی؛ خاصا دبلا پتلا، چھوٹے قد، کالے رنگ کا ایک انڈین وکیل، موہن داس کرم چند گاندھی؛ بہت پہلے ہی ایسی نفرت اور غصے کو جھیل چکا تھا... اور مجھے سب معلوم تھا، تو مجھے افریقہ میں تک و تاز کرتے اِن گوروں کی شکلیں بری لگنے لگیں۔ یہ اُلو کے پٹھے جوان حبشیوں کی پیٹھ پر جوتوں سمیت بیٹھے، اُن سے سالا پار کروا رہے ہیں، آخر یہاں سے دفع کیوں نہیں ہو جاتے؟ [میں اُس' گورے مصور' کا ممنون ہوں جس نے یہ تصویر پینٹ کر کے ایک میسج دیا ہوگا] تو مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ میرا پسندیدہ فرانسیسی شاعر، راں بو شاعری وائری چھوڑ جنوبی افریقہ میں جواہرات کی 'آڑھت' کا کام کرنے جا چکا تھا۔ بہت سے (گورے) مشنری بھی افریقہ میں جناب یسوع مسیح کا نام، پیغام لے لے کر افریقہ جانے لگے تھے۔ کتنے ہی مشنریوں کو آدم خور افریقی بھائی، کھا پی کے برابر کر چکے تھے۔

[بہت بہت دن بعد مجھ سے، میرے ایک "واعظ" دوست نے شکوہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اِس سال میرا جنوبی افریقہ کا "وعظ دورہ" کچھ بہت زیادہ سودمند نہیں رہا، کس لیے کہ مجھ سے پہلے، میرا ایک حریف بڑا واعظ وہاں کا سیزن نمٹا کے آ چکا تھا۔ وہ (برسوں پہلے کے) تو

دس لاکھ بنا کے آیا ہے میں بہ مشکل ۳/۴ ہی لا سکا ہوں۔]

تو یہ سب چلتا رہا۔ عالمی ادب و شاعری کے مطالعے کے دوران میں نے کچھ افریقی (بدیسی اور زمیں زاد) لکھنے والوں کو پڑھا۔ امریکی اور دوسرے سفارت خانوں سے تراجم کا (سوفی صد کمرشیل) کام لیتا رہتا تھا تو سینیگال کے (اُس وقت کے) صدر لیوپولڈ سینگھور پر ایک فلم ترجمہ کرنے کو ملی۔ میں نے اِس شاعر کے کلام میں، اُس زندہ وزِ اعظم کے دل کی دھڑکن سنی۔ اپنے فیض صاحب (اُن کا مرتبہ فزوں ہو) تو

پہلے ہی لکھ چکے تھے کہ آ جاؤ افریقا... آج اکہ میں نے سن لی تیرے ڈھول کی ترنگ۔ پھر بھی کشور ناہید نے لکھا کہ اسد محمد خاں، فلاں افریقی ادیب اپنے پاکستان آ رہے ہیں، بھیا تم اِن کی کچھ چیزیں ترجمہ کر کے تُرنت مجھے بھیج دو۔ میں نے کچھ پڑھ رکھی تھیں۔ سو اور بھی ذرا پڑھ لیں۔ معلوم ہوا کہیں کوئی حکومت تبدیل ہوگئی ہے وہ ادیب نہ آ سکیں گے۔ لیکن اِس مطالعہ نے مجھ کو فائدہ پہنچایا۔ مالی بھی اور دوسرا بھی۔

☆ آپ کے افسانوں کی بنیاد مطالعے پر ہے مشاہدہ پر ہے یا تجربات کا نچوڑ نیز آپ کی ذات کس حد تک آپ کی تخلیقات میں تلاش کی جا سکتی ہیں؟

☆☆ برادرم! تینوں ہی باتیں ہیں۔ جیسا کہ کہیں عرض کر چکا ہوں: میں نے اردو کے کلاسیکی نثر نگاروں: سرسید، مولوی عبدالحق، حالی اور کتنے ہی داستان گو بزرگوں کو پڑھ لیا تھا، بساط بھر سمجھ بھی لیا تھا۔ انگریزی، یعنی ایک اضافی زبان تک، کچھ اونچی سی نصیب ہوئی تو سب سے پہلے چارلس ڈکنز کو... جو دسویں کلاس کی خاصی ضخیم ٹیکسٹ بک میں نظر آتا تھا... والد اور تایا کی کتابوں میں تلاشنا شروع کیا۔

میرا چھوٹا بھائی اور بڑا، دونوں ہی (خوش دلی سے) ہنستے تھے، مگر میں گرما کی چھٹیوں میں، اور ویسے بھی، بس لگا رہتا تھا۔ سمجھ میں چاہے کم کم ہی آئے، پڑھتا رہتا تھا۔

کراچی آیا تو ایک بزرگ دوست نے (جس کے مرحوم والد سرجن تھے، اور جو اسکول پڑھاتی والدہ کے ساتھ، اُن دنوں، اپنے بنگلے نما گھر میں رہتا تھا) مجھے انگریزی کی سنسنی خیز کہانیوں کا، جن میں Perry Mason سیریز بھی شامل تھیں، چسکا لگا دیا۔

اِسی دوست نے پہلی بار، مجھے، میری فرمائش پر، انگریزی میں بائبل پڑھنے کو دی تھی۔

[ضمناً بتاتا چلوں کہ بزرگ دوست نے اور اِس عاصی نے اُس عمر تک کلامِ مجید کا بس تیسواں پارہ پڑھا تھا۔ دونوں ہی اِس پر خجل تھے کہ بیس برس کے ہو گئے تھے اور ختمِ قرآن کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ ایک روز 'ڈان' اخبار میں اشتہار دیکھا جس میں ایک ریٹائرڈ ڈاکٹر نے، ہم جیسے جاہلوں سے 'درخواست' کی تھی کہ خجل ہونے میں وقت ضائع نہ کیجیے میرے پاس آ جیے۔ تو ہم پہنچے۔ وہ چل پھر نہیں سکتے تھے۔ صدر کی الفنسٹن اسٹریٹ پر، مینا بازار میں اُن کا گھر تھا۔ ہم دو 'بوڑھوں' کو دیکھ کر پہلے مسکرائے، پھر بولے، "حصولِ علم، خیر کا کام ہے جب بھی توفیق ہو کر گزرنا چاہیے۔"

خدا انھیں بلند رتبہ کرے۔ انھوں نے پہلے مٹھائی منگائی، اپنے پاس سے ایک ایک نسخہ عطا کیا اور جلدی ہمیں اِس قابل کر دیا کہ ہم لوگ فرفر پڑھنے لگے۔]

بات ادھوری رہ گئی تھی۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ بائبل کا ذکر درمیان میں کیوں آیا تھا... سو عرض کرتا ہوں:

میں ڈرگ روڈ، ایئر فورس بیس کی لائبریری سے کتابیں لا لا کر پڑھا کرتا تھا۔ نوعمروں کی ایک پسندیدہ ناول، 'انکل ٹامز کیبن' میں بہت دلچسپ ورکمال کی گرفت رکھنے والی کہانی بیان ہوئی ہے۔ اِس ناول کا شمار امریکی کلاسکس میں ہوتا ہے۔ مصنفہ نے بہت پر اثر انداز میں اُس دور کے غلام نیگرو باشندوں کی ابتلا بیان کی ہے۔ کہانی کا ماحول حد درجہ مذہبی ہے اور جگہ جگہ انجیل کا حوالہ ہے۔ جس لائبریرین بھائی سے کتاب ایشو کرائی تھی میں نے اُس سے کہانی کی تعریف کی۔ اُس نے ایک اور کتاب نکال کر دی۔ وہ مجھے پسند نہ آئی۔ دوسرے دن لوٹا دی، کہا، بھائی 'انکل ٹام..' جیسی کتاب دو۔ وہ بندہ سادہ، مذہباً مسیحی تھا، یہ سمجھا کہ میں کہانی سے تو کیا، دینِ مسیح سے متاثر ہوں۔ اُس نے کرسی کھینچ کر بٹھا لیا اور جنابِ مسیح اور مذہب کے پر لمبی بات شروع کر دی۔ آخر، میں نے کہا کہ سرا میں سب جیسا مسلمان بندہ ہوں اور حضرت ڈِز سے انتہائی پیار کرتا ہوں جتنا دوسرے سب نبیوں سے... پلیز مجھ پر تبلیغ نہ کرو۔ یہ کہہ کر چلا آیا۔ بزرگ دوست کو سارا قصہ سنایا تو کہنے لگا، بھائی میرے! برا مت ماننا۔ اصل میں میں اور تم 'لاعلم' بندے ہیں۔ ہیں کہ نہیں؟ بائبل کی بات تو دور کی ہے ہم نے، اپنی پوری کتاب بھی کہاں پڑھی؟ وغیرہ وغیرہ۔

تو اِس واقعے کے بعد ہم نے 'ڈان' اخبار میں وہ اشتہار دیکھا، اگلے ہی دن ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچ گئے اور بسم اللہ کہہ کر آغاز کیا۔

ان طویل برسوں میں، میں نے محمد مارماڈیوک پکتھال کا ترجمہ: Meaning of the Glorious Koran اور بھگوت گیتا (ایلی سیوٹ کا ترجمہ) پڑھ لیا۔ جون ایلیا سے ایک زمانے میں (سبقاً سبقاً تو نہیں، جستہ جستہ، 'ژند اور اَوِستا' پر کو مینٹری پڑھنا شروع کی تھی کہ ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ، عارضی طور پر، منقطع سا ہو گیا۔ چند برس گزر گئے۔ پھر معلوم ہوا کہ میرا او میار چلا گیا۔

گلشن میں نے تقریباً اُسی دیوانگی سے پڑھی ہے جو کتاب کے کیڑوں سے مخصوص ہے۔ رہی تجربے اور مشاہدے کی بات تو عرض ہے کہ

بے شک، زندگی کا... ٹھیک ٹھاک اور موت کا کم کم تجربہ تو ہے اور اِس کے شواہد میری لکھت میں بھی نظر آ جاتے ہیں۔ اپنے 'مشاہدے' کے بارے

میں کبھی سوچا نہیں کرتا کہ کیا ہے اور کس لائق ہے اور خود میں، کس قدر اپنی لکھت میں دکھائی دیتا ہوں۔ یہ بات، جناب والا یقیناً میرے پڑھنے والے جانتے ہوں گے۔

☆ ایک ہی کہانی کو بار بار ڈری رافٹ کرنے کی وجوہات کیا ہوا کرتی ہیں؟

☆☆ اللہ جانتا ہے مجھے نہیں معلوم کہ اس طرح کوئی کیوں کرتا ہے۔ آپکا یہ دوست تو اپنے اندر اُگتی کسی ایک کہانی کو ایک ہی بار 'بیان' کرتا ہے۔ ہاں، کہانی کے 'مسودے' پر کام کرتے ہوئے میں اُسے کئی کئی طرح ڈرافٹ کرتا ہوں۔ اور لکھنے کے بعد نوک پلک درست کرنے کو اُسے ۳۰/۴۰ مرتبہ پڑھتا ہوں۔ پھر مطمئن ہو کے رکھ دیتا ہوں اور ایک طرح سے اُسے 'بھول' جاتا ہوں۔ کیوں کہ جو بات کہنا چاہ رہا تھا، کہہ چکا۔

☆ کہانی لکھنے یا بیان کرنے سے ریاضت کا کیا تعلق بنتا ہے؟

☆☆ ہر فنی لطیف، ریاضت سے حاصل اور پختہ ہوتا ہے۔ وجدان یعنی 'آمد' تو ایک بار کی عطا ہوتی ہے جبکہ نتیجے میں جو کچھ ظاہر ہوا اور ہوتا رہے گا، وہ کارکردگی (یا پھل) ریاضت سے حاصل ہونے والی چیز ہے۔ ریاضت ترک کر دی جائے تو نئی 'آمد' یا عطا کے راستے بھی بند ہو جاتے ہیں اور جاری کارکردگی کا تکرار بھی کرتا جاتا ہے کوئی نئی چیز سامنے آتی نہیں... آخر آخر دھول اُڑنے لگتی ہے۔

☆ آپ کے ہاں اس قدر غصہ اور ناراضگی کی وجوہات کیا ہیں؟

☆☆ یقیناً یہ احتجاج کی ایک شکل ہے۔ جو کچھ اوکھا، بدصورت اور دھاندلی اور منافقت کے ساتھ گردوپیش میں ہو رہا ہے... ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہیگا... اُس پر کوئی بھی ہوش مند اور انصاف پسند آدمی کم سے کم اپنے اندرون، اپنی خلوت میں، دل کے اپنے اکیلے پن میں برہم اور خفا ضرور ہوتا ہے چاہے اُس کا اظہار کرے یا نہ کرے۔
میرا قصہ یہ ہے کہ میں ہوش مندی اور انصاف پسندی کی جون میں ہوتا ہوں تو لکھ کر اُس برہمی اور غصے کا اظہار کر دیتا ہوں۔

☆ آپ کے افسانوں میں قاری کو اکثر رذیل اور کمینے لوگوں سے واسطہ کیوں پڑتا ہے؟

☆☆ میرے افسانوں کی 'آبادی' بھی حقیقی دنیا کی آبادی کی طرح ملی جلی ہے۔ جن کمینے، رذیل لوگوں سے، برادرم آپ کا، ان کہانیوں میں واسطہ پڑا اُن سے کہیں زیادہ مریم اور فضل علی قریشی اور اُن سے احترام اور پیار کا سلوک کرنے والے لوگ۔ اور مہر کنگ سیلون والے مُرشد، اور بزدلانہ بدمزگی سے گزرتے راج پوت باپ بیٹے ہیں۔ 'کج فکر' مردوزیوں 'سے بیزار حافظ گینڈا ہے اور بھولی بسری روایتوں کے لیے چاہت دکھاتا مائی دادا بھی اور ننگ دلی اور بزدلی فروشی اور جرائم کا راستہ روکتے چوہم سا زاور گھیرے خیال اور زمین زاد کسان بھی۔ عرض کیا نا، ایک دنیا جیسی آباد ہے۔

☆ پسے ہوئے اور زندگی گزیدہ لوگوں کے کہانی کار کا لیبل آپ پر کب اور کیوں چسپاں ہوا؟

☆☆ لیبل چسپاں ہونے سے اگر آپ کی مُراد شناخت قائم ہونا ہے تو حضرت اہلِ بڑی میں چسپاں کئے گئے لیبلوں پر نہ جائیے، کہانیوں پر توجہ کیجیے۔ وہاں اگر زندگی گزیدہ لوگ ہیں تو زندگی نواز اور زندگی آموز بھی ہوں گے؛ پسے ہوئے ہیں تو تشہواز بھی ہوں گے۔ عرض کیا نا، خاصی آبادی ہے۔
مگر، سوچتا ہوں، یہ سب کہتے ہوئے کہیں میں اپنے کام کی تشہیر (پروموشن) یا وکالت تو نہیں کر رہا؟ کس لیے کہ یہ بات کسی بھی لکھنے والے کو زیب نہیں دے گی۔ میں تو لکھ چکا، کم وبیش کا حساب اور رد و قبول... یہ پڑھنے والے کے ذمے رہا۔ پھر میں بیچ میں بولنے والا کون؟

☆ آپ کے افسانوں اور کرداروں کو ہند اسلامی کلچر کا نمائندہ کیوں گردانا جاتا ہے؟

☆☆ میں نے تو سنا ہے میری بعض کہانیاں اُس قبیل کی ہیں جن میں ہند اسلامی کلچر نظر آتا ہے۔ درست! رہی نمائندگی... تو اسد محمد خاں کی کہانیاں خود اُسی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ Period

☆ موت کا موضوع آپ کے افسانوں کی بنیاد کیوں ہے؟

☆☆ میں نے ۸/۶ نظموں کو 'موت کی نظمیں' ضرور کہا ہے؛ دو چار کہانیاں مُردہ گھر سے اُٹھائی ہیں، یا اُنھیں اِس علامت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ تاہم موضوع میرا 'زندگی' ہی ہے اور یہ بھی دوست جانتے ہیں کہ بھیا! موت سے کس کو رستگاری ہے۔

☆ اسد محمد خان کا افسانہ پڑھ کر جسم میں بجلیاں کوندنے سے مراد کیا ہے؟

☆☆ آہا! یہ آپ نے براہِ راست، میرے جواں سال دوست، کہانی کار مدیر 'مکالمہ' برادرم مبین مرزا کے مضمون "نئی زمین نئے آسماں ..." سے quote کیا ہے۔ مرزا جی لکھتے ہیں۔ & I quote '... اِسی طرح ان کے ایک مزاج نے ان کے طوفانوں والے افسانوں کے لیے وفورِ جذبات میں یہ بھی کہا کہ افسانے میں بجلیاں سی دوڑتی محسوس ہوتی ہیں۔ سبحان اللہ، جیسی جس کے گمان میں آئی۔' unquote
میں سمجھتا ہوں، صاحبِ مضمون کا استعجاب، میری حیرت اور آپ کا بڑا پیارا ہوا سوالیہ نشان... یہ بھی تشنۂ جواب رہیں گے۔

☆ نظریاتی آلودگی سے فن کو پاک رکھنے کا مفہوم کیا ہے؟

☆☆ ایک سچا قصہ سناتا ہوں: کراچی میں اپنے طالبِ علمی کے زمانے میں، میں ماسکو سے نکلنے والا انگریزی جریدہ "رشین لٹریچر" منگانے لگا تھا۔ ایک برس تک (آنجہانی) یو ایس ایس آر میں لکھی جاتی، فاضل مدیر کی دانست میں 'نمائندہ' نرم گرم کہانیاں پڑھتا اور یہ سوچتا رہا کہ

چلنے دوں، بہت کم زور سالا نہ دیا ہوتا ہے۔ کبھی خیال ہوتا کہ یہ اُتری اُتری سی کہانیاں فکشن کی ایک ذور کی زرخیز زمین، روس، کی نمائندہ تو نہیں ہو سکتیں۔ ہو نہ ہو کسی ادیب کی جگہ انھوں نے پولٹ بیورو کے 'نظریاتی چیف' کو بٹھا دیا ہے۔ مجھے جو کچھ 'غیر نظری' سا دکھائی دیتا ہے تو، بلاشبہ، وہی 'معشوق ہے اِس پردۂ زنگاری میں'۔

یہ سب چل رہا تھا کہ اُن کے تازہ شمارے میں ایک غیر معمولی، اور بھیانک حد تک گھسی، کہانی پڑھنے کو ملی... تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ بھیا! enough is enough۔ تفنّنِ طبع کے لیے کہانی کا خاکہ پیش کرتا ہوں:

کچھ پُرجوش رومانی (اور committed) نوجوان لڑکے لڑکیاں، کسی مسئلے پر دوسرے (ہنوز دہر پکومت میں شامل نہ ہو پائے) نوجوانوں کو بلا کر ان کے سامنے پرولتاریہ کا 'عظیم الشان' موقف پیش کرنے کے مقصد سے میٹنگ کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ میٹنگ کے لیے وہ ابھی کسی جگہ کا انتخاب تو نہیں کر پائے؛ ہاں مہمانوں کی تواضع کے لیے چندہ کیا گیا ہے اور طے ہوا ہے کہ کون کیا کرے گا؛ یہ کامریڈ، بیئر کی بوتلیں، وہ، گلاس اور برف، اور فلاں لی لی، گز ک کا انتظام کرے گی۔ ایک عثانوفیا احموف جیسا مکا نیا شامل ہوا کامریڈ پوچھتا ہے "بھئی یہ بتاؤ کہ آپ لوگوں نے میٹنگ کی جگہ بھی سوچی ہے؟" تو نوجوانوں کا سرگروہ کہتا ہے "ہاں، کیوں نہیں۔ دو تین ماہ پیچھے ہم نے جو مسجد تا بود کی تھی، وہیں جمع ہوں گے۔ کھلی جگہ ہے، تم قدیمچیں بھی ہیں اُن پر گلاس بوتلیں رکھنے میں سہولت ہوگی۔"

عثانوفیا احموف نے (جس کے پس منظر کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے) اِس انتخاب پر حیرت ظاہر کی، تو سرگروہ نے ایک خاصی لمبی تقریر میں اُس کے رجعت پسندی کی رد عمل پر لعن طعن کی اور مشورہ دیا کہ وہ اپنے نظریاتی نقطہ نظر کے گٹر پنچ کے لیے، کارل مارکس کی فلاں فلاں تحریر کا بغور مطالعہ کرے۔

یعنی جناب والا! دوسری کسی کہانی میں سرگروہ کی تقریر کی جگہ اگر بامیان کے بُدھا کو بارود سے اُڑانے کے لیے طالبان کا "نظریاتی" خطبہ درج کر دیا جائے تو بھی یہی بات ہوگی۔ پس ثابت ہوا کہ کسی بھی کہانی کی کھلی فضا میں "نظریاتی آلودگی کے فضلولا کا گٹر پنچ" ڈال دینے سے سانس لینا دوبھر ہو جاتا ہے و ما علینا اِلّا البلاغ...

☆ سنا ہے! آپ نے اپنے افسانوں میں تجربات بھی کیے ہیں۔ ہم آپ کی زبانی ان کی تفصیل جاننا چاہیں گے؟

☆☆ اس سوال کا جواب مجھے نہیں معلوم کہ میں نے بہ حیثیت کہانی کار اپنے پورے کریئر میں کتنے "تجربے" کیے ہیں؟ (تو کیا زبان و بیان کے؟ پلاٹ fabrication؟ کیریکٹر deployment اور کرداروں کے مکالمے سے متعلق؟ اور وغیرہ وغیرہ کے ضمن میں کیے گئے تجربے؟) نہیں جناب والا! مجھے اِس بے ثمر مشقت میں دو برس لگ جائیں گے۔ آپ ہی بتایئے؟ اِس مدّت میں کچھ اور نہ لکھ لوں گا؟ ویسے بھی تحقیق میرا شعبہ نہیں۔ no sir

☆ کچھ لوگ آپ کو شوکت صدیقی کا تسلسل بھی گردانتے ہیں کیونکہ آپ کے فن کی ابتدا ان کی انتہا سے ہوتی ہے؟

☆☆ ہم میں سے ہر ایک لکھنے والا اُس خوش انجام لکھنے والے کا تسلسل ہے جس نے قلم اُٹھایا تھا اور پہلا حرف لکھا تھا کہ الف اللہ... ورنہ ادرما! کیا ابتدا اور کیسی انتہا؟ پشتو زبان کے بے مثال شاعر، بزرگ و دانش مند رحمان بابا علیہ الرحمہ فرماتے ہیں، "ایک لمحے میں اگر ہزار مٹ جاتے ہیں تو ہزار پیدا بھی ہو جاتے ہیں۔ اِس آمد و رفت کا کوئی حساب نہیں۔ اک بحرِ بے پایاں ہے جو بہا چلا جاتا ہے۔" حق ہے!

☆ ایک رائے یہ ہے کہ ناقدین کی اکثریت نے ساٹھ کی دہائی کے بعد فکشن پڑھنا اس لئے چھوڑ دیا کہ ان کے خیال میں جو کچھ لکھا جانا تھا وہ لکھا جا چکا۔ اس جمود کی بابت آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

☆☆ سترہویں صدی عیسوی میں، عقیدے کے اعتبار سے سخت گیر (بنیاد پرست) مسیحیوں کا ایک گروہ، دیگر مسیحی فرقوں سے نامطمئن ہو کر علیحدہ ہوا۔ دنیا بھر میں (یعنی امریکہ کی ۲۳ ریاستوں اور کینیڈا کے ایک صوبے میں) اِس وقت ان کی کل تعداد چھیاسی ہزار ہے۔ اللہ بس باقی ہوس۔ یہ فرقہ آمش (Amish) کہلاتا ہے۔ آمش بھائی لوگ بجلی سمیت تمام ٹکنالوجی سے مکمل پرہیز کرتے ہیں۔ رسل و رسائل کے جدید طریقوں کو غیر مسیحی سمجھتے ہیں۔ سفر اور بار برداری میں وہ گھوڑا گاڑیاں، گدھے اور خچر استعمال کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ ہمیں ویسے ہی زندگی بسر کرنی چاہیے جیسے مسیح کے دور میں صاحبِ ایمان مسیحی بسر کرتے تھے۔ گویا وقت، اُن کے لیے، ۱۰۰ء میں ٹھہر گیا ہے تو کیا ناقدین کی اکثریت کا وقت "ساٹھ کی دہائی" میں آن رکا ہے؟ ...حضرت! عقل کا نہیں کرتی!

☆ ناقدین کی بے اعتنائی سے بھی آپ بہت شاکی، بلکہ دل برداشتہ رہے ہیں؟

☆☆ ۱ے ء میں کوئی سات مہینے 'دل برداشتہ' رہا۔ ایک صاحب نے (کسی درخواست کے بغیر) از خود وعدہ کیا تھا کہ وہ میری کہانیوں پر انگریزی پرچے میں ایک مضمون لکھیں گے۔ وہ سات ماہ خاموش رہے پھر ای گریشن لے کے دبا اور چلے گئے۔ تو اِس سوال کے جواب میں عرض ہے کہ 'ایک ناقد' کی بے اعتنائی سے، ہمیں اے ء میں چند ماہ ضرور دل برداشتہ رہا ہوں۔ آخر کو بندہ بشر ہوں۔

☆ کبھی آپ کو تنقید کی جانب توجہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی؟

☆☆ کبھی نہیں۔

☆ ڈرامہ کی طرف آپ کا فطری رجحان تھا یا یہ معاشی ضرورت کے تحت اپنایا گیا، نیز آپ نے کل کتنے ڈرامے تحریر کیے، کیا آپ انھیں اپنے تخلیقی کام میں شمار کرتے ہیں؟

☆☆ ابھی عرض کر چکا ہوں کہ ٹی وی ڈرامے ٹکے کمانے کو لکھے۔ ہر

زبان کا ڈرا ما پڑھنے، پڑھتے رہنے کا، اور برسوں میں کبھی موقع ملے تو دیکھنے کا بھی شوق ہے نہیں معلوم کہ کُل کتنے لکھے تخلیق کا مُتووہ بے شک ہے وہ میں اپنے اکثر ڈراموں کو own بھی کرتا ہوں۔ دو چار کو ادبی پرچوں میں چھپوا چکا ہوں تا ہم، کہانی کار (یا زیادہ سے زیادہ شاعر) ہونے پر ہی اصرار کرتا رہوں گا۔ جناب! اِس آدمی کو پلے رائٹ کہلانا اُسی وقت اچھا لگے گا جب یہ اپنے دوست، سرونٹو ردیال سکینہ کی طرح کھیلوں کے کم سے کم دو مجموعے چھپوالے گا۔

☆ امریکی سفارت خانے کے لئے کس طرح کی، کون کون سی فلموں کا ترجمہ کیا۔ اس کام سے منہ موڑنے کے اسباب کیا تھے؟

☆☆ سب ڈوکیومینٹری فلمیں تھیں۔ خلائی سفر سے، ورکھوڑوں اور ٹرکیوں کی پرورش و پرداخت سے متعلق۔ اور soul موسیقاروں کے بارے میں۔ نیگرو لوک شاعری کی روایت پر۔ اور جناب! منہ موڑنے کی وجہ کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ مگر سفارت خانہ ہی اسلام آباد چلا گیا۔

☆ ’’اچھا تو تم بھی اس ریکٹ میں شامل ہو گئے؟‘‘ ماجدہ سرور کا یہ جملہ اپنے اندر کیا مفہوم رکھتا ہے؟

☆☆ ماجدہ آپا بخیر اسلامت رکھے، ایک آئیڈیلسٹ ادیب ہیں۔ اپنی فکشن کا موسم بہار انھی جیسے چند بے مثال لوگوں کے نام سوں ... اور کا سوں سے پہچانا جاتا ہے اور پہچانا جائے گا۔ خود آپا نے بھی، اور (بخت مکانی) احمد علی خاں صاحب نے بھی ایک سے زیادہ حوالوں کے ساتھ مجھے اپنا خوردجانا ہے۔ اُن کا حق ہے کہ اِس جونیئر فکشن رائٹر کو ٹیک و بد سمجھاتی رہیں۔ انھیں اُس وقت بھی معلوم تھا کہ میں مشاعروں وغیرہ میں بہت زیادہ نہیں جاتا۔ ۹۱/۹۰ء میں انھیں (برادرم خالد احمد سے) خبر ملی کہ اسد خاں بھی ناروے اور برطانیہ کے 'مشاعرے پڑھنے' جا رہا ہے۔ میں نے کچھ پوچھنے کو فون کیا تو انھوں نے اپنے مخصوص مشفقانہ انداز میں یہ بات کہی۔ جملے کا 'بھی' میری اور خالد احمد کی وجہ سے تھا۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمارے سفید سروں پر بڑوں کی چھتر چھایا ہے۔

☆ آپ کو جدید اردو فکشن کا غالب گردانے والے غالب اور آپ میں سے کس کے ساتھ زیادتی کے مرتکب ہو رہے ہیں؟

☆☆ اللہ غنی! کیا نکتے لاتے ہیں حضرت آپ! سید مظہر جمیل تو مجھے پُرانے کتاب گھروں کا کولمبس بھی کہتے ہیں۔ بھائی! میں صرف امرخ ہوں۔ نہ کم نہ زیادہ۔ لیجیے، اپنی طرف سے ایک بونس کا سوال پیش کر رہا ہوں: یہ فرمایئے گا کہ ان تین دوستوں میں سے دراصل ’فخر سون سکیسر‘ کون ہیں: گلزار جاوید صاحب، آپ؟ ممبئی والے گلزار صاحب؟ یا ڈپ گرائی گلزار وفا چودھری؟ کیسے کیا بات دھیان میں آئی؟

☆ آپ اپنی تخلیقات کو اپنے عہد کے بڑے فکشن میں شمار کرتے ہیں؟

☆☆ بڑے چھوٹے کا کیا ذکر۔ حضرت! میں نے اپنی تربیت اِس

ڈھب سے کی ہے کہ اگر میری کسی کہانی کو آج کی 'قابلِ ذکر تخلیقات' میں شمار کر لیا گیا تو سمجھوں گا کہ محنت سوارتھ ہوئی۔

۔بقیہ: میں کیوں لکھتا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ روپے لے کر مٹھو نے میرے ساتھ دغا کی تھی اور چھل تک ہاتھ بڑھانے کے اس استحقاق کو زک پہنچائی تھی..... اُسے کم زور کیا تھا کہ جو نئی میں سنے ہوئے آدمی کا استحقاق ہے۔

میں ایک کہانی لکھ کر اس Betrayal کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔

قارئین! میں لنگڑے چھٹو جیب تراش کی کہانی بھی سنانا چاہتا تھا: جسے اپنی عورت کے نت نئے ملاقاتیوں کے نقد تحائف اور دوسری متعلقہ باتوں پر تو، سنا ہے، کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن جس نے اپنے ’’پیر و مرشد‘‘ کو صرف اس بات پر چھریاں مار کر ہلاک کر دیا تھا کہ پیر نے اس کی عورت کا ہاتھ.....

میں یہ کہانی صحیح وقت پر پوری تیاری کے ساتھ سنانا چاہتا تھا☆

’تیاری‘ اور ’وقت‘ میں نے ابھی ابھی دو کلیدی الفاظ لکھے ہیں۔ اپنی بات کہنے کے لیے میں ان دو لفظوں کو ضرور حوالہ بناتا ہوں۔ تو شاید میں بہت تیاری سے لکھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے میرے دوسرے فاضل دوست بھی پوری تیاری سے لکھتے ہوں گے۔ میری تیاری Conceptual بھی ہوتی ہے اور اسٹرکچرل بھی۔ حد یہ ہے کہ میں اپنی تحریر میں برتے ہوئے جانے مانے لفظ کو بھی ایک بار لغت میں دیکھ کر اطمینان کر لیتا ہوں۔

دوسری بہت سی اچھی باتوں کی طرح یہ عادت بھی میرے محترم استاد پروفیسر حسنین کاظمی صاحب مدظلہٗ کی عطا ہے اور انھی کی ڈالی ہوئی ہے۔ اس طرح کمپوزیشن کے ساتھ املا تک پر توجہ کر کے میں چاہتا ہوں کہ امکان بھر درست زبان پڑھنے والوں تک پہنچاؤں۔ یقیناً یہ سرسید اور مولوی عبدالحق اور مولانا ابوالکلام جیسے جلیل القدر نثر نگاروں کا احسان ہے کہ انھوں نے میری نسل تک کو (اور میرے بعد آنے والوں کو بھی) شاندار، زندہ، متحرک اور درست نثر پڑھنے اور سراہنے کے قابل بنایا۔

اور میں اس لیے بھی لکھتا ہوں کہ ایک طرف تو جاری وقت میری تحریر میں اپنی جھلک دکھائے..... میری عاجزانہ کاوشوں میں، جس حد تک بھی ممکن ہو، پڑھنے والے کو میرا اپنا زمانہ دکھائی دے اور دوسری جانب بحرِ وقت، جو ماضی حال مستقبل سے الگ ایک غیر ابدی تسلسل ہے اپنی ازلی ابدی سچائیوں کے ساتھ میری ناچیز تحریروں پر اپنا سایہ ڈالتا رہے۔

بھگوت گیتا میں لکھا ہے: جان لو کہ مجھ سے پرے کچھ بھی نہیں..... میں ماضی حال اور مستقبل ان تینوں زمانوں میں پیدا ہوئے سبھی لوگوں کو جانتا ہوں۔ ایسی سچی شناسائی کی چلچلاتی دھوپ میں آنے اور کھڑے رہنے کے لیے اپنے پروردگار سے صرف دعا ہی کی جا سکتی ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

☆ یہ کہانی ’’ماسٹر‘‘ کے عنوان سے لکھی جا چکی اور میرے ایک مجموعے میں شامل ہے۔

☆☆☆

جمالیاتی ذوق کا امین

عقیلہ اسماعیل/(اردو ترجمہ) رضی مجتبیٰ

(ابوظہبی)　　　(کراچی)

اسد محمد خاں لفظوں کی جادوگری سے اُن عام لوگوں کی کہانیاں بُنتے ہیں جن کی بیشتر توانائی ایسے مسائلِ حیات سے نمٹنے میں صرف ہوجاتی ہے جو اُن کی زندگیوں کو شکست و ریخت سے دوچار کرتے جاتے ہیں۔ مگر انجام کار، یہی لوگ ناموافق حالات سے نمٹ کر اُبھرنے کی سکت بھی رکھتے ہیں۔

اسد کی کم و بیش ہر کہانی، شہری زندگی کے مسائل کی طنزیہ تشخیص سے عبارت ہے۔ جیسا کہ ایک معروف نقاد محمد سلیم الرحمٰن کا کہنا ہے "وہ حقیقی دُنیا کو نہایت صاف نو کس کیے گئے لینس کے ذریعے پیش نہیں کرتے بلکہ یہ ایک مختلف النوع نظارہ ہے، جس میں کسی قدر دھند و فساد بھی ہے اور جہاں طنز و استہزاء ایک گرم جوشی کے ہم قدم نظر آتا ہے۔ بظاہر یہ سب چیزیں باہم متضاد نظر آتی ہیں لیکن بات یہ نہیں کہ ان کہانیوں کے کردار کیسے مضحکہ خیز یا بدقماش ہیں؛ اصل بات یہ ہے کہ وہ جیتے جاگتے انسان ہی تو ہیں۔ دیکھا جائے تو اس استہزاء، تمسخر اور عجیب النوع سرگرمی کی اوٹ میں ایک گہرا سکوت بھی ہے عفو اور درگزر کا گہرا سکوت۔"

اسد محمد خاں نے افسانے کو بالخصوص اپنا ذریعۂ اظہار شاید اس لیے بنایا ہے کہ اس کی ہیئت اپنے ساختی ڈھانچے میں شاعری سے قریب تر ہے جس میں ان گنت جذبوں کو سمویا جا سکتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ایک شاعر کی حیثیت سے کیا۔ ان کی پہلی نظم ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ مختصر افسانہ نویسی کی طرف تو وہ بہت بعد میں آئے، یعنی ۱۹۷۰ء کے عشرے میں۔

وہ اپنے آبائی وطن بھوپال (وسطی ہندوستان) میں ۲۶ ستمبر ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد عزت محمد خاں نے جو ایک مقامی سیکنڈری اسکول میں مصوری کے استاد تھے، کچھ وقت ٹیگور کے شانتی نکیتن میں گزارا تھا۔ ان کی والدہ منور جہاں بیگم عظیم شاعر مرزا غالبؔ کے ایک شاگرد، نواب یار محمد خاں شوکتؔ کی پوتی تھیں۔ اسد محمد خاں نے ہائی اسکول کی تعلیم بھوپال کے شاہ جہانی ماڈل اسکول میں حاصل کی۔ سترہ سال کی عمر میں، جب کہ وہ کالج کے طالب علم تھے، وہ 'بائیں بازو' کی سیاست میں ملوث ہو کر سیاسی مواد تقسیم کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیے گئے۔ جیل میں سترہ دن گزارنے کے بعد انھوں نے اپنے ایک پولیس افسر ماموں کے اثر و رسوخ کے باعث رہائی اور معافی حاصل کی۔ اس پر ان کی پارٹی کے ساتھیوں نے ان پر انتظامیہ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اپنے نصب العین کو نقصان پہنچانے کا الزام لگایا اور انھیں اپنی صفوں سے نکال باہر کیا۔ اس ناموافق صورتِ حال کے پیشِ نظر ان کے والد نے انھیں دو راستوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ بمبئی چلے جائیں جہاں وہ پہلے ہی جے جے اسکول آف آرٹس کا ایک کورس مکمل کر چکے تھے، یا پھر اپنے بڑے بھائی کے پاس چلے جائیں جو ۱۹۴۸ء سے سیالکوٹ کے مشہور مرے کالج میں زیرِ تعلیم تھے۔ اسد محمد خاں نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور ۱۹۵۰ء میں پاکستان آ گئے۔

اس کے کچھ ہی عرصے بعد انھیں اپنے بھائی کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا جو اپنڈکس کی سوزش کے نتیجے میں ۱۹-۲۰ برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اس وقت ان کے بھائی کاکول اکیڈمی میں تھے اور چند ہی دنوں بعد گریجویشن کرنے والے تھے۔ بعد میں، ۱۹۷۹ء میں اسد محمد خاں کو ایک اور المناک تجربے سے گزرنا پڑا جب ان کے چھوٹے بھائی، جو سندھ میں ایک بینک کے منیجر تھے، ایک حادثے میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ لگتا ہے کہ ان اموات کا اسد محمد خاں پر نہ مٹنے والا اثر ہوا۔

اپنے بڑے بھائی کی بے وقت موت کے بعد انھیں حالات کا خود ہی مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ سخت رکاوٹوں کے باوجود انھوں نے خود کو کسی طرح مصروف رکھا تاکہ کراچی میں ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہ سکے۔ آخر کار انھوں نے سندھ مسلم کالج سے بیچلر کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کے ارادے سے کراچی یونی ورسٹی میں داخلہ لیا، پہلا سال مکمل کیا، مگر ناکافی مالی وسائل کی بنا پر، انھیں اپنا یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔

انھوں نے پاکستان ریلوے میں اسٹیشن ماسٹر کے ملازمت کے لیے درخواست دی، اس کے لیے منتخب ہو گئے اور لاہور میں ٹریننگ پانے کے بعد حیدرآباد میں متعین بھی کر دیے گئے، لیکن چند ہی ماہ بعد یہ ملازمت چھوڑ کر وہ کراچی پورٹ ٹرسٹ میں آ گئے جہاں وہ اپنی ریٹائرمنٹ (۱۹۹۲ء) تک، درآمدات کے انسپکٹر کے طور پر کام کر رہے تھے۔

اسد محمد خاں کو مالی وسائل نہ ہونے کی بنا پر فائن آرٹس سے اپنی گہری دلچسپی کو آگے بڑھانے میں ناکامی کا افسوس ساری زندگی رہا ہے۔ اپنے والد کی طرف سے انھیں جو جمالیاتی ذوق ورثے میں ملا تھا اس کے، کسی قدر اظہار کے لیے، انھوں نے مختصر نظمیں کہنا شروع کیں۔ نتیجے میں، اپنے وقت کے کراچی کے چند بہترین شاعروں سے اُن کی رسم و راہ ہوئی، جن میں سلیم احمد، ساقیؔ فاروقی اور اطہر نفیس شامل تھے۔ ان کے خیال میں یہ مراسم خود ان کے

لیے بہت خوش بختی کا باعث تھے۔ اسد کہتے ہیں کہ ان شعرا کی جرأت، جدت طرازی، زیر نہ ہونے والے اعتماد اور رجائیت پسندی کا سایہ ان پر بھی پڑا اور اس کی وجہ سے زندگی کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر کلی طور پر تبدیل ہو گیا۔

اسد محمد خاں کی اولین شعری تخلیقات؛ ایک گیت اور "نو منزلہ بلڈنگ" کے زیرِ عنوان ایک نظم، ۱۹۶۰ء میں بنگلور کے ایک سہ ماہی ادبی رسالے "سوغات" میں شائع ہوئیں۔ ہندوستان میں نقادوں کی طرف سے اس نظم کو ایسی پذیرائی حاصل ہوئی کہ دس سال بعد اردو کے مشہور نقاد اور شاعر خلیل الرحمن اعظمی نے جدید شعرا پر اپنی تالیف "نئی نظم کا سفر" میں اسے شامل کیا۔ اعظمی صاحب کی یہ کتاب علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اور ان دیگر ہندوستانی یونی ورسٹیوں کے وسیع تر درسی نصاب میں شامل ہے، جہاں ماسٹرز کی سطح پر اردو پڑھائی جاتی ہے۔

تاہم اپنے وطن پاکستان میں اس شاعر کا وجود نسبتاً گم نامی میں رہا اور انھیں بہت ہی کم توجہ اور پہچان ملی۔ اُن دنوں کو یاد کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ پاکستانی نقادوں کی بے اعتنائی نے انھیں ساٹھ کی دہائی اور ستر کے عشرے کے ابتدائی برسوں تک تو پریشان نہیں کیا لیکن ۱۹۸۰ء کے عشرے کے آنے تک انھیں اس رویے پر ایک طرح کی بے کلی اور برہمی کا احساس ہونے لگا، جس سے وہ بہت دنوں چھٹکارا نہ پا سکے۔ تاہم، دوسری طرف انھیں سید وقار عظیم، فیض احمد فیض، ممتاز حسین، احمد ندیم قاسمی اور ناصر کاظمی کی طرف سے ملنے والی داد اور فراخ دلانہ حوصلہ افزائی نے بڑی طمانیت پہنچائی۔

۱۹۶۵ء میں انھوں نے اپنی ایک کزن فرزانہ سے شادی کی۔ جن سے تین بیٹیاں ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں آبائی وطن بھوپال میں ہونے والی ان کی پہلی شادی، جس سے ایک بیٹا ہے، برقرار نہ رہ سکی تھی۔ بیٹا کمپیوٹر ہارڈ ویئر کے شعبے سے وابستہ ہے اور بنگلور میں رہتا ہے۔

اسی دوران میں اسد محمد خاں نے ریڈیو پاکستان کے لیے خاکے اور گیت لکھنے شروع کر دیے تھے۔ ۱۹۶۵ء میں انھیں ریڈیو کی طرف سے، برطانیہ کے لیے ایک پروگرام میں، خبروں کا ترجمہ کرنے اور نشر کرنے کی پیش کش ہوئی۔ ریڈیو میں کام کرتے ہوئے، منفرد شاعر عزیز حامد مدنی سے ان کا رابطہ ہوا اور مشہور افسانہ نگار غلام عباس کی بیگم کرسٹین عباس کا بھی ساتھ رہا۔ کرسٹین نے لندن پر جرمنوں کی بمباری کا زمانہ دیکھا تھا؛ وہ جنگ سے سخت نفرت کرتی ہیں۔ وہ اور اسد محمد خاں، ہٹلر کی سوانح حیات "مائن کیمف" ایک ساتھ پڑھا کرتے اور ہٹلر کے مؤقف کو جاننے کے لیے نازی 'فلسفے' کے مختلف پہلوؤں پر بحث کیا کرتے تھے۔ تقریباً اسی زمانے میں اسد محمد خاں، امریکی سفارت خانے کے لیے مختصر فلموں کے اسکرپٹ ترجمہ کرنے لگے۔ سینیگال کے اس وقت کے صدر لیوپولڈ سینگھور کے بارے میں ایک فلم نے عالمی ادب، خصوصاً افریقی ادب، کے بارے میں ان کے خیالات کو نئی جہت عطا کی اور اسد، وولے شوئنکا کی تحریروں میں دلچسپی لینے لگے۔

جن دنوں وہ ریڈیو پاکستان میں کام کر رہے تھے؛ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک خونی جنگ چھڑ گئی۔ یہ زمانہ اُن خاندانوں کے لیے خصوصاً بڑے کرب کا تھا جن کا سرحد پار رہنے والے اپنے رشتے داروں سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ اسد محمد خاں کی والدہ اسی زمانے میں انتقال کر گئیں، لیکن انھیں چار مہینے تک اس سانحے کی اطلاع نہ مل سکی۔ ایک خط کسی ایسے شخص کو بھیجا گیا تھا جو کسی تیسرے ملک میں رہتا تھا... وہ خط آگے اسد محمد خاں تک نہیں پہنچایا گیا۔ اسد کو یاد ہے کہ یہ لاعلمی ایک ہولناک تجربہ تھا۔ جن لوگوں سے انھیں دلی تعلق تھا، وہ ملکوں کی آپس کی دشمنی کے سبب ان سے کٹ کر رہ گئے تھے۔ برسوں وہ اپنی والدہ کی قبر پر حاضری بھی نہ دے پائے، کیوں کہ بار بار کی کوششوں کے باوجود انھیں ویزا نہیں مل سکا تھا۔ ایک مدت بعد یہ ممکن ہوا کہ وہ اپنی بیٹیوں کو اُن کے دادا اور دوسرے عزیزوں سے ملوانے ہندوستان لے جا سکے۔

ان کا پہلا مختصر افسانہ "باسودے کی مریم"، جس کا ترجمہ زیرِ نظر مجموعے میں شامل ہے ۱۹۷۱ء میں "فنون" لاہور میں شائع ہوا۔ اس کا مرکزی کردار اسد محمد خاں کی اپنی مریم کے انداز پر تراشا گیا ہے جو اُن کے خاندان کے ایک رکن کی سی حیثیت رکھتی تھی اور جس نے ان کے گھرانے کی تین پشتوں کو پالا پوسا تھا۔ وہ اُن کے ساتھ رہتی تھی اور گھر کے سربراہوں کے بعد اسی کا حکم چلتا تھا۔ "فنون" کے مدیر احمد ندیم قاسمی نے، جو خود ایک بڑے افسانہ نگار اور شاعر ہیں، ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ اگر اردو میں مختصر افسانہ بہ حیثیت صنف معدوم ہو جائے، تب بھی یہ افسانہ دائم زندہ رہے گا۔ پچھلے بیس برسوں میں یہ افسانہ اُن کے ایک اور افسانے "مئی دادا" کے ساتھ اردو نثر نگاری کے نمایاں نمونے کے طور پر اردو دنیا کی ثقافتی محفلوں اور یونی ورسٹیوں میں بہ آواز پڑھا جاتا رہا ہے۔

اسد محمد خاں محسوس کرتے ہیں کہ انھیں اپنی تخلیقات کی اشاعت کے لیے تحریک بڑی حد تک اپنی اہلیہ فرزانہ سے ملی ہے۔ مالی الجھنوں کے باوجود انھوں نے اتنی رقم پس انداز کر لی تھی کہ ۱۹۸۲ء میں اسد اپنا مجموعہ "کھڑکی بھر آسمان" شائع کروا سکے۔ اس میں ان کی بیس برسوں کی کاوش کا حاصل یک جا ہے؛ جن میں نظمیں بھی ہیں اور مختصر افسانے بھی۔ وہ جانتے تھے کہ اردو کی کتابیں فروخت نہیں ہو پاتیں، مگر وہ چاہتے تھے کہ انھوں نے اب تک جو کام کیا ہے اسے سامنے لائیں۔ ۱۹۹۰ء میں اُن کی دوسری کتاب، افسانوں کا مجموعہ "برج خموشاں" شائع ہوا۔ پہلے کی طرح، ان کی اہلیہ نے، گھر کے خرچ سے کوشش کر کے، بچائی ہوئی رقم فراہم کی اور اشاعتی مراحل میں اُن کے دوستوں نے ہاتھ بٹایا۔ اتفاق کی بات کہ دونوں کتابوں سے کچھ منافع بھی حاصل ہوا

لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ان کتابوں کی اشاعت سے یہ بات طے ہو گئی کہ وہ ایک اہم ادیب ہیں۔

اپنی کتابوں کے لیے کاروباری ناشرین کا تعاون حاصل کرنے سے ان کی ہچکچاہٹ، تشہیر اور اس خودنمائی سے گریز، جو آج کل "پی آر" کہلاتی ہے، ان کی طبیعت میں ہے۔ یہی چیز انھیں انٹرویو دینے سے روکتی ہے اور اسی سبب سے وہ اُن اخباروں سے بھی بے اعتنائی برتتے ہیں جن کی پالیسیوں سے انھیں اختلاف ہوتا ہے۔ اسی رویے کی وجہ سے انھیں کبھی مغرور بھی کہا جاتا رہا ہے لیکن خود اپنے بارے میں وہ کبھی غلط فہمی کا شکار نہیں رہے۔ انھیں اندرسے، بہ حیثیت ایک مصنف اپنی اہمیت پر پورا اعتماد ہے۔ اگر ان کی تخلیقات، اُن تھوڑے سے لوگوں سے داد وصول کر لیتی ہیں، جو درحقیقت اِس معاملے میں اہمیت رکھتے ہیں؛ تو وہ مطمئن ہو جاتے ہیں۔

۱۹۹۰ء میں بریڈفرڈ کی سینٹرل لائبریری کی جانب سے انھیں ایک خط ملا جس میں "کھڑکی بھر آسمان" کے مندرجات کی بہت تعریف کی گئی تھی اور ساتھ ہی انھیں ایک کانفرنس میں مدعو کیا گیا تھا۔ انھوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی اور اس میں، برصغیر سے باہر رہنے والے اردو کے مصنفین کے حوالے سے، ایک مضمون بھی پڑھا۔ اگلے سال جب وہ اوسلو اور بریڈفرڈ میں ایک کانفرنس اور ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے جانے والے تھے تو ہاجرہ مسرور نے انھیں فون پر یوں کہہ کر سرزنش کی، "اچھا تو اب تم بھی اِس ریکٹ میں شامل ہو گئے ہو!" انھوں نے جواب دیا، "آپا! ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے مجھے تو بدنام اڈوں پر بھی جانا چاہیے!"

اسد محمد خاں کا خیال ہے کہ ہر مصنف کو ہر قسم کی تحریر پر کم از کم ایک دفعہ اپنی طبع، ضرور آزمانی چاہیے۔ خود انھوں نے ٹیلی وژن کے لیے بھی ڈرامے اور سلسلہ وار کھیل لکھے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ کام اپنے اور اپنی فیملی کے مالی حالات کو بہتر بنانے کے لیے کیا گیا تھا؛ مگر اس سلسلے کے تحقیقی کام نے انھیں تھائی لینڈ، مالدیپ، پرتگال، اسپین اور فرانس جیسے ملکوں کے سفر کے مواقع فراہم کیے اور اگرچہ ٹیلی وژن پر پیش کیا جانے والا اُن کا تاریخی سیریل "شاہین" خاصا کامیاب رہا، پھر بھی وہ مختصر افسانے کو اپنا اصل میدان اور عام آدمی کی زندگی کو اپنا اصل موضوع سمجھتے ہیں۔

موت کا موضوع ان کے افسانوں سے کبھی دور نہیں ہوتا۔ وہ ایک کہانی کے بعد دوسری میں اس طرف اس طرح لوٹ لوٹ کر آتے ہیں جیسے یہ خیال ان کے ذہن پر بڑی شدت سے مسلط ہو۔ اس کی مثالیں ان کی کہانیاں "وقائع نگار" اور "مردہ گھر میں مکالمہ" ہیں (جن کے تراجم زیرِنظر مجموعے میں شامل نہیں)۔

ان پر موت کا یہ آسیب جیسا سایہ کیوں ہے اس کی وجہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں۔ وہ بڑے دکھ کے ساتھ یاد کرتے ہیں کہ جب وہ حیدرآباد کے مردہ خانے سے حادثے میں ٹوٹا پھوٹا، اپنے چھوٹے بھائی کا جسد لینے پہنچے تو انچارج پولیس والے نے اتنی تفصیل کے ساتھ لاش کی کیفیت بیان کرنی شروع کر دی کہ وہ سُن ہو کر رہ گئے... برسوں پہلے بھی، انھیں ایسے ہی کسی عذاب سے گذرنا پڑا تھا؛ بڑے بھائی کی لاش لینے وہ سی ایم ایچ گئے تھے، اور صرف ایک چادر کو لوٹانے کے لیے، کہ جس میں بھائی کو لپیٹ کے حوالے کیا جا رہا تھا، انھیں وصولی کے کاغذ پر دستخط کرنے پڑے تھے۔

اسد محمد خاں شاید ہی کبھی 'بولنا کی' کو ڈرامائی انداز دیتے ہیں۔ اس کے بجائے وہ اسے معمول کی چیز کے طور پر پیش کرتے ہیں جس کی وجہ سے قاری کے لیے اس کی شدت اور بڑھ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر مختصر افسانے "وقائع نگار" کو لیجیے۔ ابتداء میں قاری یہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ کسی جنسی جذبے کی روداد بیان کی جا رہی ہے مگر آخر میں اُسے پتا چلتا ہے کہ درحقیقت یہ میڈیا پر ایک پر زور تبصرہ ہے۔ میڈیا، جو پہلے کسی چیز کو بڑی عرق ریزی سے بناتا ہے پھر، جو تخلیق کرتا ہے اُسے خود ہی تباہ بھی کر دیتا ہے۔ یوں ہے کہ فکشن لکھنے والے کے مقابلے میں صحافی کی ذمے داری زیادہ بھاری ہوتی ہے کیوں کہ وہ عام آدمی سے بہت قریب ہوتا ہے اور اسی کی زبان بولتا ہے۔ لیکن صحافی کبھی کبھی بڑے غیر انسانی رویے اختیار کر لیتے ہیں۔ انھیں بنانے اور بگاڑنے کی طاقت حاصل ہوتی ہے تو وہ کسی بھی شخصیت کو تعمیر کر سکتے ہیں اور منہدم بھی۔ اور شخصیت ہی کو کیا، وہ تو تاریخ کو بھی جیسا چاہے رنگ دے سکتے ہیں۔ لوگوں کی زندگیوں پر پریس کی بے ضمیری جس طرح منفی اثرات مرتب کر سکتی ہے کہانی میں اُس کی بلند آہنگ میں مذمت کی گئی ہے۔

ادبی رسالے "سویرا" لاہور میں شائع ہونے والی کہانی "ہٹلر، شیر کا بچہ" کا مرکزی کردار اس شخص پر بنی ہے جو بھوپال کی ایک حوالات میں اسد محمد خاں کے ساتھ کچھ دن ایک ہی کوٹھڑی میں بند رہا تھا اور جس پر حملہ آوری اور آبروریزی کے الزامات تھے۔ اسی کوٹھڑی میں ایک مقامی 'مافیا' کا سردار بھی موجود تھا۔ دو دن تک کوٹھڑی کا اول الذکر قیدی، 'مافیا' سردار کو اپنے کارنامے سنانے کی کوشش کرتا رہا، تا ہم سردار نے بالآخر اسے ایک کمسن لڑکے کی موجودگی میں اپنی داستان سنانے سے منع کر دیا۔ جیل کی کوٹھڑی کے اس حوالاتی کی شخصیت اسد محمد خاں کو اکثر یاد آیا کرتی تھی۔ بالآخر انھوں نے اسے لکھ ہی دیا مگر تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ۔ ان کے افسانے کا یہ کردار اپنی داستان طرازی کے لیے ایک

خیالی دنیا تخلیق کر لیتا ہے جب کہ حقیقی زندگی کا کردار اپنے سچے تجربے بیان کرنا چاہتا تھا۔ افسانے کا بٹلر شرمیلا ہے اور نا خواندہ ہونے کے باوجود شعر سناتا بھی ہے اور کہتا بھی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کسی مقصد کے لیے کس طرح جان دی جاتی ہے۔

اسد محمد خاں کے تازہ ترین مجموعے "غصے کی نئی فصل" پر، جہاں سے اس انتخاب میں شامل بیش تر کہانیاں لی گئی ہیں، تبصرہ کرتے ہوئے نقاد محمد سلیم الرحمٰن لکھتے ہیں، "یہ ناممکن ہے کہ اسد محمد خاں کی ماہرانہ انداز میں تخلیق کی ہوئی فکشن سے لطف اندوز نہ ہوا جا سکے۔ ان کی تخلیقات، کسی کوشش کے بغیر ذہانت اور زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہیں اور ان میں صورتِ حال کو، اور کرداروں، تصویروں اور لفظوں کو بڑے موثر طریقے سے استعمال کیا جاتا ہے۔ مکالمے جان دار ہوتے ہیں۔ ان میں ڈرامے کا بڑا گہرا شعور پایا جاتا ہے۔ کہانیاں ایک ایک فریم کر کے آگے بڑھتی ہیں... بالکل فلموں جیسے واضح انداز میں۔"

"گھس بیٹھیا" میں مصنف نے بھوپال میں یونین کاربائیڈ کمپنی کے پلانٹ سے مہلک گیس خارج ہونے کے المیے کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ حادثہ ۳/دسمبر ۱۹۸۴ء کو پیش آیا تھا۔ اسد محمد خاں کے لیے یہ واقعہ دکھ کی ایسی جانکاری تھی جو دوسروں کے واسطے سے حاصل ہوئی تھی۔ بہت سے دوسرے رشتے داروں کے علاوہ، پانچ بہنیں اور دو بھائی اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ وہیں رہتے تھے۔ جس علاقے میں وہ رہتے تھے وہ تو بچ گیا مگر ان کا آبائی گھر، جو شہر کے وسط میں تھا نہیں بچ سکا۔ موت نے سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا۔ اس کا کوئی ریکارڈ نہیں کہ کس کی چتا جلائی گئی اور کس کس کو بڑی بڑی مشترکہ قبروں میں دفن کیا گیا۔

افسانے کا ٹمر یار خاں خاندان سے چھانٹے ہوئے اس طرح کے فرد کی نمائندگی کرتا ہے جس سے مصنف کو ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ جب وہ بھوپال میں تھے تو اسد محمد خاں نے اپنے ہی گھرانے کے کئی ایسے افراد کی کہانیاں سنی تھیں جنھوں نے وراثت میں ملی ہوئی دولت لٹانے کے بعد بقیہ زندگی عسرت میں گزاری تھی۔ اس طرح کے قرابت دار اکثر عموماً ایسے فسانے پھیلاتے رہتے تھے جن سے انھیں خاندانی جائیداد میں حصے کا دعوے دار بننے میں، یا کسی کے نہ بن سکنے میں مدد مل سکے۔ ٹمر یار خاں کا کردار اُن لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنی قرابت داری ثابت کرنے کی کوششوں میں ناکام رہنے کے بعد احساسِ محرومی کی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں۔ لکھیرا ہندوؤں کی وہ برادری تھی جس سے دولی چمن کا تعلق تھا۔ وہ لوگ مصنف کے قرابت داروں کے پڑوس میں ہی رہتے تھے اور گزر بسر کے لیے چوڑیاں بنایا کرتے تھے۔ لیکن دولی چمن سے اگر اچھوت جیسا سلوک کیا جاتا تھا تو اس کا سبب یہ نہیں کہ وہ لکھیرا تھا۔ بلکہ وجہ یہ تھی کہ اسے ایک ایسا مرض لاحق تھا جو کوڑھ سے ملتا جلتا تھا۔

اپنے اس تبصرے میں محمد سلیم الرحمٰن لکھتے ہیں، "کتاب کا وہ حصہ جس میں سب سے زیادہ تازگی ہے مصنف کا تاریخی بلکہ نیم تاریخی فکشن ہے۔ اردو میں کوئی بھی اس انداز سے نہیں لکھتا۔ یہ کہانیاں پٹھان بادشاہوں کے دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسد محمد خاں تاریخی واقعات کی صحت کے بارے میں زیادہ تردد نہیں کرتے، اگرچہ میں یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ تفصیلات عموماً واقعات سے مطابقت رکھتی ہیں اور مجموعی تاثر miniature نقاشی جیسی صوفشانی کا ہے..."

ایک سنجیدہ ڈی ٹیکٹو اسٹوری، قطعی طور پر سنسنی خیز مواد ہے۔ اس کی آسیب زدہ فضا اور اس کے دھمکی آمیز انداز سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے اسے پڑھنا ضروری ہے۔ یہ افسانہ اس تحقیق کا نتیجہ ہے جو اسد محمد خاں نے شیر شاہ سوری (۱۴۸۶ء تا ۱۵۴۵ء) کی زندگی اور عہد کے بارے میں ایک طویل دورانیے کے کھیل کے لیے کی تھی۔ یہ کھیل انھوں نے پاکستان ٹیلی وژن کے لیے لکھا تھا۔ اسی زمانے میں ایک مقبول رسالے والوں نے ان سے شیر شاہ کے بارے میں قسط وار کہانی لکھنے کے لیے بھی کہا۔ انھوں نے یہ فرمائش پوری کی اور کل ۳۵ قسطوں پر مبنی کہانی لکھی جس کے بارے میں یہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ اس کا انداز سوپ اوپیرا جیسا ہے۔ مذکورہ افسانے کے علاوہ اسی تحقیق پر مبنی سات آٹھ کہانیاں اور بھی لکھی گئی ہیں۔ وہ کبھی کسی ایک واقعے کو لے لیتے ہیں، یا کسی تاریخی کردار کو، یا محض ایک پیراگراف کی تحریر کو لے کر اس کے گرد ایک کہانی بُن دیتے ہیں۔

"ایک سنجیدہ ڈی ٹیکٹو اسٹوری" کے لیے انھوں نے سنبھل (یوپی) کے شیر شاہی دور کے کوتوال کا کردار استعمال کیا ہے۔ گرچہ قاری کی توجہ اس کردار پر مرکوز رہتی ہے لیکن درحقیقت، مصنف، اس سے کہیں آگے جا کر بڑی باریکی اور اُپج کے ساتھ اس تماشے کی عکاسی کرتا ہے جو آج کے دور کی دنیا میں طاقت ور ممالک کھیلتے رہتے ہیں۔ عالمی سیاست کا بھوت ہر جگہ لوگوں کی زندگیوں سے کھلواڑ کرتا ہے جب کہ طاقتور حکومتوں کے گماشتے ساری دنیا میں کہیں سازشوں کے بیج بوتے، کہیں فساد پھیلاتے گھومتے پھرتے ہیں۔

"غصے کی نئی فصل" بھی شیر شاہ کے دور سے تعلق رکھتا ہے مگر حافظ شکر اللہ خاں کا کردار مکمل طور پر فرضی ہے اور یہی بات "مر دوزی" فرقے کے لیے بھی کہی جا سکتی ہے لیکن بر مازید کو ایک حقیقی انسان تھا۔ اصل نکتہ یہاں یہ

ہے کہ غصہ انسان کی فطرت کا حصہ ہے۔ اس کی وجہ سے وہ صحت مند اور چاق و چوبند رہتا ہے۔

’’سرکس کی سادہ سی کہانی‘‘ میں موجودہ دور کی پاکستانی سیاست پر کھلے انداز میں فردِ جرم عائد کی گئی ہے۔ کردار تمثیلی ہیں۔ حکمران ایک بونا ہے جسے اقتدار کے دو مرکز، جن میں آپس میں رقابت ہے کنٹرول کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک ضمیر فروش سیاست داں ہیں اور دوسرا اقتدار کے بھوکے۔

اسد محمد خاں نے ’’شہر کوفے کا محض ایک آدمی‘‘ اپنے دوست اور کراچی کے ایک شاعر جمال احسانی کی شاعری کے مجموعے کی تقریبِ اجرا کے موقع پر پڑھنے کے لیے مضمون کے طور پر لکھا تھا لیکن اس نے ایک مختصر افسانے کی شکل اختیار کر لی جو بعد میں، ’’فنون‘‘ میں شائع ہوا۔ درحقیقت یہ ایک افسانے کے اندر افسانہ ہے۔ یہ کربلا میں امام حسینؓ کی دردناک صورتِ حال اور آج کے فلسطینیوں کی مظلومیت میں مماثلتیں تلاش کرتا ہے۔ دونوں مثالوں میں عام آدمی نیک نیت تو ہوتا ہے مگر افسوس کہ وہ ہمیشہ عمل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔

اسد محمد خاں طوائفوں کے کوٹھوں میں گزاری جانے والی زندگی سے اپنی دلچسپی سے انکاری ہیں۔ پھر بھی انھوں نے کوٹھوں کے بارے میں کئی کہانیاں لکھی ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ وہ تو محض کہانیوں کی تلاش میں رہتے ہیں؛ جو انھیں اکثر اس گفتگو میں مل جاتی ہیں جو وہ ٹیلی وژن کے لیے لکھے گئے اپنے گیتوں کے حوالے سے ’’میڈم‘‘ قسم کی خواتین سے کرتے ہیں۔ ان کی ایسی بہت سی کہانیاں ایک ایسے معصوم تماشائی جاوید کے زاویۂ نظر سے لکھی گئی ہیں جو نہ تو طوائفوں کے خلاف ہے اور نہ ہی کسی طور سے چکلے کی آمدنی سے مستفیض ہوتا ہے۔ وہ اِن کہانیوں کے فسانوی ماحول میں آزادی سے گھومتا پھرتا ہے اور بہت کم دخل اندازی کرتا ہے۔ جاوید ہمیں کئی کہانیوں میں ملتا ہے جیسے ’’سے لون‘‘ اور ’’ہرجیاں اور سور‘‘ وغیرہ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اسد محمد خاں جب طوائف کی زندگی کے حوالے سے لکھتے ہیں تو وہ، نہ تو مجرے کی محفلوں کا ذکر کرتے ہیں، اور نہ بیڈروم کے احوال کی منظر کشی۔ ’’نصیبوں والیاں‘‘ میں جو چیز واضح طور پر نظر آتی ہے وہ ان نوجوان عورتوں کی بے بسی ہے جو اپنے نام نہاد رکھوالوں کے ہاتھوں بے دردی سے استحصال کا شکار ہوتی ہیں۔

’’سے لُون‘‘ میں ایک مرشد کا کردار بھی ہے مگر یہ مرشد محنت کش طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ دراصل یہ کردار حقیقی زندگی کے ایک ’گرو‘ سے مطابقت رکھتا ہے جو کراچی پورٹ ٹرسٹ کے جاروب کشوں میں شامل تھا۔ حقیقی زندگی کا ’گرو‘ سب سے بہت انکسار سے ملتا تھا اور برادری کے دوسرے کارکنوں کی طرح پوری طرح ڈیوٹی بجاتا تھا۔ ساتھ ہی وہ اپنے عقیدت مندوں کو حقیقت پسندانہ مشورے دیتا تھا۔

’’ترلوچن‘‘ ایک تجریدی افسانہ ہے جس میں مرکزی کردار عین الحق کو اس وقت بڑی مایوسی ہوتی ہے جب وہ کائنات میں ہر اس چیز کو ’’ٹھیک‘‘ نہیں کر پاتا، جسے ٹھیک کیے جانے کی ضرورت ہے۔ وہ اپنی اس خصوصیت میں شاید مصنف کا شریک ہے۔ یہ دونوں خود کو ان اشیا کو ٹھیک کرنے پر مجبور پاتے ہیں جو بگڑ گئی ہوں، یا بالکل ہی ناکارہ ہو چکی ہوں۔

☆☆☆

بقیہ: بیوفا کی سخت راہیں

اچانک کیا دیکھتی ہوں کہ وہ آوارہ اور بدمعاش لڑکا میرے گھر میں گھس آیا ہے۔ وہ شراب کے نشے میں مخمور تھا۔ دہشت کے مارے مجھ پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ اس کے بعد وہ دندناتا ہوا اورچی خانے میں چلا آیا اور مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھا لیا۔‘‘

نوشاد کی سانسوں کی آواز اتنی تیز ہو گئی جیسے اس کے سینے کی جگہ لوہار کی دھونکنی نے لے لی ہو۔ جمیلہ کی بات جاری تھی۔ ’’میں نے چیخنے کی بھرپور کوشش کی لیکن میری آواز خود میرے کانوں کے لیے اجنبی بن گئی۔ میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے جتنے ہاتھ پاؤں مارے شکنجے اتنے ہی سخت ہوتے گئے۔ اس لڑکے کی نگاہیں مسلسل میرے چہرے پر گڑی رہیں اور وہ میری بے نور ہوتی ہوئی آنکھوں کا تماشہ دیکھتا رہا۔‘‘ جمیلہ کا گلہ رندھ گیا۔ ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ وہ اپنا اجڑا ہوا چہرہ نوشاد کے چوڑے چکلے سینے میں چھپانے کے لیے جھکی تو نوشاد نے پیچھے سرک جانا چاہا۔ لیکن اسے یوں لگا جیسے بجلی کے زوردار شاک نے اسے بے حس بنا دیا ہو۔

جمیلہ نے نوشاد کا ہاتھ مٹھی میں تھاما اور بولی ’’نوشاد! جو کچھ ہوا وہ وہ بس ایک حادثہ تھا۔ اس میں میرا کوئی دوش نہیں تھا، کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے تمہیں یہ سب اس لیے بتا دیا تا کہ تمہارا دل احساسِ گناہ سے پاک ہو جائے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ماضی کو بھول جائیں اور موجودہ لمحات کی لذتوں کو ضائع نہ ہونے دیں۔ نوشاد زندگی بہت تھوڑی ہے! یہ محبت کرنے کے لیے کم پڑتی ہے!!‘‘

نوشاد کچھ نہیں بولا مگر سمندر کی تہہ میں اضطراب کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے جمیلہ کو چور نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس کی آنکھوں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ تہی دست ہو گیا ہو۔ کمرے میں سنگین خاموشی کی فضا مسلط تھی۔۔۔ جیسے کوئی طوفان آنے والا ہو یا جیسے کوئی طوفان آ کر گزر گیا ہو۔۔۔!!

نئی زمین نئے آسماں تراشتا ہوں

مبین مرزا (کراچی)

باتوں، لفظوں اور ماجروں کو جوڑتوڑ کر کہانی بنانے والا، جذبے اور احساس کو دل □ ل کی آنچ دے کر شعر کاڑھنے اور گیت کا ریشم بُننے والا، رنگوں میں زندگی کی حرارت گوندھنے والا اور چاک پہ مٹی دھر کے اُسے بولنا سکھانے والا ایک آدمی... کوئی بھی آدمی، بلکہ یہ سب کے سب لوگ اپنے ہنر میں اور فن میں جُوا کھیلتے ہیں۔ زندگی کا جُوا۔ جی اُٹھنے یا پھر مر رہنے کی بازی۔ سو یوں اگر دیکھا جائے تو ہمارے زمانے کی کہانی کی دُنیا میں اس شخص نے جس کا نام اسد محمد خاں ہے بڑا تگڑا جُوا کھیلا ہے۔ اور انھیں جو جاننے والے ہیں، جاننا چاہیے اور ماننا چاہیے کہ جیت لی ہے بازی اس شخص نے۔

تو اب ایسا ہے کہ وہ جنھیں جاننے اور سمجھنے کا ذوق ہے تو انھیں اطمینان کے ساتھ دیکھنا اور سمجھنا چاہیے کہ آخر اسد محمد خاں کے فن کی جیت کیا ہے؟ اور کیسے ہے! کہ یہ شخص جو آج کے ادب کے صدر میں بیٹھا کہانیاں کہتا اور قصے سناتا ہے اوّل اوّل قصہ گو تو نہیں تھا۔ فسانہ و افسوں سے اِس آدمی کو بہت بعد میں ذوق ہوا، ورنہ پہلے تو یہ شعر کاڑھنے اور گیت بننے والا آدمی تھا۔

میں وہ دھیا چل کی آتا۔۔

جیسا مدھر گیت جس میں واقعی آتما گاتی گنگناتی سنائی دیتی ہے بھلا کسے یاد نہ ہوگا! تو اپنے بھائی اسد محمد خاں یہ اور ایسے ہی دوسرے گیتوں کی مدھرتا بکھراتے اور نغمیں اڑاتے، ادب کی وادی میں اُترے تھے اور سوچتے تھے کہ اپنے زمانے کے ادب میں بس کہیں حاشیے پہ ٹک رہیں گے۔ لیکن پھر یوں ہوا (اور ہونا بھی یوں ہی چاہیے تھا) کہ مٹی دادا اور باسودے کی مریم کے قصّوں نے انھیں تاک لیا۔ اور بس پھر کچھ لوگ تھے نئے اور کچھ نئے زمانے تھے، نئی زمینیں تھیں کہ ایک الگ لحن، ایک انوکھا لہجہ اور ایک منفرد آواز جنھیں گڑھتی، بناتی، تراشتی اور ہمارے سامنے رکھتی جاتی تھی۔

تو ایسا ہے اب کہ یہ قصہ جب چھڑ ہی گیا ہے تو کیوں نہ میں اِس کا سرا وہیں سے تھام لوں جہاں میں نے اسد محمد خاں اور ان کی کہانی کو پہلے پہل دریافت کیا تھا اور خواہش کی تھی اسے جاننے اور سمجھنے کی۔

کچھ یوں لگا کہ پوری ایک دنیا ہے۔۔ بھانت بھانت کے لوگوں سے بھری ہوئی۔ جیون جو جھتے، کشٹ اٹھاتے، وچن نبھاتے اور جیتے مرتے لوگوں سے بھری ہوئی دنیا۔ اچھے بھی ہیں ان میں، بہت اچھے، سچے اور اندر باہر سے سولہ آنے کھرے۔ اور یہی نہیں بلکہ ایک سے ایک بڑا احرام الدہر بھی پڑا ہے ان میں... بلکہ سچ پوچھو تو یہ رذیل کمینے ہی زیادہ دکھائی پڑتے ہیں یہاں بھی — ہماری اپنی دنیا کی طرح۔ دوسروں کا استحصال کرتے، انھیں دباتے، زندگی کو ان کے لیے ایک مسلسل عذاب بناتے اور برائی کا کاروبار کرتے لوگ، اُچکے، اُٹھائی گیرے، کرائے کے بدمعاش اور دلال... ہر طرح کا موذی ہے ان میں۔ ہاں، وہ کوٹھوں کا اُجالا نصیبوں والیاں بھی ہیں یہاں پہ۔ لیکن بکھیڑا یہ ہے کہ ان بُرے اور برائی کرتے لوگوں میں بھی نیک دل مرد اور بھلی طبیعت کی عورتیں نکل آتی ہیں، بالکل اسی طرح جیسے خود اپنی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی بہت بُری جگہ یا کسی بہت بُرے کام میں کوئی ایسی روح سامنے آجاتی ہے جو اپنے کام کی ساری معصیت کے باوجود ہمیں معصوم نظر آتی ہے۔ سو ان افسانوں میں بھی بہت سے ہیں جو بےقصور ہیں مگر زندگی کو سزا کی طرح بھوگتے ہیں۔ ان لوگوں کی بپتا سنتے اور انھیں جیون بھوگتے دیکھ کر بالکل یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی آئینہ ہے جو ہماری زندگی کا عکس دکھاتا ہے کوئی فلم ہے ایک مسلسل اور طویل فلم یا پھر ایک فلم کے ٹکڑے ہیں جن میں خود ہم ہیں اور عین ہمارے اردگرد کا ماحول۔ کیسے جیتے جاگتے اور کتنے حقیقی ہیں یہ کردار۔ جی ہاں، اسد محمد خاں کے جہانِ فسانہ و افسوں کے کرداروں سے میرا پہلا تعارف کچھ اسی قسم کا تھا۔

اب، جب کہ میں ان کرداروں کے ساتھ طویل، بہت طویل عرصہ گزار چکا ہوں اور اس منزل میں ہوں کہ جہاں مجھے ان کرداروں کے کردار کی بابت اپنا بیانِ حلفی ریکارڈ کرانا ہے تو ضروری ہے کہ میں اعتراف کروں کہ آگے چل کر مجھے اپنی اُس رائے میں تبدیلی کرنا پڑی جو میں نے اوّلین تعارف کی بنا پر ان کرداروں کے بارے میں قائم کی تھی۔

انسانی تہذیب اور سماجی رشتوں کی بنتی بگڑتی اور بدلتی صورتِ حال کی جیسی جامع، تہہ دار اور بلیغ دستاویز افسانوں اور ناولوں میں مرتب ہوتی ہے ویسی تہذیب و ثقافت کے کسی دوسرے فن میں ہمیں نہیں ملتی۔ اس کا ایک اہم سبب تو ظاہر ہے اس فنِ لطیف سے وابستہ لوازم ہیں جو فن کار کو اپنے موضوع کی خارجی اور داخلی صورت گری کی یکساں قدرت کا حامل بناتے ہیں۔ دوسری طرف ایک بات اور بھی قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ کہ کہانی کہنے اور سننے کے دونوں ہی اعمال سے فطرتِ انسانی کو شروع سے ایک خاص مناسبت ہے۔ کہانی کہنے اور اس سے محظوظ ہونے کے اسالیب، فنی لوازم اور اظہار و ابلاغ کے پیرائے، زمانوں اور معاشروں کی مزاجی کیفیات اور تقاضوں کے تحت تبدیل تو ضرور ہوتے رہے ہیں، لیکن کہانی کا وہ بنیادی جوہر جو ایک انسان کو دوسرے بہت سے انسانوں بلکہ پورے پورے معاشروں اور زمانوں کی زندگی کو جاننے ہی کا نہیں، بسر کرنے کا لطف بھی دے جاتا ہے— آج بھی کہانی کے haunting elements میں سے ہے۔ وقت کی کم یابی اور وسائل و مشاغلِ حیات کی فزونی کے اس دور میں بھی یہی وہ جوہر ہے جو کہانی کا اثبات کرتا اور کہانی کے فن کا جواز بنتا ہے۔

یہیں اگر ایک اور امر کا اعتراف بھی کر لیا جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ یہ کہ ہمارا زمانہ، جس کی بابت عام تاثر یہ ہے کہ اس نے انسان کی معنوی دلچسپیوں اور باطنی اظہار کی سرگرمیوں کے آگے بڑے بڑے سوالیہ نشان لگا دیے

ہیں اور ہمیں خارجی زندگی کے ہنگاموں میں محو کر دیا ہے... ان سب باتوں کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ہمارا زمانہ اچھی کہانیوں کے لیے توجہ اور قبولیت سے آج بھی عاری نہیں بلکہ بڑی کہانیوں کے امکانات سے اب بھی اسی طرح بھرا پڑا ہے جیسے اس سے قبل کے زرخیز زمانے رہے ہیں۔ ہاں، بس اب یہ ہے کہ وہی کہانی کار فوکس ہو سکیں گے جو کہانی کہنے لکھنے سے پہلے خود اپنے اندر اور اپنے فن کے اندر کہانی کو بسر کرتے ہیں۔ ایسے ہی کہانی کاروں کی ایک مثال ہمارے زمانے میں اسد محمد خاں ہیں۔

ایک بار میں نے اسد محمد خاں سے دریافت کیا، کیا پہلی بار میں ہی کہانی ایسی کھنچی ہوئی صورت میں اُتر آتی ہے؟ انھوں نے نہایت سادگی اور متانت سے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا، ''نہیں، ہرگز نہیں۔ بھائی جان! بڑی جان لگانی پڑتی ہے۔ کبھی تو سولہ سترہ بار ڈرافٹ کرتا ہوں، تب کہیں جا کر کہانی کی صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔'' ٹھیک کہتے ہیں اسد محمد خاں، بالکل ٹھیک۔ جو کہانی وہ لکھتے ہیں، وہ اس سے کم ریاضت کے بغیر ممکن بھی نہیں۔

اب یہاں میں نے لفظ ریاضت استعمال کیا ہے تو ضروری ہے کہ بتاتا چلوں، ریاضت کی نوعیت بھی مختلف فن کاروں میں مختلف ہوا کرتی ہے — کچھ کے یہاں ریاضت محض مشقِ سخن کے درجے میں رہتی ہے اور کچھ لوگ اس کے ذریعے ذرا اور آگے بڑھتے ہیں، اپنی آواز پانے کی سعی کرتے ہیں لیکن وہ جو بڑا فن کار ہوتا ہے وہ ریاضت کے ذریعے اپنی زندگی کو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر پہلے تو rediscover کرتا ہے اور پھر relive بھی کرتا ہے... زندگی کے پورے کیف و کم اور احساس کی تہ در تہ شدتوں کے ساتھ۔ یاد رہے فن کو جیتی جاگتی زندگی کا لمس دینے اور اس کی معنویت کو سماجی سیاق و سباق میں متعین کرنے کا عمل ہے۔ اب یہاں مثال کے طور پر آپ اسد محمد خاں کے پہلے افسانوی مجموعے ''کھڑکی بھر آسمان'' ہی کو سامنے رکھ لیجیے۔ افسانے پڑھتے جایئے ایک ایک کر کے آپ دیکھیں گے کہ افسانہ نگار نے پے در پے ایسے کرداروں کو لکھا ہے جو ہند اسلامی کلچر کے پیدا کردہ ہیں۔ اسد محمد خاں نے بڑی احتیاط سے کام لیا ہے کہ اپنے کرداروں پر علاقائی عصبیت کی چھاپ نہیں پڑنے دی اور نہ ہی انھیں کسی مذہبی رول ماڈل کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ انھوں نے تو ان کرداروں اور ان کے ماجروں کو اُس تناظر میں دیکھا اور دکھایا ہے، جس پر برصغیر کی ثقافتی روح کی چھوٹ پڑتی ہے۔ خیر و شر کے باہم آمیز عناصر کے ساتھ اور مخلوط معاشرے کی complex situations میں پورے قد کے ساتھ ابھرتے ہیں اسد محمد خاں کے تراشے ہوئے یہ کردار۔ ان کرداروں کے ماجروں کی حقیقی قدر و قیمت کو سمجھنے کے لیے ہمیں اپنا تہذیبی اسٹرکچر، اس کی تمام تر رنگا رنگی اور تنوع کے ساتھ سامنے رکھنا پڑے گا... ورنہ یہ سب کردار گھٹ کر محض زندگی کی کھلواڑ کا ایسا نمونہ ہو کر رہ جائیں گے جس کا مقصد وقت گزاری کے لیے تفریحِ طبع کا سامان فراہم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ تو بس اب ضروری ہے کہ ہم یہاں رُک کر پہلے اس اصول کو سمجھ لیں جس کے تحت برصغیر کی تہذیبی و ثقافتی روح نے ظہور کیا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی تہذیبی و ثقافتی روح نے اپنے اظہار کے لیے زمین اور وقت کے جتنے بھی دائرے قائم کیے، ان سب میں اصول کثرت ہمیں مشترک ملتا ہے۔ تہذیبوں کا مطالعہ کوئی ایسا کام تو خیر نہیں ہے کہ جس کے لیے جمع تفریق یا ضرب تقسیم کی قسم کا کوئی ضابطہ مقرر کر لیا جائے اور پھر اسی کے تحت تہذیبوں کے مظاہر اور ان کی نمو کا جائزہ لیا جائے۔ اس لیے کہ تہذیبوں کے باطن میں جو تخلیقی جوہر کارفرما ہوتا ہے وہ اپنے اصول خود اپنی ہی نہاد سے اخذ کرتا ہے تاہم انسانی صورتِ حال اور اس کے سماج کو سمجھنے کے لیے ہمیں کوئی نہ کوئی قاعدہ تو اختیار کرنا ہی پڑتا ہے۔

خیر، بات ہو رہی تھی کہ اسد محمد خاں تاریخی اعتبار سے بیسویں صدی کے آخری ربع میں ہمارے افسانوی منظرنامے کا ایک ایسا نام ہے جس کے فن کارانہ طرزِ احساس اور تخلیقی شعور کو ثقافتی تناظر سے منہا کر کے سمجھنا ممکن نہیں۔ اس لیے کہ اسد محمد خاں کے افسانے اپنی اوپری سطح پر اظہار و ابلاغ کا کتنا ہی ڈرامائی، سہل اور رواں دواں اسلوب کیوں نہ اختیار کریں، واقعہ یہ ہے کہ یہ افسانے تہ در تہ معنویت کا ایک گمبھیر اور پیچیدہ سلسلہ رکھتے ہیں۔ ایک فن کار صرف اپنے موضوعات اور مسائل کی وجہ سے بڑا نہیں بنتا ہے بلکہ اس کی بڑائی میں اس کے اسلوب اور طرزِ احساس کا بھی انتہائی حصہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا اسلوب اور طرزِ احساس نہ صرف معنویت کی متنوع سطحوں کا حامل ہوتا ہے بلکہ ابلاغ و تفہیم کے بھی مختلف دائروں میں بیک وقت کام کرتا ہے۔ یا یوں باقی کے فن کی طرح اُس کا فن بھی اپنی دیدہ زیبی اور فن کاری کے لیے عامتہ الناس اور اہلِ ذوق و نظر سے الگ الگ قسم کی داد وصول کرتا ہے۔ اسد محمد خاں کے افسانے دل چسپ، سادہ اور grasping ہونے کی وجہ سے اپنا وسیع تر عوامی حلقہ ضرور رکھتے ہیں لیکن بایں ہمہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دل چسپی اور سادگی محض برائے فن نہیں ہے بلکہ زندگی کے نہایت گمبھیر تجربے اور عمیق احساس کو خود زندگی کے لب و لہجے میں بیان کی شدید فن کارانہ کاوش نے انھیں سہل بنا دیا ہے۔ گویا یہ سادگی سادگی نہیں بلکہ پختہ کاری کی انتہا ہے۔ اظہار کے اس سہلِ ممتنع کے پیچھے فنی الجھنوں اور فکری دقتوں کا ایک طویل عمل ہے جس سے فن کار پوری تابت قدمی کے ساتھ گزرا ہے۔ صبح منہ اندھیرے، نور کے تڑکے سانس پکا کرنے کا ریاض۔ جی ہاں، فن کار کسی شعبے کا ہو، فن کی اگلی منزلوں کی طرف بڑھنے کے لیے سانس تو اُسے پکا کرنا ہی پڑتا ہے۔ تو بات یہ ہے کہ اسد محمد خاں نے یہ ریاض بہت کیا ہے۔ اسی ریاض کی دین ہے کہ ان کے افسانوں میں فکر و فن کی ساری گمبھیرتا ایک زیریں سطح پر سفر کرتی ہے اور between the lines معنویت کی ایک تہ جماتی چلی جاتی ہے۔ خیر، اس پر مزید گفتگو ہم آگے چل کر کریں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اہم فن کاروں کی تفہیم اور تعینِ قدر میں جو ایک مسئلہ بالعموم

ہمارے یہاں پیش آتا ہے، وہی اسد محمد خاں کے افسانوں کے حوالے سے بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ مسئلہ ہے فن کار کے کسی ایک پہلو کی ایسی تعمیم کر اس کا سارا فنی کارنامہ محض اس ایک پہلو سے موسوم نظر آئے۔ اسد محمد خاں کی بابت ایک عام رائے یہ پائی جاتی ہے کہ انھوں نے خطِ افلاس سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کا احوال قلم بند کیا ہے۔ یہ رائے اسد محمد خاں کے جہانِ افسانہ کی بابت غلط تو بے شک نہیں ہے لیکن یہ بھی واقعہ یہ ہے کہ یہ ان کے پورے فن کو اس کی کلیت میں بیان نہیں کرتی بلکہ اس کے محض ایک جزو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس قسم کی آرا کسی بھی تخلیق کار کی من حیث المجموع قدر و قیمت کے تعین میں نہایت مہلک قسم کی کم راہی کا سبب بنتی ہیں۔ لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ ہماری تنقید نے اپنے تناظرات میں بالعموم اور فکشن کے باب میں بالخصوص پہلے بھی ایسے کئی ایک لطیفے بنائے ہوئے ہیں، مثلاً منٹو کو طوائفوں (یا جنس) کا، قرۃ العین حیدر کو طبقۂ اشراف کا اور انتظار حسین کو ناسٹلجیا (یا اساطیر) کا کہانی کار قرار دینے والے بیانات ہماری تنقید کی کام چوری سے پیدا ہونے والے لطیفے نہیں ہیں تو اور کیا ہیں۔ پروفیسر قسم کے دانش وروں اور فکشن کے سکہ بند نقادوں کو شاید میری یہ بات زیادہ ناگوار گزرے گی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اردو فکشن کے فروغ اور تفہیم میں ہماری تنقید نے خاطر خواہ کردار ادا نہیں کیا ہے۔ خیر، اس وقت نہ تو نقادوں کی گوشمالی مقصود ہے اور نہ ہی اپنی تنقید کی نارسائی کے مصائب کا بیان۔ تو آیئے واپس اسد محمد خاں کی طرف۔ ان کے بارے میں جو عام تاثر ہے کہ وہ پسے ہوئے اور زندگی گزیدہ کرداروں کے کہانی کار ہیں، یہ رائے ان کے فن کا پورا احاطہ نہیں کرتی اس لیے ہمیں اس سے الگ ہو کر اپنا کام کرنا پڑے گا۔ یہ ہیں وہ دو بنیادی باتیں جنھیں ہمیں آغاز ہی میں جان لینا چاہیے۔

انسانی احساس کی وسعت اور اس کے تجربے کی گہرائی کا حق تو خیر کس سے بیان ہوئی ہے اور کیوں کر بیان ہو سکتی ہے لیکن اس اعتراف کے باوصف اگر ہم آج اکیسویں صدی کے اولین عشرے میں اپنے افسانوی ادب کا جائزہ لیں اور یہ دیکھنا چاہیں کہ ہمارے کن کن فن کاروں نے انسانی احساس اور اس کے تجربے کا زیادہ سے زیادہ ریکارڈ مرتب کیا ہے تو درجۂ اول کے ناموں میں ایک نام اسد محمد خاں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اسد محمد خاں نے اپنے افسانوں میں انسانی احساس کے عجیب منطقوں کو دریافت کیا ہے اور ان منطقوں کی سیاحت کے دوران گہرے تجربوں کے زندہ رنگوں کو سمیٹا ہے۔

اسد محمد خاں نے افسانوں کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ ان کو جوڑ کر دیکھنے سے ہند اسلامی کلچر یا گنگا جمنی تہذیب کی سماجی صورتِ حال اور انسانی رویوں کا خاصا معقول کوائف نامہ مرتب ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا تو درست نہیں ہوگا کہ اسد محمد خاں کے افسانوں میں پہلی بار ہند اسلامی کلچر کے نمائندہ کردار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایسا تو یقیناً نہیں ہے۔ یوں بھی اسد محمد خاں نے جس زمانی دائرے میں اپنے افسانوی سفر کا آغاز کیا، اس سے پہلے اولیت کے سارے ہی سہرے بندھ چکے تھے اور پھر یہ بھی بڑا ماننے کی کوئی بات نہیں کہ اولیت کا اعزاز تو اپنی جگہ، لیکن ہمارے یہاں ایک زمانے میں جس طرح اس قسم کا سہرا باندھنے کا فیشن رہا ہے کیا کسی تخلیقی فن کار کی حتمی سبقت میں وہ کوئی فیصلہ کن کردار ادا کر سکتا ہے؟ میرا ذاتی جواب نفی میں ہے۔ اس لیے کہ تخلیقی فنون میں درجہ بندی کے لیے قطار کا نہیں صف کا اصول درست ہوتا ہے۔ قطار بندی اسکول کے لڑکوں کے ڈسپلن کے لیے تو ٹھیک ہے لیکن فن کاروں پر اس کے اطلاق میں جس hard and fast قسم کے رویے کی ضرورت پیش آتی ہے مجھے اس پر لدھے کی لاٹھی کی پھبتی سوجھتی ہے۔ پھر یہ کہ خود اسد محمد خاں ایسے تخلیقی فن کار کی ذاتی دلچسپی بھی اپنے کام کے تخمین و ظن میں تو بے شک ہوگی لیکن اولیت کے قضیے میں نہیں۔ یہ تو محققوں کا مسئلہ ہے سو اسے انھی کے سپرد کر دینا چاہیے۔

قباحت یہ ہے کہ گنگا جمنی کردار ہم نے اوروں کے یہاں بھی دیکھے اور ان کی کتھا پڑھی ہے لیکن اسد محمد خاں کے یہاں ایسے کردار اپنے پورے وجودی تجربے اور باطنی احساس کے ساتھ اس طرح آتے ہیں کہ ان کے اطوار سے ہمارے سامنے مناسبات کا پورا ایک سلسلہ روشن ہوتا چلا جاتا ہے اور یوں پوری سماجی زندگی کا منظرنامہ ظہور کرتا ہے۔ کائنات عالمِ اکبر ہے اور انسان عالمِ اصغر۔ وہ سب کچھ جو کائنات کے دائرے میں افشا ہوتا ہے عالمِ اصغر میں بہ صورتِ تصغیر پایا جاتا ہے۔ چناں چہ خارجی کائنات اور انسان کے داخل کے مابین تناسب کا ایک رشتہ ہے۔ بڑا کہانی کار اپنے تئیں اس تناسب کو جاننے اور بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ بیج میں پورا شمر یا شجر خوابیدہ ہوتا ہے تو اس تمثیل کا اطلاق کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ بعینہٖ ایک فرد (یا ایک کردار) میں پورا ایک سماج اور اس کی زندگی کا پورا ایک دائرہ مضمر ہوتا ہے۔ فرد اپنی ذات میں اپنے سماج کے امکانِ نمو کو ظاہر کرتا ہے اور کہانی کار اسی امکان کو رُو بہ عمل لاتا ہے۔ اسد محمد خاں کی کہانیاں ''باسودے کی مریم'' اور ''مئی دادا'' فرد کے اسی امکان کو رُو بہ عمل لانے اور explore کرنے سے معرضِ اظہار میں آئی ہیں۔ اپنے اجمال میں ان کہانیوں نے کتنے ہی بڑے کرداروں اور ان کرداروں کے سماجی منظرنامے کی تفاصیل کو سمیٹ لیا ہے۔ کہانی تلوار کی دھار پر سفر کرتی ہے۔ ایک طرف مذہبی اختلاف کا جہنم ہے تو دوسری طرف انسانیت کی پاس داری کا الاؤ۔ ایسے میں فن کی معراج یہ ہے کہ فن کار کو سلامت روی یاد رہ جاتا رہے۔

فکشن کے عام مطالعات اور جائزوں میں زندگی کی عکاسی اور سماج سدھار بھاشن کا بہت کریڈٹ افسانہ نگار کو دیا جاتا ہے۔ تنقید نے بھی کیا کیا ڈھکوسلے بنائے ہیں۔ مغربی ادب میں یہ شوشہ دیے سال کی دین ہے۔ ہمارے یہاں اس کی ابتدائی شکلیں تو سرسید احمد خاں کی اصلاحی تحریک کے زیرِ اثر سامنے آئی تھیں لیکن بعد ازاں سماجی حقیقت نگاری اور افادی ادب کے تصورات نے اس بدعت کو رائج کرنے میں بڑی مدد دی۔ ترقی پسندوں کی بدعتیں بھی ترقی یافتہ تھیں۔ تخلیقی فن کار کی فکری و فنی خود مختاری کا جو استحصال اس تحریک کے اثرات

کے تحت ہوا، ویسا اس سے پہلے کبھی نہ ہو سکا تھا۔ بہر حال اس حساب کو پھر کسی موقعے کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ بات ہو رہی تھی 'باسودے کی مریم' اور 'ننی دادا' کی۔ تو ٹھیک ہے کہ ان افسانوں میں ہمیں انفرادی کردار بھی ملتے ہیں اور ان کا وہ تفاعل بھی افسانے میں نظر آتا ہے جسے زندگی کی عکاسی سے عبارت کیا جا سکتا ہے لیکن 'یوم کپور'، 'گھر'، 'ترلوچن' اور 'برا دوبرا ہوا' ایسے افسانوں کی بابت کیا کہا جائے گا۔ یہ افسانے تو اسد محمد خاں نے محض بیانیے کی تکنیک میں لکھے ہیں۔ ان میں عمل اور رد عمل کی وہ صورت حال ہے ہی نہیں، جسے بیان کرنے پر افسانہ نگار کو عرف عام میں زندگی کی عکاسی اور سماج کی درستی کا کریڈٹ دیا جاتا ہے۔ صیغۂ واحد متکلم یا کہانی کار کے سیدھے سادے بیانیے میں کہیں بھی زندگی کی کشاکش افسانے میں ظاہر نہیں ہوتی۔ تو کیا ان افسانوں کو پڑھ کر ہم افسانہ نگار سے وہ کریڈٹ واپس لے لیں جو ہم پہلے اسے دے آئے ہیں؟ یہ ہے وہ نظریاتی جبریت جس سے ادب و نقد کی شرمساری کا مرحلہ آغاز ہوتا ہے۔

دیکھیے، بات یہ ہے کہ لکھنے والے سے قاری کے جو بھی مطالبات ہوں وہ سر آنکھوں پر، لیکن افسانہ نگار کے فنی کمال کا تعین اس سے نہیں ہوتا کہ اس نے سماج کی کتنی زندہ تصویریں پیش کی ہیں یا یہ کہ معاشرے کے کتنے عیب گنوائے ہیں اور کس کس ثواب کو بیان کیا ہے؟ اس کا اصل کام یہ نہیں ہے بلکہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس نے اپنے سماج، اپنی تہذیب، اپنی زندگی کے جو رخ پیش کیے ہیں اور جو تصویریں دکھائی ہیں، ان سے معانی کیا پیدا ہوتے ہیں؟ اور پھر یہ کہ جو معانی پیدا ہوتے ہیں وہ کسی خاص مذہبی، فکری یا نظری دائرے میں انسانی احساس سے relate کرتے ہیں یا ان سے بلند ہو کر ہمیں بلا تفریق مذہب و نسل محض انسانی رویے اور طرز احساس کو سمجھنے کی راہ سجھاتے ہیں۔

کسی بھی جینوئن افسانہ نگار کا یہ مسئلہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ سماج کی تصویروں کا کوئی البم مرتب کرے۔ اسے براہ راست نتائج یا منضبط خیالات سے کچھ بہت زیادہ دلچسپی بھی نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کے فن کا کمال یہ ہے کہ وہ سماجی احوال کی کوئی سالانہ ریکارڈ بک ترتیب دے۔ اس کی توجہ تو ان روزمرہ تبدیلیوں پر مرتکز ہوتی ہے جو سماج کے اجتماعی شعور میں غیر محسوس انداز اور نہایت خاموشی سے رونما ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں پہلے پہل پیدا تو فرد کی زندگی میں ہوتی ہیں لیکن دھیرے دھیرے یہ پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ یہ تہذیبوں اور معاشروں کی کایا کلپ کا عمل ہے۔ بڑا تخلیقی فن کار اسی عمل کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہی کوشش اس کے فن کا جواز قرار پاتی اور اس کی تخلیقی شخصیت کی شناخت بنتی ہے۔ وہ صحافی نہیں کہ ہم تک معاشرے کی روزمرہ خبریں پہنچاتا رہے، وہ مؤرخ یا وقائع نگار بھی نہیں ہے کہ اپنے عہد کی تاریخ یا واقعات کو قلم بند کرتا رہے، وہ مصلح بھی نہیں ہوتا کہ اصلاح معاشرہ کے لیے قصے گھڑتا اور سماج سدھار اداروں کے لیے کام کرتا رہے۔ ہاں، یہ درست ہے کہ اس کے اندر یہ سب افراد اپنے احساسات اور مدرکات کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتے ہیں لیکن کہانی کار ان تینوں میں سے کسی کے لیے کام نہیں کرتا، کام وہ اپنا ہی کرتا ہے۔ وہ ان تینوں کے مجموعے سے سوا ہوتا ہے۔ چناں چہ وہ صرف زندگی کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نظریں اس کے ماسوا تک دیکھنے کی جستجو میں رہتی ہیں۔ یہ ورائے حیات کا نظارہ ہے فرد کو اور سماج کو ان کے تہذیبی و ثقافتی منظرنامے میں دیکھنا۔

اچھا تو اب آپ 'یوم کپور' کے narrator کو دیکھیے، کیا اس کا گھر یہ ایک فرد کا گھر ہے؟ یا یہ صدیوں کا سفر کرتی تہذیب کے برگشتہ عنصر کا گھر یہ ہے جو اس تہذیب کی متوازی پگڈنڈی پر سفر کر رہا ہے۔ پھر 'باسودے کی مریم' کی طرف آئیے۔ کیا مریم ہند اسلامی کلچر کی اس قوت کا استعارہ نہیں جو اپنے مرکز سے دور ہے اس کے تاریخی و جغرافیائی فکر و فہم سے عاری ہے لیکن اس کے باوجود یہ قوت کھنچتی ہے اپنے مرکز ہی کی طرف۔ یہ وہ میٹریل ہے جسے زمانے کے سہاگے نے unpurify نہیں کیا ہے۔ اور وہ اس کا بیٹا ممدو... مریم کی معصوم روح کے کٹھن سے پھوٹا ہوا انحراف کا بیج جو عذاب کی طرح مریم کی جان سے ایسے لگا ہوا ہے کہ مرتا ہے اور نہ مانجھا دیتا ہے۔ ان دونوں کرداروں کے ساتھ اسد محمد خاں نے ہند اسلامی کلچر کے جن زاویوں کو دیکھا ہے ان کا بے حد بلیغ بیان اس افسانے کی اختتامیہ سطریں ہیں:

اماں حج کر کے لوٹیں تو بہت خوش تھیں۔ کہنے
لگیں، ''مجھلے میاں! اللہ نے اپنے حبیب
کے صدقے میں حج کرا دیا۔ مدینہ طیبہ کی
زیارت کرا دی اور تمھاری انا بوا کی دوسری
وصیت بھی پوری کرائی۔ عذاب ثواب
جائے بڑی بی کے سر، میاں! ہم نے تو ہرے
بھرے گنبد کی طرف منھ کر کے کہہ دیا کہ
یا رسول اللہ! باسودے والی مریم فوت ہو
گئیں، مرتے وقت کہہ رہی تھیں کہ نبی جی
سرکار! میں آتی ضرور مگر میرا ممدو بڑا حرامی
نکلا۔ میرے سب پیسے خرچ کرا دیے۔

یہاں بھی یہ فقرے اپنے پورے معانی دیں گے لیکن افسانے کے تسلسل میں جب ہم ان اختتامی سطروں تک آتے ہیں تو افسانے کا ابلاغ ہمیں اس بلند سطح پر لے جاتا ہے جہاں ہم پر ادب کی ماہیت کھلتی ہے۔ انسان کے خارج کو رنگنا تو کوئی ایسا کام نہیں ہے یہ کام تو سیاسی جماعتوں کے نعرے اور تیل و ازن کے نغمے بھی کر لیتے ہیں لیکن افسوس کہ کرنے والوں نے ادب سے کیا بھی تو ایسا سرسری اور چھوٹا مطالبہ کیا۔ ادب تو انسان کے باطن کو رنگتا ہے اور اس طرح رنگتا ہے کہ جیون کا رنگ ہی بدل جاتا ہے۔ ایسے افسانے تو انسان کے دروں کو تغیر آشنا کرتے ہیں۔ اس کے اندر ایک نئے آدمی کو جنم دیتے ہیں۔ اس کی قلب ماہیت میں معاون

ہوتے ہیں۔ ہاں، اندر کا تغیر اُن امکانات کے بروئے کار آنے کا حوالہ ہے جو انسان کے نمو اور نئی صورت گری سے حیات و کائنات کی معنویت کا کوئی نیا پہلو سامنے لاتے ہیں۔ یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید کی تفسیر ایسے ہی کرداروں سے تو ہوتی ہے اور وہ جو سمرسٹ مام نے کہا تھا کہ یہ کائنات ایک بار وجود میں آ کر مکمل نہیں ہوتی بلکہ ہر نیا فن کار اسے نئے سرے سے تخلیق کرتا ہے اس کے یہی معنی تو ہیں کہ ہر بڑا فن کار کچھ ایسے کردار تخلیق کرتا ہے جو اس کائنات کی نئی تفہیم اور از سر نو صورت پذیری میں کام آتے ہیں۔

اب ذرا ایک نظر ''منّی دادا'' کے مرکزی کردار پر بھی ڈالتے چلیے۔ منّی دادا کیا تھے؟ ہندو، سکھ، عیسائی، یہودی یا مسلمان، کیا تھے؟ افسانے کی فضا پہلے انھیں مسلمان دکھاتی ہے پھر غیر مسلم کر ڈالتی ہے... اور آخر میں اس کے باوجود کہ وہ غیر مسلم ثابت ہو چکے ہیں اور خود انھوں نے اس کا اعتراف بھی کر لیا ہے:

''پٹھان کی گھوڑی مرتے مرتے کا لک لگوا دی
تو نے... لڑکے کیا سوچیں گے؟'' پھر ان کے
رونے کی آواز آئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔
''ٹھیک ہی کہ ہے، تیلی کا لمڈا پٹھانوں کے
پالے سے پٹھان تو نہیں بن جاتا۔''

لیکن افسانے کا اختتامیہ، خاندان کے سب سے معتبر فرد سے بیان دلواتا ہے اور انھیں ایک بار پھر مسلمان بنا دیتا ہے:

''...وہ کوئی بھی تھے، تمھیں بس ایک بات یاد
رکھنی چاہیے کہ وہ تم سے محبت کرتے تھے اور
چاہتے تھے کہ تم اپنے دادوں پر دادوں کی
طرح عزت کے ساتھ جینا سیکھ جاؤ... سمجھے!
جاؤ اب کھیلو۔'' پھر وہ جاتے جاتے غصے
سے پلٹے، ''اور سنو، کون خبیث کہتا ہے وہ
مسلمان نہیں تھے، کون کہتا ہے پٹھان
نہیں تھے؟''

کیسے کیا بات دھیان میں آئی؟ منّی دادا جا ہے اور جو کچھ بھی تھے لیکن اصلاً وہ ہند اسلامی کلچر کا ایک ایسا جیتا جاگتا کردار تھے جو خاص اسی تمدن کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا، جو اِس تہذیب کے اُس جوہر کی نمائندگی کرتا ہے جس میں جذب ہونے اور جذب کرنے کی بے پایاں صلاحیت ہے جو انسان کی سب سے بڑی جذباتی عصبیت یعنی مذہب تک کو پیچھے چھوڑ کر انسان کو اس کے خالص انسانی حوالے کی بنیاد پر اوپر اٹھا لیتا ہے اپنا بنا لیتا ہے۔ تو اسی جوہر کی بنیاد پر میں نے اسد محمد خاں کے افسانوں کو اور ان افسانوں کے کرداروں کو ہند اسلامی کلچر کا نمائندہ کہا ہے۔ یہ کردار صدیوں میں مرتب ہونے والے تمدن نے پیدا کیے ہیں۔ ایک ایسے تمدن نے جس کی معاشرتی hierarchy میں انسانیت پہلے مرتبے میں آتی ہے زندگی کے باقی سب حوالے بعد کے مراتب میں آتے ہیں۔ یہ کردار اسی تمدن کی تمثیل ہیں۔ جی ہاں، عالم اصغر کا اثباتی مظہر۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان گنگا جمنی کرداروں کی ماہیت کیا ہے؟ کیا وہ ہماری کسی ذہنی جذباتی یا فکری ضرورت کو پورا کرتے ہیں؟

بات یہ ہے کہ ہمارا عہد تہذیبوں کے انہدام کا عہد ہے۔ سائنس کی ترقی اور ہماری زندگی میں اس کا بڑھتا ہوا دخل، گلوبل ولیج کی راہ ہموار ضرور کر رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں ایک ایسی معاشرت کی طرف لیے جا رہا ہے جس میں معاشروں کی تہذیبی شناخت ختم ہو جائے گی۔ اپنے اپنے معاشی مسئلوں کے حل اور وجودی مسرتوں کے حصول میں سرگرداں افراد کا ایک انبوہِ کثیر اس گلوبل ولیج کی منزل مقصود ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ یہ انبوہِ کثیر اپنی روح کے مطالبات سے ناواقف ہے یا ان سے آنکھیں چراتا ہے کہ ان کی آواز پر لبیک کہنا اس کی وجودی مسرتوں کو ملیا میٹ کر سکتا ہے۔ منہدم تہذیب اور منقسم شخصیات... یہ ہے ہمارا آئندہ۔ یہاں ہمیں ٹامس ہارڈی کے حوالے سے لکھا ہوا فریڈرک لوکاز کا وہ فقرہ یاد آتا ہے:

...دو تہذیبیں ٹکراتی ہیں تو یہ نہیں ہوتا کہ برتر
تہذیب غلبہ پا لے بلکہ ہوتا یوں ہے کہ کم
زور تہذیب اس کے بعد دلوں میں پناہ
ڈھونڈ لیتی ہے۔

تو بس ہر عہد کا بڑا افکشن اپنے ثقافتی کرداروں کے لیے جو پہلا کام کرتا ہے وہ یہی ہے کہ انھیں دلوں میں پناہ ڈھونڈ دیتا ہے۔ لہٰذا باسودے کی مریم اور منّی دادا ایسے ہی کردار ہیں اور اسد محمد خاں نے انھیں جس طرح تراشا اور پیش کیا ہے تو اب چاہے وہ ہماری خارجی زندگی کے مصرف کے نہیں رہے لیکن داخلی ضرورت کو ضرور پورا کرتے ہیں۔ اسی ضرورت سے ان کرداروں کی ماہیت طے ہوتی ہے۔ ان افسانوں اور ان کرداروں کے ذریعے فن کار ایک کام تو یہ کرتا ہے کہ ایک طرزِ معاشرت اور ایک تہذیب کو sterilize کر کے محفوظ کر لیتا ہے اور دوسرا کام یہ کرتا ہے کہ ہمیں دوسروں کی زندگی کے وجودی تجربے کو احساس کی سطح پر live کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس لیے کہ جو تہذیب اور جو کردار اس نے اپنی کہانیوں میں محفوظ کیے ہیں، وہ آرکائیوز اور نیشنل میوزیم میں رکھی ہوئی اشیا کی طرح حنوط کیے ہوئے نہیں ہیں۔ اس کے یہاں تو جو کچھ ہے زندہ ہے اور اس طرح زندہ ہے کہ اس کا لمس تک محسوس کیا جا سکتا ہے۔ 'باسودے کی مریم' اور ''منّی دادا'' تو اسد محمد خاں کے فنی سفر کے ابتدائی سنگِ میل ہیں، آپ وہاں سے آگے کے افسانوں 'نربدا'، 'سو تمر کی باڑی'، ''ایک دشت سے گزرتے ہوئے'' اور 'ندی اور آدمی'' تک چلے آیئے۔ آپ کو ہر جگہ احساس کی ایک ایسی لہر موجزن ملے گی جو بیک وقت وجود اور روح کی سطح پر زندگی کے

تجربے کو بیان کرتی نظر آتی ہے۔ ایک ایسے intense تجربے کو جو خود آپ کا نہیں ہے لیکن معنویت کے کسی نہ کسی دائرے میں آپ اس سے خود کو شدت کے ساتھ identify ضرور کرتے ہیں۔

میں نے اوراقِ گزشتہ میں ایک مقام پر حقیقت اور زندگی کی عکاسی کا نعرہ بلند کرنے والوں کو گرد گردانا ہے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ میں ادب میں حقیقی زندگی کے عکس و آہنگ کی پیش کش کے خلاف ہوں۔ نہیں، بلکہ میرا اختلاف تو اس تصور سے ہے جو حقیقت یا زندگی کی عکاسی کے حوالے سے اس قسم کی فرمائش کے پس منظر میں کام کرتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ کہانی کار کا شعور مکمل طور پر اس کے دماغ اور مشاہدے کا مرہونِ منت نہیں ہوتا بلکہ انسانی وجود کے ہر رگ و ریشے سے جو احساسات و مدرکات ترتیب پاتے ہیں اور پھر روح ان احساسات و مدرکات کو اپنے جوہر سے جو معنی دیتی ہے ان سب کے مجموعے سے کہانی کار کا شعور مرتب ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ جس حقیقت کا سراغ لگاتا اور اظہار کرتا ہے اس کی تفہیم محض تعقلات کی مدد سے نہیں ہو سکتی۔

حقیقت نگاروں کا مسئلہ یہی ہے کہ وہ سامنے کی چیزوں اور عقلی مناسبات میں اس درجہ الجھ جاتے ہیں کہ ورائے عقل حقائق تک ان کی رسائی ہو ہی نہیں پاتی۔ سماجی رابطے کا اُتھلا پن اور جذباتی رشتوں کی ہلکی باتیں وقت گزاری کے مشغلے کے لیے کہانیاں پڑھنے والے قارئین کو پسند آسکتی ہیں کہ ان کا بنیادی مسئلہ (time killing) اس قسم کی باتوں سے حل ہو جاتا ہے لیکن وہ سنجیدہ قاری جو کہانی پڑھنے سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی اپنے مطالبات رکھتا ہے ان کہانیوں سے اس کی تشفی نہیں ہو سکتی۔ ادب کا سنجیدہ کہانی کار time killing اور recreation of life کے بنیادی فرق کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہے۔ آپ اسد محمد خاں کے افسانے "نور کی لقت ۲۳۵ حمود الرحمٰن کمیشن کے روبرو"، "طوفان کے مرکز میں" اور "وقائع نگار" پڑھیے اور دیکھیے کہ ہماری ہم عصر سماجی سیاسی زندگی کے کیا کیا احوال و آثار ان افسانوں میں بیان ہوئے ہیں۔ لیکن ان افسانوں میں وہ سماجی حقیقت نگاری کہیں نہیں ملتی جو مثال کے طور پر رضیہ بٹ، سلمیٰ کنول اور بشریٰ رحمٰن کی 'معاشرتی کہانیوں' میں نظر آتی ہے۔ اصل میں سماجی حقیقت نگاری کا وہ مطالبہ جو کبھی ترقی پسندوں نے کیا تھا، اس کے تو شاید پھر بھی کوئی معانی تھے اور اس تحریک کے زیرِ اثر بعض سنجیدہ لکھنے والوں نے اس مطالبے کو فنی تناظر میں ہی قبول بھی کیا تھا لیکن آج تو اس مطالبے کا مطلب سوائے اس چٹخارے کے اور کچھ رہا ہی نہیں جو ٹیلی وژن کے مقبول رومانی ڈراموں یا ڈائجسٹ کے سلسلوں میں پایا جاتا ہے۔ اہلِ نظر نے اس نوع کی چیزوں کو ہمیشہ لچر پن کا عنوان دے کر الگ رکھا ہے لیکن افسوس کہ آج کی سماجی حقیقت نگاری اور معاشرتی کہانیاں اسی مفہوم و مطلب کی حامل ہو کر رہ گئی ہیں۔ تاہم سنجیدہ لکھنے والے آج بھی پاپولر کہانیوں کے طومارے سے الگ ہیں۔ آپ اسد محمد خاں کے ان تینوں افسانوں کا مطالعہ کیجیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ادب کے شعور سے بہرہ مند فن کار اپنے موضوع کے انتخاب ہی میں نہیں اس کے برتاؤ میں بھی کن لوازم کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ ادب تاریخ نہیں ہوتا لیکن کبھی وہ تاریخ کے لیے raw material فراہم کرتا ہے اور کبھی تاریخ کی چھان پھٹک کے لیے وہ parallel history کی دستاویز مرتب کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے سو اسد محمد خاں کے مذکورہ بالا تینوں افسانے کچھ اسی نوع کا کام کرتے نظر آئیں گے۔ یہ تینوں افسانے مختلف المزاج ہیں۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ تینوں مختلف واقعات کے تناظر میں لکھے گئے ہیں لیکن اس کے علاوہ اہم ترین بات یہ ہے کہ افسانہ نگار نے ان کی الگ الگ زمانی واقعیت اور مکانی حوالوں کو معرضِ اظہار میں لانے کے لیے ایسے اسالیب وضع کیے ہیں کہ حقائق نہ تو افسانے کو خراب کرتے ہیں اور نہ ہی افسانہ حقائق کو مسخ کرتا ہے۔ ان میں بعض مقامات پر افسانوں کی بالکل داخلی ضرورت کے تحت حقیقت اور علامت کا ایک آمیزہ افسانے کے قالب میں ڈھلتا محسوس ہوتا ہے اور کہیں کہیں سادہ بیانیے میں ہلکے رنگوں کا satire اسلوب میں شامل ہو جاتا ہے۔ ایسے مقامات فن اور فن کار کی کڑی آزمائش کے مراحل ہوا کرتے ہیں۔ ذرا سی فنی کمزوری افسانے کو سیاسی نعرہ بنا کر رکھ دیتی ہے یا پھر افسانہ نگار کی ذرا سی بے احتیاطی سے افسانہ تیسرے درجے کے جذباتی ملغوبے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسد محمد خاں کے افسانے اس قسم کی کسی چوک میں نظر نہیں آتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے واقعات اور حقائق کو کبھی over play نہیں کیا اور نہ ہی افسانے کو بھاشن دینے کے لیے استعمال کیا ہے مزید برآں یہ کہ انھوں نے اپنے فن کو نظریاتی آلودگی سے بھی محفوظ و مامون رکھا ہے۔

دیکھیے، یہاں مجھے خیال آتا ہے کہ میں "چاکر"، "مردہ گھر میں مکاشفہ"، "ہٹلر شیر کا بچہ"، اور "ایک دشت سے گزرتے ہوئے" کا حوالہ دوں بلکہ صرف انھی کا نہیں، طوائفوں کے حوالے سے لکھے گئے افسانوں (مثلاً "برچیاں اور سور"، "اک میٹھے دن کا انت"، "نصیبوں والیاں" وغیرہ) کا بھی ذکر کروں اور ان کے حوالوں اور مثالوں سے واضح کروں کہ اسد محمد خاں نے زندگی کے حقیقی کرداروں، واقعات، معاملات اور مسائل کو کس طرح اپنے افسانوں میں برتا ہے لیکن فی الحال بہت تفصیل و طوالت سے حذر کرتے ہوئے بس دو ایک حوالوں پر اکتفا کرتا ہوں:

> رجّو نے پیسے لے لیے۔ دیدے گھما کے
> بولا، "سلام کا ئے کو کہلوارئی ہو، دُعا دو۔
> دونوں عمر میں چھوٹے ہوں گے تم سے۔"
> دڈی پلّو سے آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ سر اٹھا
> کے بولی، "ہوں گے کیا، پاگلا! دونوں ہی عمر
> میں چھوٹے ہیں۔ پر کپتان وان اور کلاؤنت
> اپنے کاموں سے بڑے ہوتے ہیں۔ حبیب

خاں جس ویلے وینا پہ ہاتھ رکھ دیں یا اللہ رکھا خاں صاحب طبلے کو انگلیاں چھوا دیں تو سمجھو اس ویلے سب کے بزرگ بن جاتے ہیں۔ سمجھا کچھ؟‘‘

(اک بیٹھے دن کا انت)

پہلے ذرا ’’اک بیٹھے دن کا انت‘‘ کے اقتباس کو دیکھیے۔ اتنا تو اس ٹکڑے میں اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایک کوٹھے ولی استادوں کو نیاز گزار رہی ہے۔ یوں تو یہ بس ایک عام سی بات ہے۔ ہر شعبے میں بڑوں کو بعد میں آنے والے خراج عقیدت پیش کرتے ہی ہیں لیکن کوٹھے والوں کا رکھ رکھاؤ اور ان کی ریت رسم تو ہوتی ہی کچھ اور ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان فقروں میں ادا کیے گئے احساسات کے معانی انھی لوگوں پر کھل سکتے ہیں جو کوٹھے کے کلچر سے واقف ہوں لیکن اتنی بات تو ہم سبھی سمجھ سکتے ہیں کہ اس گئے گزرے زمانے میں کہ جب کوٹھوں کی تہذیب رخصت ہو چکی، اب تک وہاں یہ چلن باقی ہے کہ بڑوں کی نذر نیاز ہو اور ادب احترام کانوں کی لویں چھو کر کیا جاتا ہے۔ یہ کسی شخص کا نہیں بلکہ اس کے گنوں کا اعتراف ہے۔ آدمی کی قدر و منزلت کسی اور شے میں نہیں اس کے کمالِ فن میں مضمر ہوتی ہے۔ یہ اتو آدمی کو اس کا کام بناتا ہے۔ یہ اعتبار کی دنیا ہے۔ بظاہر ایک چٹخارے کے ساتھ شروع ہوتی اور آگے بڑھتی اس کہانی کے عقب میں جھانک کر دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ فرد کی توقیر ہی میں نہیں، خود ان کے رویوں کی تشکیل میں بھی معاشرے کی تہذیب و ثقافت کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ بلند تر ین تصورات کی سطح سے لے کر ارذل و اسفل شعبوں تک حفظِ مراتب کا یہ پورا نظام کام کرتا ہے۔ اسد محمد خاں کے فن میں ہمیں اپنی ثقافتی اقدار کی ایسی ایسی متحرک تصویریں مل جاتی ہیں جو اب معاشرے میں مفقود ہو چکی ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسد محمد خاں نے ان تصویروں کو اچھائی اور برائی کے لیبل لگائے بغیر دکھانے یا محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے اور یہی فن کا اصل مقصود ہوتا ہے۔

ایک اور اقتباس دیکھیے:

شاہ زیب نے ملزم کی ہتھکڑیوں کا تالا اور بیڑیوں کے ریپٹ کھول دیے۔ ’’ضابطے کے تحت اسے وقوعے کی جگہ پر ادھر ہی دشت میں دفن کیا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی حکم ہے کہ جلدی کرنی چاہیے... پر آگے جو بھی آرڈر ہو۔‘‘ ملاں نے کہا۔

دور درختوں میں تین پرچھائیاں رُکی ہوئی تھیں۔ ان میں سے دو مردوں کی پرچھائیاں تھیں، تیسری ایک عورت کی۔ وہ اتنی دُھندلی تھیں اور ایسے لرزتی تھیں کہ ان کے پار دشت کا سب کچھ نظر آتا تھا، بالکل اسی طرح جیسے روحیں تجیسٹ کرتے ہوئے فلم کے ڈبل ایکسپوژر میں پرچھائیاں دکھلائی جاتی ہیں تو ان کے پار بھی سب کچھ نظر آتا ہے۔

نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تین، جواب مل کے بھی ایک زندہ جاوے نہیں بن سکتے تھے، کیا کریں گے؟ آگے کہاں جائیں گے؟ بس، دشت کے آف سیٹ میں وہ وہیں رُکے ہوئے تھے۔

اور تبھی کھلا کہ جب کوئی امنگوں بھرا جوان مرتا ہے تو ایک دوست اس کا اور ایک داشتہ اُسی کے ساتھ مر جاتے ہیں۔

(ایک دشت سے گزرتے ہوئے)

دوسرا اقتباس جس کہانی سے لیا گیا ہے وہ تو اپنی تکنیک میں بھی ایک نہایت عمدہ تجربہ ہے۔ ماضی وحال کے منظروں، کرداروں کی داخلی وخارجی صورتِ حال اور ان کے احساس و حقیقت کو جس خوبی کے ساتھ اسد محمد خاں نے بلینڈ کیا ہے اُس سے افسانے میں معانی کی مختلف جہتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس فسانے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ اگر ایک طرف علامت اور تجرید کے الگ الگ تناظرات میں اپنے معانی متعین کرنے میں کامیاب رہتا ہے تو دوسری طرف حقیقت نگاری کے حوالے سے بھی اسے ایک عمدہ مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسد محمد خاں نے فسانے کو جس طرح conclude کیا ہے اُس سے اس میں ایک سیاسی جہت بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اب فسانے کے معانی بالکل بدل جاتے ہیں۔ فرد کی بے حسی اور سفاکی کا وہ رویہ جو گاہ گاہ فسانے میں ہمارے سامنے آتا رہا ہے اب اُس کا مفہوم ہم واضح طور پر سمجھ سکتے ہیں... اور اس کے تضاد میں دوست اور داشتہ کی شخصیات کو جس طور پیش کیا گیا ہے وہ ان کرداروں کی انسانیت کو نہایت شدت کے ساتھ اُجاگر کرتا ہے اور تہذیبِ نو کے آئین اور اصولوں کے آگے سوالیہ نشان لگا دیتا ہے۔

بات یہ ہے کہ اسد محمد خاں کا فسانہ خواہ وہ ’’وقائع نگار‘‘ ہو، ’’طوفان کے مرکز میں‘‘ ہو، ’’مردہ گھر‘‘ ہو، ’’اک بیٹھے دن کا انت‘‘ یا ’’ایک

دشت سے گزرتے ہوئے‘‘...ان کے یہاں ہمیں کسی بھی مقام پر نہ تو سیاست و تاریخ پڑھنے کو ملتی ہے اور نہ ہی صرف زندگی... بلکہ ہم ان کے فسانوں میں فسانے ہی پڑھتے ہیں۔ جی ہاں، افسانے... جو ادب ہیں اور وہ ادب جو ہمیں مسکین ادبیات کی طرح entertain نہیں کرتا بلکہ ہمارے احساس کے تاروں کو جھنجھنا دیتا ہے اور ہمیں زندگی کے سوالوں پر سوچنے کی راہ دکھاتا ہے۔ ان فسانوں کا لکھنے والا نہ تو خود at ease ہے اور نہ ہی ہمیں at ease رہنے دینا چاہتا ہے۔ اس نے راست زندگی کو نہیں لکھا، نہ ہی رومانس کی نیلگوں فضائیں اس کے فسانوں کے موسموں میں رنگ بھرتی ہیں اور نہ ہی حیاتِ انسانی کے دکھوں، محرومیوں اور نارسائیوں کو glamourize کرنے میں اس نے اپنے فن کا آب ورنگ خرچ کیا ہے۔ وہ زندگی کو نہ تو equations میں سوچتا ہے اور نہ ہی لکھتا ہے۔ وہ نہ تو کسی نظریے کا طرف دار ہے اور نہ ہی کسی اخلاقی منصوبے کا نمائندہ۔ کسی قسم کی اخلاقی کارگزاری، نظریاتی آسودگی یا جذباتی تسکین کی خاطر کہانیاں پڑھنے والے لوگوں کو اسد محمد خاں کے فسانے پڑھ کر سخت مایوسی ہوگی۔ اسد محمد خاں ہمارے عہد کے اُن لکھنے والوں میں ہیں جو زندگی اور اس کے مظاہر کو دیکھتے ہیں تو سوالوں سے دوچار ہوتے ہیں اور ان کا فن ان سوالوں کا سامنا کرنے کی جرأت سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ لکھتے ہوئے عوام الناس کی خواہشات اور مطالبات کو نہیں بلکہ اپنے فن کے تقاضوں اور فکر کے زاویوں کو سامنے رکھتے ہیں۔ ان کا افسانہ اپنے اظہار و ابلاغ میں زندگی کے عام سے تناظر اور معمولی مسائل سے شروع ہوکر ورائے ادراک حقائق کی طرف اپنے پڑھنے والوں کو لے کر چلتا ہے۔

دیکھیے، بات یہ ہے کہ کہانیاں ہمیں ایک زندگی میں ایک سے زیادہ زندگیاں جینے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ کس طرح؟ یوں کہ ان کے احوال و کوائف سے ہم identify کرتے ہیں، اپنے احساس کو، اپنی سوچ کو، اپنے وجود کو... اور اپنی روح کو۔ اسد محمد خاں کا افسانہ ایک ایسے آمیزے کی صورت رکھتا ہے جس کے تمام عناصر ایک خاص تناسب کے ساتھ گوندھے گئے ہیں... لیکن انھیں الگ الگ کرکے شناخت کرنا ممکن نہیں... ہماری زندگی کے اپنے آمیزے کی طرح کہ اس کی ساری رونق، چاشنی اور رنگ و آہنگ جو کچھ بھی اس میں ہے وہ اصل میں اس کی کلیت میں ہے۔ کسی بھی لکھنے والے کے یہاں یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ زندگی کو کسی آدرش، کسی نظریے، کسی ایجنڈے کے تحت نہیں دیکھتا اور نہ ہی ایسی کسی خارج سے عائد ہونے والی cause کو serve کرنے کی خاطر لکھتا ہے بلکہ یہ صورت تو اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ تجربۂ حیات کو اور انسانوں کو خود ان کی اصل حالت پر قبول کرنے لگتا ہے۔ نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ لکھنے والے کے اپنے تعصبات نہیں ہوتے یا یہ کہ وہ کوئی ترجیحات نہیں رکھتا یا یہ کہ وہ جب لکھنے بیٹھتا ہے تو اپنے تعصبات اور ترجیحات کو یکسر ترک کر دیتا ہے۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ یہ تو پیغمبرانہ شان ہے۔ ہاں، اس شان میں سچے اور بڑے لکھنے والے کا اتنا حصہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ اپنے تعصبات اور ترجیحات کے پورے نظام کو اپنی تحریر میں suspended حالت میں ظاہر کرتا ہے... وہ بھی اگر ظاہر کرنا ازبس ضروری ہو تو۔ اسی خصوصی استعداد کی بنا پر وہ دوسروں کو جی جہاں اور جیسا ہے کی بنیاد پر قبول کرتا ہے اور باور کرتا ہے کہ ہر انسان میں احساس اور عمل کا نظام بیک وقت اچھائی اور برائی کے متضاد رویوں کے تحت کام کرتا ہے۔ اسد محمد خاں کے فسانوں میں ہمیں خراب جگہوں اور خراب لوگوں میں جو ایک خوبی یا اچھائی کی اچانک جھلک دکھائی دے جاتی ہے یا کہیں اچانک اچھائیوں کے جھرمٹ میں چھپی ہوئی برائی نظر آجاتی ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ انھوں نے اپنے کرداروں کو انسانی سطح پر دیکھا اور انسانی حوالوں سے برتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی کیمسٹری کسی ملٹی نیشنل میڈیسن کمپنی کی کیمسٹری لیب کے نتائج کی پابند نہیں ہوتی۔ وہ اپنے نتائج اپنے اصولوں کے تحت ترتیب دیتی ہے proto types کے تحت نہیں۔ آپ چیخوف کے افسانوں میں دیکھیے، کیسے کیسے کردار نظر آتے ہیں۔ نہایت زندہ کردار مگر زندگی کی عین مطابقت میں نہیں... کہیں اس سے زیادہ اور کہیں اس سے کم۔ آپ چیخوف کی ایک کہانی کے اُس کوچوان کو یاد کیجیے جو سارا دن لوگوں کے ساتھ گزارتا ہے صبح سے شام تک مسلسل لوگوں کے بیچ... لیکن سخت تنہائی کے احساس سے دوچار۔ لوگ اس سے باتیں کرتے ہیں، وہ بھی ان سے بات کرتا ہے لیکن وہ بات جو وہ بتانا چاہتا ہے نہیں بتا پاتا... اور پھر جب رات میں وہ اپنے گھوڑے کو تھان پر لا کر کھولتا ہے تو اس سے اپنی بات کہتا ہے۔ دیکھیے، کہانی کے اختتام پر لا کر چیخوف نے پورے معاشرے کے بیچ فرد کی تنہائی کو کتنا بڑا اور کتنا حقیقی بنا دیا ہے۔ کیا یہ تنہائی واقعی اتنی ہے جتنی کہ ہم زندگی میں دیکھتے ہیں؟ نہیں، یہ اس سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔ میں نے ابتدا میں بتایا کہ پہلے پہل مجھے اسد محمد خاں کے کردار بالکل حقیقی زندگی کے مماثل نظر آئے، لیکن بعد میں مجھے اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ یہ کردار حقیقی زندگی کے کرداروں سے کہیں کہیں بڑے ہو جاتے ہیں، خاصے بڑے۔ میں اسد محمد خاں کو اردو کا چیخوف نہیں بنا رہا ہوں محض مناسبات کی نشان دہی مقصود ہے۔ آپ اسد محمد خاں کا افسانہ ’طوفان کے مرکز‘‘ میں پڑھیے اور دیکھیے کہ افسانہ نگار نے زندگی کے integrated vision کے ٹوٹنے کے عمل کو کس طرح مجسم کردیا ہے۔ اسی طرح ’سو تم کی باڑی‘‘ میں دیکھیے، اختتامیہ ساری ڈبدھا کو کیسی reality میں منقلب کرتا ہے... انسانیت اور محبت کا اصل روپ کس طرح بے نقاب اور بے حجاب ہو کر ہمارے سامنے آ ٹھہرتا ہے۔ تو یہاں آ کر ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ فن زندگی کی تکمیل پر خود زندگی سے بڑھ جاتا ہے۔ فسانے کی سچائی زندگی کی سچائی سے زیادہ بڑی اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔

یہاں اہم سوال یہ ہے کہ فن larger than life کیسے ہو جاتا ہے؟ ایسے ہو جاتا ہے کہ وہ ورائے زمان و مکاں سفر کرتا ہے اور اپنے ساتھ

ساتھ خود تجربۂ حیات کی نئی معنویتیں دریافت کرتا چلا جاتا ہے۔ اس میں فرد کی سچائی absolute انسانی سچائی میں ڈھل جاتی ہے اور یہ سچائی کسی تہذیبی، سماجی، تاریخی اور سیاسی حوالے کے بغیر بھی ہم سے اپنا اثبات کراتی اور رشتہ استوار کر لیتی ہے۔ آپ ''زبدا''، ''رگھوبا اور تاریخ فرشتہ''، ''جانی میاں'' اور ''ایک دشت سے گزرتے ہوئے'' کے کرداروں کو ملاحظہ کیجیے۔ کیسے دلچسپ تضادات کی دنیا اور گہرے انسانی رویوں کا منظرنامہ اجاگر ہوتا ہے۔ کئی مقامات پر ہم ان کرداروں اور ان کی صورتِ حال سے یوں مربوط ہو جاتے ہیں کہ ان کے تجربے اور احساس کی گواہی دینے لگتے ہیں۔ سارنگ سنگھ، سارنگ سنگھ اور لڑکی (زبدا)، رگھوبا، گسم چند اسٹے (رگھوبا اور تاریخ فرشتہ)، جانی میاں، ریٹابائی، وحید، سلطان بھائی (جانی میاں)، جاوا، سگاں، اللہ بخش کالا ناگ (ایک دشت سے گزرتے ہوئے) ذرا ان کرداروں کو دیکھیے...ویسے یہاں پہلے میں ایک بات واضح کردوں کہ بہت ہاتھ کھینچ کر گنائے ہیں میں نے یہ کردار، ورنہ اسد محمد خاں کی کہانی چاہے وہ مکمل narration ہی میں کیوں نہ ہو، اس کے کرداروں سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں۔ خیر، تو جب ہم ان کرداروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو انسانی فطرت کی شیرینی، حلاوت، تلخی، تیزی، ترشی اور نمک، غرض ہر ذائقہ، الگ الگ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اب لطف کی بات یہ ہے کہ ان میں بعض کردار تو ایسے ہیں کہ بیک وقت تلخ، ترش، شیریں محسوس ہوتے ہیں۔ میں نے آغاز میں کہا تھا کہ اسد محمد خاں کے جہانِ افسانہ و افسوں میں ہمارا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑتا ہے کہ اچھوں میں گنے جائیں مگر بُروں میں بھی الگ نہیں لگتے...ساتھ ہی ساتھ بُروں میں لکی اچھائیاں کرنے والے بھی نظر آتے ہیں کہ انسانیت کی مثال ٹھہرائے جائیں۔ تو اسد محمد خاں کے فن کا امتیاز اصل میں یہی ہے کہ مسلسل suspension of belief پر اصرار کرتا ہے۔ یہ کردار زندگی کی عکاسی تو کرتے ہیں لیکن محض زندگی کی عکاسی معراجِ فن نہیں ہے۔ فن کا کمال تو یہ ہے کہ وہ جو سامنے نظر آ رہا ہے اس کے پس منظر کی خبر لے آئے...وہ جو اصل دکھائی دے رہا ہے اس کی بنیاد کا سراغ پالے اور اس سے بھی آگے یہ کہ اس کے گزشتہ کو حال ہی سے نہیں، آئندہ سے بھی مربوط کر کے دکھائے۔ یہی ہے فن کو larger than life بنانے والی reality۔ سارنگ سنگھ، رگھوبا، اسٹے، جانی میاں، جاوا، اللہ بخش کالا ناگ...دیکھیے تو سہی کہ صرف انسان کی نہیں بلکہ انسانیت کی کیسی کیسی حقیقتوں کے مظہر ہیں یہ کردار — اُن حقیقتوں کے جن کو سہارتے ہوئے خود زندگی چھپک جاتی ہے چیں بول جاتی ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ اپنی جگہ سے سرکتے ہیں تو سماج کی چولیں ہل جاتی ہیں۔ حالاں کہ یہ کردار نہ تو کسی سماجی و سیاسی نظام کے نمائندے ہیں اور نہ ہی کسی اخلاقی و تہذیبی فکر کے رول ماڈل۔ بس انسان ہیں...انسان کا وہ سانچہ کہ جس کی realities سے دوسرا انسان باوجود اختلافات اور ناپسندیدگی کے خود کو associate کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے نہیں رہ سکتا کہ یہ کردار اپنی اچھائی اور برائی کے دائرے میں فطرتِ انسانی کو کھولتے ہیں...generic انسان کو decode کرتے ہیں۔

اسد محمد خاں کے فن کی بنیادی جستجو اصل میں انسان کو اس کی سرشت میں مثبت و منفی علائق کے ساتھ سمجھنے سے عبارت ہے۔ ہم ان کے پورے فنی سفر کو سامنے رکھ کر اس نکتے کو بہتر انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے پہلے مجموعے ''کھڑکی بھر آسمان'' کے افسانے ہوں جو افراد اور ان کے شخصی کردار کو موضوع بناتے ہیں یا دوسرے مجموعے ''برج خموشاں'' کے افسانے کہ جن میں حالات اور واقعات پر کرداروں کی بہ نسبت افسانہ نگار کی توجہ زیادہ محسوس ہوتی ہے...اور آخری دونوں مجموعوں ''غصے کی نئی فصل'' اور ''زبدا اور دوسری کہانیاں'' میں تو خیر اب ان کی کہانی نئی ہی فرد اور اس کے ماحول کے ایسے تال میل سے ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا محال ہے۔ لیکن از اول تا آخر ہم ایک بات بخوبی محسوس کر سکتے ہیں کہ اسد محمد خاں نے خواہ فرد کی کہانیاں لکھی ہوں یا ماحول کی یا پھر دونوں کے گھال میل سے قصہ بنایا ہو لیکن ان کی خاص توجہ اصل میں فرد کی اس سرشت پر رہتی ہے جو نیکی میں بدی اور بدی میں نیکی کے اصول خود بناتی اور ان کے تحت کام کرتی ہے۔ ان اصولوں کی ہماری سماجی صورتِ حال، اخلاقی اور اقداری نظام سے کوئی relevance ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے تو وہ محض انسانی اور اتفاقی ہے۔ ہم اسد محمد خاں کے کرداروں کی اکثریت کو اچھا کہیں یا بُرا لیکن اتنی بات ہمیں بہرطور تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ یہ کردار پوری سچائی کے ساتھ نظر آتے اور زندگی کو پورے وجود سے بسر کرتے ہیں۔

اسد محمد خاں کے جہانِ افسانہ میں ہمیں رذیل اور کمینے لوگوں سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے۔ اس کا کیا سبب ہے؟ بات یہ ہے کہ انسان کا خمیر اٹھا تو خیر سے ہے لیکن اس کے ساتھ نفس کا جولا زمہ لگا ہوا ہے وہ بدی کو کسی لمحے اس سے الگ ہونے کا موقع فراہم نہیں کرتا۔ ادب و فن کا کلاسیکی تصورِ انسان میں خیر کے عنصر کو غالب سمجھتا اور غالب پیش کرتا ہے جب کہ نئے ادب کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ خیر کا انکار تو نہیں کرتا لیکن یہ انسان کے اندر خیر کو غالب بھی نہیں سمجھتا۔ اس نے زندگی کو خیر و شر کی آویزش میں دریافت کیا ہے اور شر کو خیر پر غلبہ پاتے دیکھا ہے۔ چناں چہ اسد محمد خاں، کہ جدید عہد کے افسانہ نگار ہیں، انھوں نے اپنے فن میں جو انسانی صورتِ حال پیش کی ہے وہ خیر و شر کے اسی نئے تصور کے تحت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اور یہاں ہمیں اس حقیقت کو بھی پوری سچائی کے ساتھ تسلیم کرنا چاہیے کہ انسانی فطرت میں داخل شر کے عنصر کا جو اظہار ہمارے عہد کی زندگی میں ہو رہا ہے وہ غالباً اس سے قبل کی انسانی تاریخ میں نظر نہیں آتا۔ اس عہد میں بدی زیادہ طاقت ور ہی نہیں ہوئی ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہولناک بات یہ ہے کہ اس نے نیکی پر غلبہ پانے کے لیے خود نیکی کے اوزاروں کو بھی استعمال کرنا سیکھ لیا ہے۔

اب آخر میں آ کر میں ضمناً اسد محمد خاں کے بارے میں سامنے آنے والے دو ایک تاثرات پر بھی اظہارِ خیال کرنا چاہوں گا۔ اسد محمد خاں کے

فسانوں کی بابت ایک رائے یہ پائی جاتی ہے اور اس کا اظہار نہایت خوشی کے ساتھ کیا جاتا ہے گویا ایسا ان کی کسی خوبی کے اعتراف میں کیا جا رہا ہے اور اس کا جواز ان کی "سپاٹ بیانیت" کو قرار دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے فسانوں میں غصے کی ایک لہر کو ہمہ وقت دوڑتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ان کے ایک مداح نے ان کے طوائفوں والے افسانوں کے لیے وفورِ جذبات میں یہ بھی کہا کہ فسانے میں بجلیاں سی دوڑتی محسوس ہوتی ہیں۔ سبحان اللہ، جس جس کے گمان میں آئی۔ یاروں کے کھیل نرالے، کہیں فن میں بھی نسلی تعصب کی گنجائش نکال لیتے ہیں اور کہیں اپنے ناگفتہ جذبوں کی گھٹن دور کرنے کے لیے فسانے سے وہ معجزہ کھیا برآمد کر لیتے ہیں جو رگ و پے میں بجلیاں دوڑا سکتا ہے۔ اصل میں اس قماش کے لوگ بھول جاتے ہیں کہ ذمہ دار کہانی کا راپنے کرداروں اور ان کی تقدیر سے صرف اور صرف فکری، ذہنی یا نظری رشتہ نہیں رکھتا بلکہ ان سے اس کی وابستگی احساس اور جذبے کی سطح پر بھی نہایت مستحکم ہوتی ہے چناں چہ اسد محمد خاں کے یہاں جس شے کو غصے اور برقی لہر سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ اصل میں کہانی کار کی اسی وابستگی و پیوستگی کی قوت ہے۔ یہ کردار کو محض اس کے وجود میں نہیں بلکہ روح میں جانے اور بیان کرنے کا ہنر ہے اور کہانی کار اس ہنر کو استعمال کرنا اسی وقت سیکھتا ہے جب وہ اپنے کردار اور اس کی تقدیر سے اپنے تئیں مستحکم رشتے استوار کرتا ہے۔ یہ فن اور زندگی کو احساس کی بلند سطح پر آمیز کرنے کا تجربہ ہے اس بلند سطح پر جہاں فن چقماق بن جاتا ہے اور زندگی سے رگڑ کھاتا ہے تو چنگاری پیدا کیے بغیر نہیں رہتا۔ ایک ایسی قوت کے قالب میں ڈھل جاتا ہے جو اپنے اظہار کے لیے راہ خود نکال لیتی ہے۔

ایک بات اور، اسد محمد خاں نے اپنے افسانوں میں اسلوب، تکنیک اور بیانیے کے بہت تجربے کیے ہیں۔ ان کے پیش روؤں میں پریم چند، منٹو، بیدی اور عزیز احمد کے یہاں بھی ہمیں اس نوع کے خاصے تجربات ملتے ہیں لیکن مختلف المنہاج تجربوں کا جو سلسلہ ہمیں اسد محمد خاں کے یہاں ملتا ہے وہ اپنی نوعیت میں الگ بھی ہے اور دل چسپ بھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ صفت افسانہ نگار کے کام کے مجموعی تخمین و ظن میں کام آ سکتی ہے؟ جی ہاں آ سکتی ہے لیکن اس کا فیصلہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ان تجربوں کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ دیکھنا یہ ضروری ہے کہ کیا یہ تجربے کسی قسم کے فنی التزام کا حاصل ہیں یا افسانے کی ماہیت اور افسانہ نگار کے فنی سفر کی کسی داخلی ضرورت کے نتیجے میں رونما ہوئے ہیں؟ اگر ان تجربوں کا اہتمام محض فنی التزام کی بنا پر ہو تو بھی اس کی داد افسانہ نگار کو ضرور دی جانی چاہیے۔ اس لیے کہ یہ فن کی توسیع کا عمل ہے لیکن اس صورت میں اس کے کام کی مجموعی قدر و قیمت میں اس التزام سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فنی التزام اگر معنویت کی افزونی کے لیے ہے تو بڑا کام ہے بصورتِ دیگر محض آرائش۔ کلیاں چھندنے ٹانکنا بھی ایک کام تو ضرور ہے لیکن زندگی کے بڑے تجربوں کی معنویت کھولنے میں یہ کام کچھ ایسا مفید مطلب ثابت نہیں ہوتا۔ خیر، stylists کی اہمیت ہر زمانے اور ہر ادب میں رہی ہے لیکن اصل میں بڑا فن کار وہ ہے جس کا ہر کام اس کے فن کے بنیادی نکتے کی تشکیل و تعبیر میں کوئی نہ کوئی کردار ادا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ سو پا ساں کو لیجیے۔ اس کے یہاں آپ کو ہر فنی تجربہ اس کے معنوی تجربے سے منسلک ملے گا۔ ٹیگور کو دیکھیے، یہی صورت نظر آئے گی۔ بورخیس کے یہاں ملاحظہ کیجیے، ایسا ہی نقشہ ملے گا۔ غرضے کہ بڑا افسانہ نگار اپنے فن کے ہر ایک جزو اور ہر ایک عنصر کو برتتے ہوئے ایک نامیاتی وحدت میں ڈھالتا ہے اور ایک کُل میں جوڑتا ہے اور اس کُل سے اپنے معانی وضع کرتا ہے۔

آخری بات... اگر ہم سے کوئی یہ دریافت کرے کہ بھئی اسد محمد خاں کا خاص رنگ کیا ہے؟ تو ہم مخمصے میں پڑ جائیں گے۔ ہاں واقعی اسد محمد خاں کا تو کوئی خاص رنگ ہے ہی نہیں۔ ان کے یہاں تو ہمیں کوئی patent اسٹائل ملتا ہی نہیں۔ تو وہ لوگ جو ادب میں کسی خاص رنگ اور کسی خاص اسٹائل کے بغیر لقمہ توڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے، اسد محمد خاں کا افسانہ ان کا کپ اوف ٹی نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہاں ایک لمحے کے لیے رُک کر ہمیں یہ جاننے کی کوشش ضرور کر لینی چاہیے کہ آخر اس زندگی کا اور اس کائنات کا بھی کیا کوئی خاص رنگ یا خاص اسلوب ہے؟ جی ہاں، اس سوال کا جواب ہی اس قضیے کو حل کر سکتا ہے کہ ایسا کوئی مطالبہ کسی فن کار سے کیا بھی جانا چاہیے یا نہیں۔ تو جواب یہ ہے کہ نہیں کیا جانا چاہیے۔ اس لیے کہ خود حیاتِ انسانی کا اور انسانوں کی اس کائنات کا کوئی مخصوص رنگ نہیں ہے۔ یہاں تو رنگا رنگی بہار دکھاتی ہے۔ جس طرف نگاہ کیجیے، نگار ہزار رشیدہ رُو بہ رُو ہے۔ دُکھ کے ہزار رنگ ہیں اور سکھ کے بھی ہزار رنگ۔ اور لطف یہ ہے کہ ان میں بھی کبھی کوئی رنگ dominate کرتا ہوا نظر آتا ہے اور کبھی کوئی رنگ۔ تو وہ لوگ جنھوں نے ایک خاص رنگ اور ایک خاص اسلوب وضع کر لیا، ان کے فن کا داخلی مطالبہ وہی ہوگا۔ انھیں ہم مسترد نہیں کرتے، بلکہ ان کا احترام اپنی جگہ ہے۔ تاہم یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ جس فن کار نے ایسا نہیں کیا وہ بھی اپنے کسی داخلی فنی مطالبے کی وجہ سے نہیں کیا ہوگا۔ اسد محمد خاں کے افسانوں کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہر نیا قصہ ایک نئے تجربے کے ساتھ اس لیے آتا ہے کہ یہ حقیقت کو ہر رُخ سے جاننے اور ہر رنگ میں دیکھنے کی جستجو کا حاصل ہے۔ جب انسان خود کوئی فارمولا نہیں ہے تو آخر اس کے بیان کو کسی فارمولے میں کیوں کر ڈھالا جا سکتا ہے؟ اسد محمد خاں نے اصل میں اپنے کرداروں کو ان کے الگ الگ زمانوں اور الگ زمینوں میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ہر تجربے کے ساتھ نئی زمین نئے آسمان تراشنے کا عمل ہے۔ انسانی احساس کو پرت در پرت کھولنے کی آرزو کا سفر۔ نئے جہانِ معانی کی ہمہ وقت جستجو کا سفر۔ تو بس یہ ہے کہ ہمیں ایسے فن کاروں کو اپنے لگے بندھے فرمائشی پروگراموں کے ساتھ نہیں پڑھنا چاہیے بلکہ ان کے مطالعے میں اس آزادی کو روا رکھنا چاہیے جو انسانی زندگی کے داخلی مطالبات سے مرتب ہوتی ہے — اور ادب و فن اسی کے لیے اور اسی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔

اسد محمد خاں کا جہانِ فن

سیّد مظہر جمیل

اسد محمد خاں جدید اردو فکشن کے اسد اللہ خاں غالب ہیں۔ وہی گمبھیرتا اور تہ داری، سادگی و پُرکاری، مشکل پسند ایسے کہ بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹ جائیں اور سہل آفرینی پہ آئیں تو پیچیدہ سے پیچیدہ موضوع کو پانی کر دیں۔ بات کھری، فکر واضح لیکن تخلیقی رویہ ایسا ان بوجھا (unpredictable) کہ کچھ نہ کہا جا سکے کہ اگلا مصرع بھلا کیا ہوگا۔ غالباً غالب کا کمال یہ نہ تھا کہ وہ عالم موجودات کو امکانات کے چوکھٹے میں جڑ کر دکھا دیتا تھا کہ یہ کام تو ہر صاحب فن بقدر توفیق و استطاعت کرتا ہی رہتا ہے لیکن شاید اس کا کمال یہ تھا کہ گرد و پیش چمکتے ہوئے لب و عارض اور دمکتے ہوئے نقش و نگار کے درمیان سے ایسے ایسے مسخ شدہ چہرے اور کئی پھٹی صورتیں بھی ڈھونڈ نکالتا ہے جن کے خط و خال میں نہ کوئی توازن ہوتا ہے اور نہ تناسب، وہ معاشرتی اقدار کی مرکزی دیواروں اور تہذیبی ضابطوں کے ڈھکوسلوں کو منکشف کرتا تھا اور یوں سوشل اسٹیبلشمنٹ کو تکلیف دہ کچوکے لگاتا رہتا تھا، سب جانتے ہیں کہ انسانی سرشت اور سماجی ڈھانچے میں موجود تناقضات کا مشاہدہ اسی وقت ممکن ہوا کرتا ہے جب فن کار عالم موجودات کے آرپار دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو جو اسد اللہ خاں غالب میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

یہاں اسد اللہ خاں غالب اور اسد محمد خاں کے درمیان اشتراکات اور یکسانیت کی مثالیں تلاش کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف اس حسنِ اتفاق کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ دیکھیے صاحب ڈیڑھ دو سو سال کے فاصلے پر بھی دو فن کاروں کے درمیان فکری اور تخلیقی رویوں میں کس حد تک یگانگت اور مماثلتیں ممکن ہو سکتی ہیں! غالباً یہی وہ قدریں ہیں جو عرف عام میں ادب کی دائمی قدریں کہلاتی ہیں۔

آپ اب تک اسد محمد خاں کے افسانوں اور کہانیوں پر مشتمل تین مجموعے ملاحظہ فرما چکے ہیں یعنی 'برج خموشاں'، ''کھڑکی بھر آسماں'' اور 'غصے کی نئی فصل'' اور ان کہانیوں کے سواد فن سے ایک خاص اسلوب نگارش کو ابھرتا ہوا دیکھ چکے ہیں جو نوعی اعتبار سے ملٹی ڈائی مینشنل اور ''خط غبار'' میں معروضی سچائیاں بیان کرنے کا فن ہے جس میں لکھنے والا ذرا فاصلے سے لینڈ اسکیپ پر کیمرا فوکس کرتا ہے اور ہولے ہولے منظر کے بطون میں اترتا چلا جاتا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ اس کی کشیدکی ہوئی تصویر کے خطوط و نقوش، قوسیں اور دائرے تیکھی روشنی میں عریاں ہو جائیں بلکہ وہ ان سب کو قدرے التباس کے دھندلکے میں ملفوف رکھنا چاہتا ہے کہ اس کا موقلم خط غبار سے کہر زدہ فضا اور مدھم آتا رنگ کے منظر ابھارنا چاہتا ہے اور پھر لمحہ بہ لمحہ گلی کوچوں، بام و در اور گنبد و مینار کے ہیولے نمودار ہونے لگتے ہیں۔ اور قریب جائیے تو گھر، آنگن، چوبارے روشن و نیم روشن گوشوں میں سرسراتی سرگوشیاں واضح ہونے لگتی ہیں اور قاری ایک جیتے جاگتے ماحول اور فضا سے دوچار ہوتا ہے۔ جہاں نہ تو منظر ایک دم پھٹ پڑتے ہیں اور نہ کردار ایسے بے دھڑک ہیں کہ بلند آواز میں للکاریں مارتے نکل جائیں اور نہ ایسے بے زبان اور گونگے کہ مدعا عنقا ہو، ان کے عالم تقریر کا... جی نہیں۔ اسد محمد خاں مکالمے لکھنے کا فن جانتے ہیں اور اسی لیے وہ اپنے کرداروں سے تقریریں نہیں کرواتے، بلکہ حسب ضرورت ہی منہ کھولنے کی اجازت دیتے ہیں اور بس۔

''برج خموشاں'' اور ''کھڑکی بھر آسماں'' میں شامل کہانیوں میں التباس کی فضا درجۂ کمال پر فائز دکھائی دیتی ہے لیکن 'غصے کی نئی فصل'' میں یہ اسلوب قدرے تبدیل ہوا ہے دھندلکے کا غبار تحلیل ہوتا دکھائی دیتا ہے اور مناظر نسبتاً تیکھے انداز میں جلوہ گر ہونے لگے ہیں۔ وہ طویل اور مختصر مونولاگ اور انٹرو (entro) جو بالعموم اسد محمد خاں کی کہانیوں میں موجود ہوا کرتے تھے، اب ان کہانیوں میں موجود نہیں ہیں۔

اسد محمد خاں کی کہانیوں کے تازہ مجموعے ''نربدا'' میں شامل کہانیاں 'غصے کی نئی فصل'' سے آگے کی طرف بڑھتا ہوا قدم ہے۔ اس مجموعے میں شامل ایک درجن کہانیاں قدرے جداگانہ موسم اور مختلف فضا کی کہانیاں ہیں۔ وہ جو خط غبار کی کہر آلود فضا تھی، اب جگمگاتے ہوئے دن میں تبدیل ہو چکی ہے ہر چیز صاف صاف روشن روشن اور تیکھے پن سے نمودار ہو رہی ہے۔ ان کی طویل و مختصر کہانیاں جو اس کتاب میں شامل ہیں، مثلاً ''نربدا'' اور 'رکھوا اور تاریخ فرشتہ'' جیسی کہانیاں ان دنوں بہت کم لکھی جا رہی ہیں۔ یہ جتنی سیدھی سادی ہیں اتنی پیچیدہ اور تہ دار بھی ہیں۔ لہٰذا ان سے سرسری طور پر گزرنا ممکن نہیں۔

یہ کہانی دریائے ''نربدا'' (نرب دامیا) کو وست پڑا اور کوہ بندھیاچل کی وادی کی کہانی ہے۔ بھارت ورش کا دریائی خطہ مہاراشٹر کے ساونتوں، سادھوؤں، بٹ ماروں، ٹھگوں اور اٹھائی گیروں کا پتھریلا خطہ جسے نربدا اور اس کی معاون دریا، برساتی ندی نالے سیراب کرتے ہیں اور جہاں تمدنی معاشرے کی نشانیاں دور دور پھیلے ہوئے گاؤں اور قصبات میں بکھری ہوئی ہیں اور معاشرہ بھی وہ جو طاقت کے بل بوتے پر کھڑا ہوا ہے کہ جیسے ہی کوئی قصبہ طاقت کے محور میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر وہ آس پاس کے علاقے کے لیے مرکز کشش ثقل کے مترادف ٹھہرتا ہے کہ ہر کوئی اسی سمت کھنچا چلا جاتا ہے تحفظ کی خاطر، گزر بسر کی خاطر، ترقی اور آگے بڑھنے کی خاطر ''نربدا'' کی کہانی بھی بس اتنی ہی تو ہے کہ ایک بیل گاڑی میں باپ، بیٹا اور ایک بے یار و مددگار زخمی مسلمان لڑکی خاندیش کی بستی مانڈو کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ باپ کنور نا رنگ سنگھ اوٹینی اور بیٹا کنور کرما رنگ سنگھ اوٹینی، غربت زدہ، مفلوک الحال اور نحیف و نزار ہونے کے باوجود بہادر اور ساونت طبقوں کے مالک ہیں، لڑکی گو ہے

زخمی لیکن وہ بھی بہادر ہو رگھڑ سواری سے نیزہ زنی تک سب جانتی ہے۔ لڑکی کی شناخت چھپانے کے لیے راجپوتی لنگر لہنگا پہنا دیا گیا ہے۔ زمانہ شیر شاہ سوری کا ہے۔ اسد محمد خاں کا پسندیدہ زمانہ جس کی کہانیاں سنانے کو عموماً ان کا جی کیا کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے سوری خاندان کا عہد اور خاص طور پر شیر شاہ سوری کا زمانہ حکومت اسد محمد خاں کے لیے ایک obssession کا درجہ حاصل کر چکا ہے کہ ان کی کئی کہانیوں میں شیر شاہ سوری کے عہد کو امن و امان اور عوامی بہبود کی علامت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ایسی کہانیاں ''غصے کی نئی فصل'' میں بھی شامل ہیں اور ''نربدا'' میں بھی۔ اور کیوں نہ ہوں کہ بقول اسد محمد خاں شیر شاہی بندوبست (کم رفتاری سے سہی) خاندیش کے بدحال مزارعوں تک پہنچنا شروع ہو گیا تھا۔ ان کے بادشاہ میاں مبارک شاہ نے سلطان عادل کی اطاعت قبول کر لی تھی اور اپنی بیٹی کا ڈولہ شیر شاہی حرم میں پہنچا دیا تھا مگر بادشاہوں کے دستور کے مطابق شیر شاہ نے مبارک شاہ کی بیٹی کو ملکہ نہیں بنایا، فرمان جاری ہوا کہ یہ شاہ زادی اب سلطان عادل کی منہ بولی بیٹی ہے اسے ملک مالوہ و بندیل کھنڈ کے فلاں علاقے میں خاصے کے فلاں فلاں گاؤں عطا کیے جاتے ہیں۔ اس طرح خاندیش والوں نے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے کہ ملک پنجاب اور دوآب کی طرح ان کے کھیتوں میں بھی اب سونا اُگنے لگے گا۔

راستے میں بٹ ماروں سے بچتے بچاتے اور ڈکیتوں، ٹھگوں سے مقابلہ کرتے کراتے وہ سفر جاری رکھتے ہیں راہ میں تینوں اپنی اپنی بہادری کے جوہر دکھاتے ہیں۔ چند ڈکیت/ ٹھگ کھیت رہتے ہیں اور باقی کو بھاگتے ہی بنتی ہے۔ آگے بھی گھاٹ چوکی پر ایک اور ''پکھیا'' ان کا رستہ دیکھتی تھی... گھاٹ پر ایک ہی کشتی تھی راہ کا چپہ اتوڑ کے چنڈالوں نے پتھر پور دیے تھے.. گھاٹ کے چوکیداروں کو ٹھگوں نے کچھ کھلا پلا کے مار ڈالا تھا اور یوں گھاٹ پر قبضہ کر لیا تھا اور ہر آنے جانے والوں کو لوٹنے اور جان سے مار کے دریا میں بہانے لگے تھے... یہی نہیں بلکہ بٹ ماروں نے کنارے کے گاؤں جل وڈی میں ایک بدھوا عورت اور اس کے بچوں کو یرغمال بنا رکھا تھا اور ایک عرصے سے اس مظلوم گھرانے پر ظلم کرتے چلے آتے تھے اور پورا گاؤں ان مظالم سے اَن جان سا بنا رہا تھا کسی کی ہمت نہ تھی کہ بٹ ماروں کو ٹوک دیتا یا مظلوموں سے ہم دردی کے دو بول ہی بول لیتا، یہ تو بعد میں ایک پاگل شخص راز کھول دیتا ہے کہ گاؤں کا کھیا جو بساطی کی بیوہ اور بچوں پر ہوتے ہوئے ظلم سے آگاہ تھا اور اس نے جان بوجھ کر اس ظلم کی اطلاع سرکاری عمال کو نہ ہونے دی تھی اور وہ بیوہ کو ورغلاتا تھا کہ وہ دوبارہ ہندو دھرم اختیار کر کے کھیا سے شادی رچا لے تو اس کی حفاظت کی جائے گی!

''بابا، بابا''، سارنگ نے باپ کے شانوں کو اپنی مٹھی کی گرفت میں لے لیا۔ ''بابا اسی گلوڑی جندوں کا گاؤں نہیں، مرے مردوں کا گاؤں ہے مردے تو اس کرتے ہیں ادھر پہلے میں سمجھا تھا، اس گرام میں ہیجڑے بستے ہوں گے، اس کارن گھسہ کرتا تھا، پر اب سمجھا ہوں، اسے جندوں کا گاؤں نہیں، مسان ہے ہم چار بلاو ہے نکل آئے ادھر کو''

صبح ہوئی تو لڑکی نے گاؤں کے چھوٹے کنویں سے جو ڈھیڑوں، چماروں، پاسیوں کے لیے اور بساطی کے گھر والوں کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا، پانی لاتی ہے اور باپ بیٹے کے مشورے سے سب کے لیے روٹی پکاتی ہے۔ بابا جو چھوت چھات کا قائل تھا اب اس کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی اور اپنے ساتھ بساطی کے لڑکے کو لے کر گاؤں کے بڑے کنویں پر جا براجتا ہے۔ بڑا کنواں جو گاؤں کی تین اونچی جاتیوں کے لیے مخصوص تھا، اور دوسری جاتی والوں کو ادھر پھٹکنے تک کی بھی اجازت نہ تھی، وہاں بوڑھا کنور ا رنگ سنگھ بساطی کے لڑکے کو سب گاؤں والوں کے سامنے بٹھا کر روٹی کھاتا ہے اور بساطی کے لڑکے کو محبت بھری ڈانٹ بھی دیتا ہے کہ ''کیوں رے تجھے بسملا بولنا کوئی نہیں سکھائی رے....'' اور اس طرح وہ جات پات کا ماننے والا جات پات کے بنائے ہوئے قاعدوں کو توڑ دیتا ہے کہ یہ وقت چپ سادھ کے اپنے آپ کو مردوں میں شمار کرانے کی بجائے مظلوموں کا ساتھ دے کر زندگی کا ثبوت دینے کا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ اسد محمد خاں کی کہانی کی تلخیص ممکن نہیں ہوتی اور اگر تلخیص کر بھی لی جائے تو کہانی میں موجود تاثر کے جوہر کی تلخیص کیوں کر ممکن ہو سکے گی۔ بھلا خوشبو کی بھی کہیں، تلخیص ہوا کرتی ہے؟ رنگ کا خلاصہ کیا ہوگا؟ یہاں تو تاثر کی خوش بو دراصل کہانی کے بطن سے پھوٹ رہی ہوتی ہے۔ اسد محمد خاں کہانی کو پلاٹ واقعے، کردار، مکالمے اور منظر نگاری کے خانوں میں رکھ کر نہیں سوچتے حالاں کہ یہ سب عناصر ایک اچھی کہانی میں برحق ہوتے ہوئے بھی ایک ''کل'' کی میکنزم کا حصہ ہوتے ہیں۔ جدا گانہ اور علاحدہ علاحدہ ان کی کوئی حیثیت نہیں کہ انھیں آپ چٹکی سے پکڑ کر دکھا دیں کہ صاحب دیکھیے یہ ہے اسد محمد خاں کی کہانی میں منظر نگاری کا عالم! اور یہ رہے مکالمے! اور کردار! ایسا کرنے سے وہ تاثراتی فضا جو اندرونی میکنزم کے اشتراک عمل سے پیدا ہو رہی ہوتی ہے دیکھتے دیکھتے ہوا ہو جاتی ہے۔ اور قاری صرف ہچے کرتے رہ جاتا ہے۔ اسد محمد خاں کی کہانی میں جو ایک فطری بہاؤ ہوتا ہے وہ دراصل ان تشکیلی عناصر کے امتزاج ہی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے اور اسی امتزاج سے وہ ایک متحرک بیانیہ لکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اسد محمد خاں کی کہانی میں زبان بھی ایک کردار ادا کرتی دکھائی دیتی ہے۔ یعنی ترسیل معنی کے ساتھ ساتھ وہ فضا بندی کا کام بھی کرتی جاتی ہے... ''لہنگے''، ''لگڑے''، ''آنگے''، ''دھوتیاں''، ''چولیاں''، ''چنریاں''، ''گھریاں''، بے شک مجرد الفاظ ہیں مگر ان کا کلچرل کردار بھی...

...''تھپڑ مار کے سر سے دانت جھاڑ دوں گا کوکری کے جنے! کھیا ہے تو کہ بدجناوروں کی بھڑوت کرتا ہے سوری کے کلنک!'' بوڑھے مارنگ سنگھ کی آواز جیسے کنویں کی جگت پہ گراتی ہوئی تھالی تھی جو باہر کے پھیلاؤ اور اندر

کی گہرائی میں بہتی چلی جا رہی تھی...

اس پورے ٹکڑے میں زبان کی فعالیت ایک ایسے متحرک منظر نامے کو جنم دے رہی ہے جو ایک طرف کہانی کے تاثر کو گہرا کرتا ہے اور دوسری طرف ایک تہذیبی ماحول کو ابھارتا ہے۔ کنویں کی منڈیر پر گہری ہوتی تھالی کی آواز ایک مخصوص ثقافتی ارتعاش بھی پیدا کر رہی ہے۔ زبان ظاہر نے وہ لکھی ہے کہ لگتا ہی نہیں کہ ہمارے عہد کا کوئی اسد محمد خاں کہانی سنا رہا ہے بلکہ سمجھو کہ اسی عہدِ وسطیٰ کا کوئی کتھا گر ہے کہ جو کہانی سنا رہا ہے۔

زبان کے ثقافتی تفاعل کی ایک اور مثال ان کی طویل مختصر کہانی ''رگھوبا اور ''تاریخِ فرشتہ'' سے ملاحظہ فرمائیے:

> ...مجھ خادم کو دارالخلافہ میں کچھ روز وسعت اور عافیت کے مل گئے تھے۔ میں نے کچھ وقت چچا قاسم کے کنبے کے ساتھ گزارا اور چچا سے ایک بار خود خواہش کی۔ کہا کہ میں حضرت سلطان جی کے دربار میں حاضر ہو کر سلام کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں، چچا بہت خوشی سے مجھے دربار میں لے گئے مگر میرے نصیب کی محرومی دیکھیے کہ حضرت مراقبے میں تھے اور اس طرح میں دیدار سے اس بار بھی مشرف نہ ہو سکا۔ حضرت کی پاپوشیں جہاں رکھی جاتی ہیں بس اس جگہ کو غلام نے دونوں ہاتھوں سے مس کیا، ہاتھ اپنی چھاتی سے لگا کر دل کو ٹھنڈک پہنچائی اور حضرت محبوبِ الٰہی کے تخت کو سلام کرتا لوٹ آیا...

اب ایک بالکل بدلا ہوا منظر بھی دیکھ لیجیے۔ دیکھیے یہاں زبان کیا گل کھلاتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے ''ایک میٹھے دن کا انت'' سے ماخوذ یہ ٹکڑا:

> وڈی نے لنڈے کو آواز دی مگر فوراً ہی اسے یاد آ گیا کہ لنڈا کسی ''مہمان'' کے پاس نہیں جائے گا۔ اس کے باپ نے سختی سے منع کر دیا ہے۔ اس لیے جب لنڈا ''جی وڈی جی'' کہہ کے سامنے آیا تو وڈی نے دھیرے سے کہا، ''کچھ نہیں پتر، پانی پلا دے۔'' چاہتی تو وہ یہ تھی کہ لڑکا ہارن والے کے پاس جائے اسے انتظار کرنے کو کہے، کچھ باتوں میں الجھائے تاکہ وہ فلیٹ میں آنے کا خیال دل سے نکال کے گاڑی ہی میں بیٹھا رہے۔ وہیں انتظار کرے روزی کا۔ کتنا اچھا ہوتا ہے اگر یہ مردار نیچے جا کے اسے باتوں میں الجھا سکتا مگر اس کا باوا صاف لفظوں میں کہہ گیا تھا کہ ''دیکھو بائی جی، ہم مردے گاڑنے والے، کدال اور پھوڑا چلانے والے لوگ ہیں۔ ہاتھ پاؤں کی مجوری ہمارے لنڈے سے جتنی مرجی آئے لے لو پر اگر ہم نے کسی آنے جانے والے سے بات کرتی دیکھ لیا اسے تو ایمان سے ایک ملت ادھر نہیں چھوڑیں گے۔ لے جائیں گے بالکل۔ برا مت منانا، بھلے سے کفن چور بن جائے ہم سرا۔ دلال نہیں بنے دیں گے۔ ہاں بس خیال رکھنا، گھر والوں کے سوا کسی سے بات نہ کرے لنڈا، نہیں تو ایمان سے ہم لے جائیں گے۔''

اچھا اب اگر میں چاہوں تو اسد محمد خاں کی ہر کہانی سے ایک ایک ٹکڑا پیش کر دوں جس میں ایک جداگانہ اسلوب ابھر رہا ہوگا۔ بے شک اسد محمد خاں ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا ہنر جانتے ہیں لیکن اپنی اس ہنر مندی کو موقع محل کے تابع بھی رکھتے ہیں جو ہنر جاننے سے زیادہ مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اسد محمد خاں گویا زبان کی ٹونڈری کھولے بیٹھے ہیں جس میں سے خام سیال کہانی کے سانچے میں ڈھلتا چلا جاتا ہے بغیر کسی کوشش اور تگ و دو کے۔

اسد محمد خاں سہل انگار اور تفریحِ طبع کے لیے پڑھنے والوں کے لیے نہیں لکھتے کہ ایسے لوگوں کے لیے سستی جذباتی کہانیاں اور ڈائجسٹ کافی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے قاری سے کم از کم اتنی توجہ ضرور چاہتے ہیں کہ وہ ان کی انگلی تھامے، ان کے لکھے ہوئے بیانیے کی گلی کوچوں میں شروع سے آخر تک گھومے اور خود کو ان کے حوالے کر دے اور دیکھے کہ وہ اسے کن وادیوں یا گھاٹیوں میں پہنچاتے ہیں۔ سہل انگاری وہ نہ تو خود برتتے ہیں اور نہ اپنے قاری کو اس کی اجازت دیتے ہیں۔

اسد محمد خاں کی کہانی اگر دل جمعی کے ساتھ پڑھ لی جائے تو ہر بار اس کی ایک نئی پرت کھلتی چلی جاتی ہے اور اسی اعتبار سے انہیں ملٹی ڈائی مینشنل فن کار کہا جاتا ہے مثلاً ان کی کہانی ''نربدا'' کم از کم تین سطحوں پر کلام کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ پہلی سطح تو وہی اس کی محاکاتی اور واقعاتی ماجرائیت ہے جس کے دامن میں اسرار اور حیرت کی کئی دنیائیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ واقعے کی چول چول ایک دوسرے میں پیوست، کہیں کوئی جھول، کوئی تضاد اور تصادم اور انتشار نہیں ہے۔ کہانی ہولے ہولے کھلتی جاتی ہے۔ کردار، منظر نگاری، مکالمے سب اپنی اپنی جگہ چست اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ ایک دلچسپی کا عالم ہے جو شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔

دوسری سطح اس کہانی کی وہ ہے جہاں ایک خاص معاشرتی میٹرازم اور ثقافت کی نقاب کشائی ہو رہی ہے۔ رہن سہن، عادت و اطوار، طور طریقے، ایک دوسرے سے برتاؤ، اندازِ گفتگو، بول چال اور اردگرد کی صورتِ حال اور

ماحول سے مل جل کر ایک تصویر بنتی ہے جس سے ایک مخصوص تاثر ابھرتا ہے کہ دراصل یہ تاثر آفرینی ہی کہانی کار کا مقصود بھی رہا ہے۔ یعنی ایک خاص عہد کی اُس کی ثقافتی فضا اور ماحول کے ساتھ بازیافت کرنا۔

کہانی کی تیسری سطح اس سوال کے جواب میں مضمر ہے کہ آخر آج کے معروضی صورت حال میں اس کی کوئی relevance بھی بنتی ہے یا نہیں۔ اور اس نکتۂ نگاہ سے اس کی کوئی معنویت قائم ہوتی بھی ہے کہ نہیں۔ اس اعتبار سے ''نربدا'' کو دیکھیے تو مجھے یقین ہونے لگتا ہے کہ اسد محمد خاں نے یہ کہانی گجرات، مدھیہ پردیش اور بندھیا چل کے علاقے میں پھیلتے ہوئے مذہبی جنون اور سیاسی خلفشار سے اٹھنے والے متعدد سوالات کے جواب دینے کے لیے لکھی ہے وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ مذہبی جنون صرف بٹ ماروں اور ٹھگوں کو پناہ دے سکتا ہے جن کا اپنا کوئی دھرم ایمان نہیں ہوتا، سوائے قتل و غارت گری اور لوٹ مار کے۔ یہ کہانی ہمیں بتاتی ہے کہ چھوت چھات اور جات برادری کا ڈھکوسلا، محض کم زوروں کو قابو میں رکھنے والوں کی خدمت گزاری کے لیے بنایا جاتا ہے اور انھیں کے تصرف میں لایا جاتا ہے اور ایک ایسے ماحول میں جب ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرنے کی روایت دم توڑ چکی ہو تو اس وقت نہتے، کم زور اور نحیف مگر بہادر لوگ ہی جرأت آزما انکار کی صدا بلند کرتے ہیں جس کی بازگشت مدتوں سنائی دیتی ہے۔ میرے نزدیک ''نربدا'' کے افتتاحی کلمات ہی اس کے اختتامیہ کلمات بھی ہیں۔ اسد محمد خاں نے لکھا ہے ''ابھی کوئی کہتا تھا کہ ساونت اور دلاور ختم ہوتے جا رہے ہیں، endangered species میں سے ہیں۔ یہ بھی سنا تھا کہ بالکل ختم ہوگئے۔ ڈوڈو پرندے کی طرح اور اگر کہیں ان کا ذکر ملتا ہے تو بس فسانوں، کہانیوں میں۔ مارکیٹ اکانومی اور کنزیومر ازم اور احتیاج اور ازلی خودغرضی اور خوش ہوا سیر اور ریموٹ کنٹرول نے انھیں بالآخر مٹا دیا۔ اس لیے ان پر اصرار anachronism پر اصرار کرنا ہے'' لیکن پھر یہ کہانی کیا ہے؟ کیا یہ ساونتوں کے وجود پر اصرار نہیں کرتی...؟

مجھے اسد محمد خاں کی طویل کہانی ''رگھوبا اور تاریخ فرشتہ'' بھی سیاسی اور سماجی تناظر کی کہانی محسوس ہوتی ہے۔ حاشیے پر بیٹھے ہوئے آدمی کا مقدر کل بھی محض تاریخ کی کھاد بننے تک ہی محدود تھا اور آج بھی اسی حد تک محدود ہے۔ تاریخ میں اس کا کردار خواہ کچھ بھی رہا ہو اسے تاریخی کتب کے صفحات میں اس وقت تک جگہ نہیں مل سکتی جب تک وہ ''فلاں ابن فلاں'' نہ بن گیا ہو۔ ایک عام آدمی اس وقت تک عام آدمی ہی بنا رہتا ہے جب تک وہ اپنے عہد کے ''مقتدرہ'' (establishment) سے رشتے ہموار نہیں کر لیتا اور مقتدرہ ادارے بھی اسے قبول نہیں کر لیتے۔ خواہ اس کے لیے اسے اپنی ذات اور شناخت ہی کی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ اس سلسلے میں آدمی کے نسبی رشتے بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتے کہ تاریخ کی غلام گردشوں میں تو جاہ پسندی باپوں سے بیٹوں کے سر اترواتی رہی ہے اور بیٹے بھی باپوں کی لاشوں کو روندتے ہی رہے ہیں، مغل سلطانی کے تخت و تاج سلامت، بھلا بھائی کو بھائی کی کھال اترواتے میں عار کب محسوس کیا جاتا تھا اور کیا جاتا ہے!

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی تاریخی کہانی کا آج کے معروضی سوالات سے کوئی ربط relevance پیدا ہوتا ہے؟ اس کا جواب ہے جی ہاں۔ بشرطے کہ لکھنے والا گزرے ہوئے زمانوں کی کہانی سناتے ہوئے اپنے عہد کی معروضیت کے ساتھ تعلق پیدا کرنے میں کامیاب رہا ہو اور ان دونوں قسم کی کہانی میں فرق کیا ہوتا ہے؟ بس وہی جو عزیز احمد کی تاریخی کہانی اور جناب ایم اسلم صاحب کی تاریخی ناول میں ہے اور فرق کیا ہوتا ہے بھلا؟

اسد محمد خاں اپنی تاریخی کہانی میں مواد اور پس منظر تو بے شک عہد قدیم ہی سے لیتے ہیں لیکن ان کی کہانی واشگاف الفاظ میں ہمیں بتا دیتی ہے کہ وہ تاریخی کتاب میں لکھی گئی حقیقت نہیں بیان کر رہے ہیں بلکہ اس عہد کو دوبارہ تخلیق کر رہے ہیں اور اس طرح تخلیق کر رہے ہیں کہ اس میں ان کے اپنے عہد کی جھلکیاں بھی نمایاں ہو رہی ہیں۔ اور آپ ماضی کے آئینے میں اپنے عہد کے چہرے پر پڑی جھریاں دیکھتے چلے جاتے ہیں۔

اسد محمد خاں جس ملائمت اور دھیرج سے کہانی کا آغاز اٹھاتے ہیں، اس کا اختتام بھی ویسے ہی سبک انداز سے ہوجاتا ہے۔ نہ کوئی دھماکا نہ کوئی بینگ (Bang)۔ ہاں ایک ہلکے سے ارتعاش کی کیفیت ضرور رہتی ہے۔ چونکا دینے والی بات جو ہمارے بعض معتبر اور طرح دار افسانہ نگاروں کی امتیازی خوبی ٹھہری ہے اسد محمد خاں کے ہاں نہیں ملتی... منٹو کا دھماکا خیز اختتامیہ بھلا انھیں نصیب کہاں! اور نہ ویسے شعلہ صفت مواد سے انھیں کوئی سروکار ہے۔ حالاں کہ اس کے اِکا دُکا موضوعات ان کا بھی رستہ کاٹ جاتے ہیں لیکن یہ اُن سے بس اپنے ہی انداز میں نمٹ لیتے ہیں... دیکھیے کوٹھا منٹو کے ہاں بھی تھا، اور بہت خوب تھا۔ کوٹھے، اسد محمد خاں کی بعض کہانیوں میں بھی کھلتے ہیں، (صبیاں والیاں... ایک بیٹھے دن کا انت) مگر دونوں جگہ فضا مختلف اور ماحول جدا جدا ہے۔ منٹو کچھ اور دکھاتا تھا، یہ کچھ اور دکھانا چاہتے ہیں۔ منٹو دھندے کے رموز بتاتا تھا، وہ دنیا کے قدیم ترین پیشے کے بھاؤ بھید بتاتا تھا کہ اس کے پرانے کردار احتداد زمانہ سے کیا کیا روپ بہروپ بنائے بیٹھے ہیں۔ وہ بے شک ہنرمند آدمی تھا جو معمولی سی معمولی بات میں بھی کوئی انوکھا پن ڈھونڈ نکالتا تھا کہ یہی اس کا فن ٹھہرا تھا۔ اسد محمد خاں کے کوٹھوں پر دھندہ دکھائی نہیں دیتا، یہ دھندہ کرنے والوں سے زیادہ دھندہ کرنے والوں کا مرنا جینا، اٹھنا بیٹھنا، اُن کے مینر ازم اور طور طریقے دکھاتے ہیں۔ دراصل منٹو خاص الخاص اور انوکھے کرداروں کا فن کار تھا، جب کہ اسد محمد خاں گرداب میں پھنسے ہوئے عام آدمی کا مصنف ہے۔

وہ ایسے عام آدمی کا مصنف ہے کہ جسے وقت کی کھور دھارا بہائے لیے جاتی ہے اور اسد محمد خاں کا فن وقت کے اسی کھور دھارے کو اسیر کرنے کا فن ہے۔

منٹی دادا

اسد محمد خاں

ملیا کے تین ناموں کی طرح منّی دادا کے بھی تین نام تھے: مجیتا، مجید اور منّی دادا۔ مجیتا کہنے والے ان کے سامنے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مجید، یا ارے ملی مجید کہنے والے دو تین بڑے بوڑھے ان کے بعد بھی کچھ دن زندہ رہے۔ باقی تمام لوگوں کے لیے، سارے شہر، سب زمانوں کے لیے وہ منّی دادا تھے۔

خود منّی دادا کا بیان تھا کہ ان کا اصل نام لبدل مزید کھاں لیسپ جئی ہے۔ چٹاں چہ پولیس کے مشیر ناموں، راشن کارڈوں، سرکاری اسپتال کے کاغذوں اور آخر میں قبرستان کے رجسٹر میں ان کا نام عبدالمجید خاں یوسف زئی لکھا گیا۔ اگر ان کا کوئی وارث ہوتا تو لوحِ مزار پر بھی عبدالمجید خاں یوسف زئی ہی لکھا جاتا۔ اس لیے کہ ان کی وصیت یہی تھی۔ منّی دادا کے بارے میں محلے کے دھوبیوں نے اڑا رکھا تھا کہ وہ ذات کے ہندو تیلی ہیں اور ان کی مسلمانیاں تک نہیں ہوئی ہیں۔

دھوبیوں کی اس حرمزدگی کی وجہ خود منّی دادا یہ بیان کرتے تھے کہ جوانی میں دھوبیوں کے سلسلے میں ان سے کچھ لغزشیں ہوئی تھیں اور یہ بدذاتوں کی اولاد اب ان باتوں کا انتقام لے رہی ہے۔

دھوبی محلے میں ان کی تگ و تاز کے بارے میں مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ جوانی میں منّی دادا دیکھنے دکھانے کی چیز تھے اور یہ کہ ان کی آخری محبوبہ جمرت دھوبن سنہ ۱۹۶۵ء میں ۷۰ سال کی ہو کر مری ہے۔

میں نے ڈبا کیمرے سے کھینچی ہوئی بادامی رنگ کی ایک بوسیدہ تصویر بھی دیکھی ہے، جس میں اٹھارہ بیس برس کے منّی دادا کان کی لو تک پہنچی ہوئی لوہا جڑی لاٹھی تھامے، نا راسی آنکھوں میں بہت سا سرمہ بھرے ایک زبردست پگڑ باندھے کیمرے کو گھورتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ منّی دادا کی یہ تصویر مرحوم پھوپھا ابا کی کھینچی ہوئی ہے جنھوں نے شہر میں سب سے پہلے سنہ اٹھارہ سو کچھ میں بمبئی کی کسی پارسی فرم سے کیمرے کا وی پی پارسل منگوایا تھا۔ خاندان کے اسکینڈل باز بوڑھوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ منّی دادا، پھوپھا ابا مرحوم اور ان کے یاروں دوستوں کے لیے اغوا کی وارداتیں کیا کرتے تھے اور ارباب نشاط سے رابطے قائم کراتے تھے۔ مگر یہ بڑی خباثت تھی۔ پھوپھا ابا کھرے پٹھان اور حافظِ قرآن تھے اور منّی دادا تو تھے ہی یوسف زئی، ایسی گھٹیا باتیں ان کے دائرۂ خیال میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ لوگ کہتے ہیں پھوپھا ابا نے انھیں ایک تپنچا خرید کر دیا تھا جسے چلانے کی نوبت تو شاید کبھی نہ آئی ہو مگر دھمکانے کے کام ضرور آتا تھا۔

میں نے اکثر منّی دادا سے اس تپنچے کا ذکر سنا ہے۔ تقسیم ملک سے بہت پہلے کسی حرامی ازل گربھتا بھان کے گھوڑے نے اسے چرالیا اور دھوبیوں نے اڑا دیا کہ چرانے والے نے یہ تپنچا تین ڈبے بھوسی ٹکڑے والے کو نستہ گیگ کے بدلے میں تلوادیا ہے۔ منّی دادا تپنچے کے واقعے پر مل کر رہ گئے تھے اور پولیس میں رپورٹ لکھانے چلے تھے مگر لوگوں نے سمجھایا کہ کیا غضب کرتے ہو، پولیس کو ہوا بھی نہ لگے، بلا لائسنس کا ہتھیار تھا، الٹے چکر میں پڑ جاؤ گے۔ مجبوری تھی۔ منّی دادا خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ بعد میں کئی برس تک اس انتظار میں رہے کہ بس مجھے پتا چل جائے کہ میرا تپنچا کس سالے کے کنے ہے۔ آنتیں نکال کے اس ازل گربھتا بھان کے گھوڑے کے گلے میں پنادوں گا۔

آنتیں نکال کر گلے میں پہنا دینا ان کی پسندیدہ دھمکی تھی اور ''اجل گرفتہ'' انھوں نے میرے چچا سے سنا تھا جو اس زمانے میں زور زور سے طلسم ہوش رُبا پڑھ کر ہم سب کو سنایا کرتے تھے۔

منّی دادا کا خیال تھا کہ ''یہ جو'' طلسم ہوش رُبا اور قصہ طوطا مینا اور انوار سہیلی وغیرہ ہیں یہ سب ٹھیک ہیں مگر انگریزی تعلیم جو ہے یہ آدمی کو 'نامرد' بنا دیتی ہے... یہ لفظ وہ بزدل کے معنوں میں استعمال کرتے تھے اور اکثر بڑے تأسف سے کہا کرتے تھے کہ غضب خدا کا، جب سے ان پٹھان بچوں نے انگریزی پڑھنا شروع کی ہے اس خاندان کے لوگوں نے کوئی ''کتل'' ہی نہیں کیا۔

ایک بار ابا نے یہ بات سن لی اور انھیں ایسی ڈانٹ پلائی کہ سب سے چار دن تک روٹھے رہے کسی سے بات نہیں کی۔ آخر پانچویں دن مجھے اشارے سے بلا کر رازدارانہ انداز میں کہنے لگے کہ تیرے باوا کی کڑھ جا کے خراب ہوئے ہیں، پہلے ایسے نہیں تھے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہم نے ایک قاعدے کی بات کہی اور وہ بگڑ گئے۔ ''بلاوجے۔''

مگر یہ طے تھا کہ ابا کو اور ہم سب، بہن بھائیوں کو ان سے جتنی محبت ملتی تھی، دوسروں کو اس کی آدھی بھی نصیب نہیں تھی۔ ویسے مجموعی طور پر وہ پورے کنبہ قبیلے کے عاشق تھے۔ مجھ سے کہتے تھے کہ میں تیرے کنبہ قبیلے کے ''ساکھ بجر'' کا ماہر ہوں اور یہ کہ ''ایسا چاروں کھونٹ ساکھ بجر'' میں نے کہیں اور نہیں دیکھا۔

''ساکھ بجر'' سے ان کی مراد شجرۂ نسب ہوتی تھی مگر ''چاروں کھونٹ ساکھ بجر'' کیا ہوتا ہے یہ نہ میں نے کبھی پوچھا نہ انھوں نے کبھی بتایا۔

اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ میرے کنبے کی حد تک منّی دادا علم اسم نویسی کے ماہر تھے۔

اس مرحوم خاندان میں بڑوں کا طریق کار یہ تھا کہ جوں ہی لڑکا اپنا پورا نام لکھنے کے قابل ہوا اس کا دادا، نانا، باپ یا چچا اسے شجرۂ نسب کی ایک وصلی تھما دیتے تھے کہ لو بیٹا، سنبھال سنبھال کے اس کی سو نقلیں تو بنا دو۔ ظاہر ہے کہ کلک اور گاڑھی سیاہ روشنائی سے لمبے لمبے کاغذوں پر یہ شاخ شجر بنائے جاتے

تھے۔ پنسل، فاؤنٹین پین، فولادی نب وغیرہ سے پرکھوں کے نام لکھنا سخت بے ادبی بلکہ مداخلت فی الدین بھی جاتی تھی۔ انھیں درست طریقے سے بنانے میں مہینوں لگ جاتے تھے مگر یہ ایک طے شدہ طریق کار بلکہ پیدائشی جبر تھا جس سے بچنا ممکن نہیں تھا۔ شاخ شجر مکمل ہو جاتے تو خاندان کا اس دور کا پیٹری آرک، لنڈوں کو بلا کر ان کی کارکردگی ملاحظہ کرتا اور تمام کلمے، الحمد شریف اور چاروں قُل سننے کے بعد پہلے اس لڑکے کی تین لائن پھر پانچ لائنیں زبانی سنتا اور ایک روپیا کا مدار عطا کرتا تھا۔ درمیان میں بھول جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے کہ مہینوں تک فلاں محمد خاں کے بیٹے فلاں محمد خاں اور ان کے بیٹے فلاں محمد خاں خوابوں تک میں تلواریں لیے ٹہلتے پھرے تھے۔ انھیں بھول کون سکتا تھا۔

دوسرے پیٹری آرکوں کے برخلاف میرے دادا لنڈوں کی بدخطی کو نظر انداز فرماتے تھے۔ مگر لنڈے بندہ بشر ہوتے ہیں۔ اگر غلطی سے ابن محمد خاں کے بیٹے اُن محمد خاں کی بجائے ''وہ دوسرے'' محمد خاں لکھ دیا اور دادا کی نظر پڑ گئی تو سمجھو مارے گئے۔ انگلیوں پر کلک تقریباً توڑ دیے جاتے تھے کہ سور، میرے مگر مشکور دادا کو ولد الحرام بتا رہا ہے! اس وقت ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس قدر خفا ہونے کی کیا بات ہے ہم درست کیے لیتے ہیں... مگر اب کچھ کچھ سمجھ میں آتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ ان سب کے یہاں یہ شدت کس لیے تھی۔ شاید اپنی زادبوم سے ہزار میل دور اور سیکڑوں برس کے بُعد میں، یہ پشتون قبیلہ جو اپنی زبان بھی بھول چکا تھا، کاغذوں پر اپنے نسب کے تحفظ کی ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا تھا۔

اس لیے کہ لوگ کبھی کبھی شیخوں، مغلوں میں بھی شادیاں کر لیتے تھے اور بعضے تو اتنے بے ادب تھے کہ سیدوں تک کی بیٹی لے آتے تھے۔ معاذ اللہ۔ آلِ رسولؐ سے خدمتیں لینا اور کبھی کبھی سخت سست کہہ دینا... اس بے ہودگی کا تصور ہی بدنوں میں لرزہ طاری کرنے کے لیے کافی تھا۔

تو دوسری اولادِ نرینہ کی طرح اس اذیت سے، کہ جو ہمارے یہاں ختنہ ہی کی طرح لازمی تھی، مجھے بھی گزرنا پڑا۔ عالمگیر بادشاہ کے عہد سے میرے ہوش سنبھالنے تک آٹھ پیڑھیاں بھگتانا بظاہر کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مگر وہ سپاہی لوگ تھے اور پھر ان زمانوں میں خاندانی منصوبہ بندی کا کوئی واضح تصور موجود نہیں تھا۔ چناں چہ میں چیں بول گیا، مثلاً فلاں محمد خاں کے پانچ بیٹے، ان پانچ بیٹوں کے مجموعی طور پر اٹھائیس انتیس بیٹے (جن میں بمشکل ایک دو لاولد) باقی ستائیس اٹھائیس کی اتنی اولادیں اور ان کے اتنے اتنے نونہال... اور معلوم ہوتا تھا ابھی ہم چار پیڑھی ہی اترے ہیں کہ ایک وضاحتی شجرہ اور تھما دیا گیا کہ ذرا اب ماؤں کی طرف سے ان چاروں پیڑھیوں کا حساب تو کر لو۔

اور یہاں سے ایک تہ دار عذاب مزید شروع ہوتا تھا۔ اس لیے کہ کہیں خال خال انحراف کے سوا یہ خاندان آپس میں ہی شادیاں کرتا رہا تھا کیوں کہ ہڈی اور خون کے تحفظ کا سوال تھا اور اس بات نے میرے لیے ایک عجیب صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ یعنی ایک رشتے سے جو صاحب میرے دادا یا نانا ہیں وہ دوسرے حساب سے چچا اور تیسرے ذرا دور کے رشتے سے، ماموں ہوتے ہیں اور اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں... کئی ہزار کاغذوں پر اسی طرح لکھا ہے۔ اور اب جو یہ صاحب میری پھوپھی کی صاحب زادی سے شادی کرنے پر تلے ہیں تو یہ میرے بہنوئی بن جائیں گے اور ذیلی شاخ شجرہ، جدول پانچ کے حساب سے دیکھو تو یہی صاحب میرے بھائی بنتے ہیں، ہر چند کہ یہ رشتہ ذرا گھما کر ہے۔

اس عذاب سے گھبرا کر میں باقاعدہ رو پڑتا۔ تب ایسے میں منی دادا خدا کے بروقت فرشتوں کی طرح میری مدد کو آتے اور اسم نویسی کا مسئلہ پانی کر دیتے۔ گھنٹوں میرے پاس بیٹھ کر گتھیاں سلجھاتے اور ہمت بندھاتے۔

خود ان کے شجرۂ نسب کے بارے میں سوال کرنے کا ہمیں خیال ہی نہیں آیا۔ یا آیا ہو گا تو دھوبیوں کی اڑائی ہوئی افواہوں کے تناظر میں یہ سوچ کر کہ منی دادا اس بارے میں بہت حساس ہیں ہم لڑکوں نے کبھی پوچھا نہیں ہو گا۔ ایک بار کسی بزرگ خاتون نے خوش مزاجی سے پوچھ لیا کہ بھیا! تو سب کے شجرے یاد کیے بیٹھا ہے خود اپنا شاخ شجر بھی یاد ہے تجھے؟ تو اتنی ہی خوش مزاجی سے بولے، ''ہاں بیا! کیوں نہیں۔ سنو شمسیر ابنِ شمسیر ابنِ شمسیر ابنِ لبول مزید کھاں لسپ جنی'' اور ایک زبردست قہقہہ مار کر ہنسے۔ نادر شاہ درانی کا یہ تاریخی لطیفہ بھی انھیں چچا نے ہی سنایا تھا۔

ہم لڑکوں کے لیے ان کی جو حیثیت تھی، اگر اسے کسی ایک دو لفظی اصطلاح میں بیان کیا جا سکتا تو وہ اصطلاح تھی ''ماہرِ پشتونیات'' کی۔ وہ ہمارے لیے ''پٹھان ساگا'' کے عالم تھے مثلاً یہ کہ پشتو زبان جو دنیا کی پُرشکوہ زبانوں میں سے ایک ہے کچھ اس طرح بولی جاتی ہے کہ دنادا روڑا داپستہ دابا دام روڑا داپنگ اور یہ ہمیں بہت شان دار لگتا تھا کہ ہمارے پرکھے ایسی زبردست زبان بولتے ہوئے کفار کے علاقوں میں در آئے تھے اور انھوں نے سیاہ فام بھیلوں، کورکوؤں اور گونڈوں کے درمیان کھڑے ہو کر اعلائے کلمۃ اللہ کیا تھا اور یہ زبان بولی تھی۔ کیسا رعب پڑتا ہو گا مقامی آبادیوں پر!

اپنے ہم عمر کنبہ قبیلے والوں میں شاید میں سب سے زیادہ پُرتخیل واقع ہوا تھا۔ آنکھیں پھاڑے منھ کھولے منی دادا کا بولا ہوا ایک ایک لفظ پیتا رہتا۔ اور جب میری عمر کے دوسرے لڑکے پتنگیں اڑانے اور ہاکیاں کھیلنے میں لگے ہوتے، میں باڑے کی کوٹھریوں والی چھت پر چڑھ جاتا اور اپنے قبیلے کے وطن تیراہ سے ہزار ڈیڑھ ہزار میل دور، اپنے پشتون اجداد سے ڈھائی تین سو سال پرے، ٹین کی نالی دار چھت پر لیٹا ہوا قبائلی جنگیں لڑا کرتا یا بقول منی دادا درۂ خیبر میں ''ڈھم ڈھم اور تلوار کھوارا'' کیا کرتا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں میرا پسندیدہ کھیل یہ ہوتا تھا کہ میں کاٹھ کباڑ والے تاریک کمروں میں گھس جاتا، یا حُل گھروں میں اتر جاتا یا

دھاووں پر چڑھ جاتا اور کھیتی باڑی کے آلات میں دبے ہوئے زنگ خوردہ آدھے پون ہتھیاروں میں سے اپنے مطلب کی کوئی چیز نکال کر اسے اپنے طور پر صیقل کرتا۔ کبھی کوئی پوری تلوار، کٹار بھی مل جاتی جو زنگ سے نڈھال ہو کر بل یا اسپئے یا پاسے کی طرح بوجھل اور بے ڈول ہو گئی ہوتی؛ تو اسے دیکھ کر مجھے عجیب سا خیال آتا اور میں سوچتا کہ یہ تلوار جواب بل یا اسپئے یا پاسے کی شکل ہو گئی ہے یہ شاید ہمارا سپاہی پیشہ خاندان ہے اور اسے زمین پر پڑے پڑے ایک ''عدم استعمال'' یا ''غلط استعمال'' نے کسان بنا دیا ہے۔ سو میں اپنے زنگ خوردہ سپاہی کو بحال کرنے کی کوشش میں، بہن بھائیوں کے روبرو ناٹک کیا کرتا تھا۔ پردادا کی کامدار مخمل کی پھٹی ہوئی فرغل پہن کر، کمر سے آدھی پون تلوار باندھ کر میں پشتو مکالمات میں (جو ظاہر ہے منی دادا کی ایجاد ہوتے تھے) کفار کو للکارا کرتا، پشتو رجز پڑھا کرتا۔ منی دادا کو یہ ناٹک اور ہتھیاروں کی یہ بحالی بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ گھنٹوں ہم لوگوں کے ساتھ اس کھیل میں شریک رہتے کیوں کہ ان کا بیان تھا کہ وہ ہتھیاروں کے درمیان پیدا ہوئے تھے۔ ان کو ہر قسم کے ہتھیاروں سے عشق تھا۔

۴۶-۴۷ء کے پرآشوب زمانے میں پڑوس کی غیر مسلم ریاست سے مسلمان ہجرت کر کے ہمارے شہر آ رہے تھے، کیوں کہ ہمارا شہر مسلمان اکثریت کا شہر تھا، شاید اب بھی ہوگا اور یہ پٹھانوں کی بسائی ہوئی ریاست تھی۔ منی دادا ایک روز ریلوے اسٹیشن سے گھر بار کے صیقل گروں، اسلحہ سازوں کا ایک خاندان لے آئے اور انھیں باڑے میں بٹھا کر لا کی تلاش میں اسکول پہنچ گئے۔ پتا نہیں کس طرح لا کو قائل کر لیا کہ بے چارے بے آسرا لوگ ہیں۔ جہاں چار کتبوں کو باڑے کی کوٹھریوں میں پناہ دی ہے تو میاں! ان کے لیے بھی جگہ نکالیے۔ پھر منی دادا نے بڑی کوشش اور سیاست سے اسلحہ سازوں صیقل گروں کے لیے ایک کوٹھری خالی کرائی، لکڑی کے کھوکھے لا لا کر تختے نکالے اور جگہ کر باڑے میں ایک چھوٹا سا کمپاؤنڈ بنا دیا۔ اسلحہ سازوں، صیقل گروں نے دوسرے ہی دن گڑھا کھود کر دھونکنی نصب کر دی اور کھٹا کھٹ چھریاں، تلواریں بنانی شروع کر دیں۔ پہلا نیمچہ منی دادا کے لیے تخلیق ہوا؛ جس کے نیام پر اماں کی پرانی مخملیں صدری سے حاصل کیا ہوا کپڑا منڈھا گیا اور مرحوم تیغچے کے بعد منی دادا ایک اصل نسل نیمچے کے مالک بن گئے۔ تیغچے کی گمشدگی اور نیمچے کے حصول کے درمیان کی عذاب ناک مدت کے بارے میں پہلی بار منی دادا تقریباً مسکرا کر کہنے لگے، ''یہ تیغچا غائب ہوا ہے تو اس میں بھی مالک کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوئے گی۔ کیا پتا میں غصے میں کسی بھان کے گھوڑے کے پیٹ میں بھونک دیتا، بلاوجہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔ پلس کچہری ہوتی پھرتی۔'' کسی نے خدشہ ظاہر کیا کہ منی دادا تیغچا لے لیتے اور نیمچہ دے دیتے میں مالک کی کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔ اب آپ کسی گھوڑے کے پیٹ میں نیمچہ اتار دیں گے۔ تو زور سے ہنسے اور نیمچے کے مخملیں نیام کو تھپکنے لگے، ''ابے کیا گھوڑی بچ لیا ہے''

رتن ناتھ سرشار کے خوجی سے میرے چچا نے اور سروانٹے کے ڈون کیہوٹے سے میں نے متعارف کرایا تھا۔ مگر کیہوٹے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہتے تھے، ''گورے سب۔۔۔ تیا ہوتے ہیں۔''

یہی زمانہ تھا کہ ریاستی حکومت نے آتشیں اسلحہ اور چھ انچ سے زیادہ پھل کے ہر دھاردار آلے کے لائسنسوں کی سختی سے پڑتال شروع کر دی۔ نئے لائسنس جاری ہو رہے تھے مگر بڑی سفارشوں کے بعد۔ اور لائسنس کی سالانہ فیس بھی ہوتی تھی جو بڑی ''جیاوتی'' کی بات تھی، مگر پہلا مسئلہ لائسنس کا حصول تھا۔ منی دادا نے اماں کی خوشامد کر کرا کے ماموں سے سفارش کروائی۔ وہ پولیس میں کوئی توپ افسر تھے۔ اور منی دادا کا کام بن گیا۔ نیمچے کا بارہ آنے سالانہ کا لائسنس جاری ہو گیا۔ منی دادا کو یہ بارہ آنے ہمیشہ کھلتے رہے مگر انھیں یہ اطمینان ہو گیا کہ ان کا نیمچہ اب کوئی بھان کی گھوڑی گورمنٹ بھی نہیں چھین سکتی، دوسروں کا ذکر ہی کیا۔ اماں نے اور ماموں نے سفارش گزارنے سے پہلے منی دادا سے تقریباً حلف اٹھوا لیا تھا کہ وہ کسی کو اس نیمچے سے دھمکائیں گے نہیں۔ ''نا بیبی میاں! ابھی ہی چاہے کسم لے لو میں کسی ازل گر پھتا بھان کے......''

منی دادا سال میں ایک بار خود اپنا لائسنس اور میرے ابا، تایاؤں، چچاؤں، پھوپھاؤں، خالوؤں کے اور میری اماں کے نام کے بندوقوں، رائفلوں، تیغوں، تلواروں، خنجروں، کٹاروں، کرچوں کے لائسنس اکٹھے کرتے اور فیس بھرنے کے لیے لائن لگاتے۔ واپس آتے تو مردانہ ڈیوڑھی سے ہی بڑبڑانا شروع کر دیتے کہ غضب خدا کا، ایک زمانہ وہ دیکھا سنا تھا کہ گدی نشین تو نہیں تھے مگر فلاں محمد خاں کے محل پے پانچ پانچ توپیں چڑھی رہتی تھیں۔ ''مزال تھی کوئی ازل گر پھتا بھان کا گھوڑا ادھر بھی ڈال کے دیکھ سکتا''... اور فلاں محمد خاں بھی اگرچہ گدی نشین نہیں تھے مگر ''ون کے کنے سولھے سو تلواریں تھیں۔'' وہ وہ سروہیاں، تیغے، کھانڈے، کرچیں، نیمچے، کٹاریں، کھکھریاں، پیش قبض تھے کہ رہے نام مالک کا۔''

لا کہتے تھے، مجید کو تو ریاست کے اسلحہ خانے کا داروغہ ہونا چاہیے تھا، ہتھیار دیکھ دیکھ کر اس کا خون بڑھتا رہتا۔ پھر حکومت نے حکم جاری کیا کہ تمام ہتھیار سرکاری مال خانے میں جمع کرا دیے جائیں۔ منی دادا نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ یہ خبر سنی۔ دو روز تک مغلظات بکتے رہے۔ غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو میرے دو تین بزرگوں کو اپنا ہم خیال کیا اور لا کو مشورہ دیا کہ لائسنس والے ہتھیار بے شک جمع کرا دیے جائیں مگر کونوں کھدروں، حل گھروں میں، دھاووں پر اور دیواروں میں بزرگوں کی جو امانتیں محفوظ ہیں ان کا کہیں کوئی اندراج نہیں ہے سو ان کو صیقل کرا کے تیار رکھا جائے۔ زمانہ خراب ہے اور پٹھان بچے تو اچھے زمانے میں بھی تیار رہتے ہیں۔

لا علی گیرین تھے، اصول پرست آدمی تھے، انھیں حکومت کے واضح احکام کی خلاف ورزی کسی صورت منظور نہیں تھی۔ پھر ان کا کہنا تھا کہ سو پچاس

برس کے دفن کیے ہوئے ہتھیار اب کھاد بن چکے ہوں گے پھر اس تردد سے جاسے کیا حاصل؟ اس لیے اس معاملے کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ منی دادا بظاہر مایوس ہو کر بیٹھ رہے مگر ہم لڑکے دیکھ رہے تھے کہ ان کے گرد و پیش اور ہمارے ذہن کے دالانوں، دھالانوں، حل گھروں، زینوں میں ایک پُر اسرار سرگرمی جاری ہے جس کا اتا پتا کوئی نہیں۔

لائسنس دار اسلحے جمع کر دیے گئے۔ دو تانگوں میں کنبے قبیلے کے دو چار بڑے اور منی دادا ہتھیار لاد کر پولیس کے مال خانے پہنچے اور رسیدیں کٹوا کر خالی ہاتھ گھر لوٹ آئے۔

میں اسکول سے آیا تو دیکھا کہ منی دادا ڈیوڑھی میں دیوار سے ٹیک لگائے سر نہوڑائے اکڑوں بیٹھے ہیں۔ یوں لگتا تھا، اپنے کسی خون کے رشتے کو مٹی کے سپرد کر آئے ہیں۔ دکھ اتنا گہرا اتر گیا تھا کہ آج مغلظات بھی نہیں بنا رہے تھے۔ پھر جو تین چار دن بعد میرے ایک تایا کے ہتھیار جمع کرانے مال خانے گئے تو منی دادا لوٹ کر نہیں آئے۔

خبر آئی کہ انھیں گرفتار کر لیا گیا ہے، کوتوالی خاص کے لاک اپ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور مغلظات سے شغل ہے۔ ہاں ہاں کر کے تقریباً پورا قبیلہ دوڑ پڑا۔ منی دادا ویسے تو شاید ملازم تھے مگر میرزائی حیلوں کی ڈیوڑھیوں کے پروردہ تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ دوسرے قبیلے کے ہی سہی، پٹھان تھے... وردیوں کے نرغے میں انھیں اکیلا کیسے چھوڑا جا سکتا تھا۔

اماں تانگے میں بیٹھ ترنت اپنے پولیس بھیا کے یہاں پہنچیں اور میز پر سر وٹا مار مار کر بھائی کو حکم دے دیا کہ ابھی اسی وقت منی دادا کو گھر آ جانا چاہیے۔ میاں... آج ہمارے پشتینی اہلکار کو... ایک بوڑھے کو بند کر دیا ہے تم نے، تو کل ہمارے بچوں کو باندھ لے جاؤ گے۔ بزرگوں نے کیا اسی لیے اپنی تلواروں سے جنگل کاٹ کاٹ کے یہ ریاست بسائی تھی؟ آئیں! اس روز میری اماں کا جلال دیدنی تھا۔ بولتی ہی چلی گئیں۔ غالب کے شاگرد نواب یار محمد خاں شوکت کی پوتی تھیں۔ ایک جدید نواب زادے کی فکر مندی، ایک تو انا شاعر کی طلاقتِ لسانی اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔

ماموں کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، "مگر منجھلی آپا! پتا تو چلے کہ اسے کیوں بند کیا گیا ہے... سنیے تو... میں بھیجتا ہوں کسی کو... آپ اندر تو چلیے۔ کھانا تو کھا لیجیے۔" مگر اماں چٹان کی طرح ان کی مردانہ بیٹھک میں جمی رہیں اور جلال کے عالم میں بیٹھی چھالیا کترتی رہیں۔ ماموں کا پورا گھر ایک ایک بسکٹ اور ایک ایک پیالی چائے پر صبر کیے انھیں گھیرے بیٹھا رہا۔ ماموں کو وردی پہن کر خود جانا پڑا۔

دو گھنٹے بعد منی دادا ہماری ڈیوڑھی میں بیٹھے تھے اور کوئی دو درجن میرزائی حیلوں کو اپنی روداد سنا رہے تھے۔

''اجل گرفتہ'' اور وہ دوسری بات جتا کر میں جو سمجھ سکا، وہ یہ تھا کہ جب وہ تایا کے ہتھیار جمع کرانے مال خانے پہنچے تو حوالدار سکھیا رام؛ جو ذات کا تیلی ہے اور وردی پہننے کے باوجود کسی طرف سے سپاہی نظر نہیں آتا، اس دن مال خانے کا انچارج تھا۔ منی دادا اور سکھیا رام کی پہلی مشترکہ بدقسمتی یہی تھی کہ ڈیوٹی پر سکھیا رام تھا۔ اگر بیلا سنگھ ٹھاکر یا گلاب خاں حوالدار ڈیوٹی پر ہوتے تو وہ کچھ نہ ہوتا جو ہوا۔

پہلے تو سکھیا نے ہنس کر ان کی طرف دیکھا۔ دوسری واضح حرمزدگیاں یہ کیں کہ انھیں بڑے میاں کہہ کر مخاطب کیا اور پھر اسی کے اسٹول پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ منی دادا ایک طرف کھڑے اسے گھورتے رہے۔ آتش فشاں اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ اس کی آخری اور ناقابل معافی بدمعاشی جس سے آتش فشاں کا ڈھکنا ایک ''بوم'' کے ساتھ اڑ گیا، یہ تھی کہ اس تیلی کے بچے نے ہمارے ہتھیاروں میں سے ایک ہتھیار اٹھا لیا اور بے نیازی سے بیڑی پیتے ہوئے اس سے اپنی پنسل چھیلنے لگا۔

یہ نواب غوث محمد خاں فتح جنگ بہادر کا پیش قبض تھا؛ جس کا قبضہ سنگ یشب کا تھا، جس پر سنگ تراش نے پھول پتیوں کے نقش کچھ اس طرح ابھارے تھے کہ لگتا تھا موم سے ڈھال کر نکالے گئے ہیں۔ پیش قبض کے ایک چوتھائی پھل پر سونے کے پانی سے خط آشیانی پر کھے کا نام اسی درج تھا اور فارسی زبان میں خبر دی گئی تھی کہ یہ ہتھیار ایک ایرانی کاریگر نے بطورِ خاص نواب بہادر کے لیے تخلیق کیا ہے کہ جو زمین پر کھڑے ہو کر روبرو شیر کا شکار کیا کرتے ہیں۔

سو پہلی بات تو یہ کہ سکھیا رام ذات کا تیلی تھا اور آخری بات یہ کہ بیڑی پیتے ہوئے نواب غوث بہادر جنت مکانی کے پیش قبض سے پنسل چھیل رہا تھا۔

منی دادا نے ''ازل گرفتہ'' یا ''بھان کے'' کہہ کر جو ایک زناٹے کا تھپڑ مارا تو حوالدار سکھیا کی بیڑی اور پنسل دور جا پڑی پھر انھوں نے اس تیلی کے پوتے کو اطلاع دی کہ یہ شیر بچوں کی میراث ہے... تیری ترکاری کاٹنے والی چھری نہیں؛ اور یہ تیرے ہاتھ لگنے سے تو نجس ہو ہی چکی تھی مگر میں نے صبر کیا اور اب جو تو بھان کے گھوڑے اس سے پنسل چھیلتا ہے اب تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا وغیرہ۔

ظاہر ہے اس کے بعد منی دادا کو کوتوالی خاص کے لاک اپ میں منتقل کر دیا گیا۔

کوتوالی انچارج بڑے چکر میں تھا۔ تین فیتوں والے ایک چھوٹے موٹے پولیس افسر کو، جو سرکاری وردی میں ڈیوٹی پر تھا، ایک سویلین نے زدوکوب کیا تھا اور سرکاری فرائض کی بجا آوری میں مزاحم ہوا تھا۔

مگر ریاست ابھی یونین میں ضم نہیں ہوئی تھی۔

ایک پٹھان نواب ابھی ماہی مراتب کے سائے میں ریاستی گدی پر

بیٹھا مقدور بھر فرماں روائی کرتا تھا اور ایک ہزار سے زائد مسجدوں کے ایک ہزار سے زائد منبروں سے ابھی اس کے نام کا خطبہ پڑھا جا رہا تھا کہ خلد اللہ ملکہ وسلطانہ...؛ ہر چند کہ ریاستی پرچم کا مستول ہاتھوں سے پھسلا جاتا تھا اور نئی دلّی میں بات چل پڑی تھی کہ ریاست ضم کر دی جائے گی۔

تو نواب کے خوش حال، نیم خوش حال، تعلیم یافتہ، نیم تعلیم یافتہ اور مہذب، نیم مہذب مگر با اثر کٹھپ قبیلے کے معززین، اور ذرا کم معزز، کئی سو پٹھان کوتوالی خاص کو گھیرے کھڑے تھے کہ اتنے میں ماموں پہنچ گئے۔ انھوں نے علی گڑھ سے نفسیات میں فاضل کی سند خواہ مخواہ تو نہیں لی تھی۔ دس بیس منٹ میں اپنے توپ عہدے کی دھونس دیے بغیر؛ بڑے پیار سے، اپنے اس ماتحت افسر کو قائل کر لیا کہ یہ غنڈہ گردی اور فوج داری سے زیادہ تاریخ کی بازی ہارتے ہوئے ایک غیرت مند قبیلے کی جھلاہٹ اور مجروح انا کا مسئلہ ہے۔ کوتوالی انچارج ذات کا چوہان راجپوت تھا اور تلوار باندھنے والے ہارتے ہوئے ہاتھوں کی تکلیف کو شاید سمجھتا تھا۔ علاوہ ازیں ایک بے وقوف، غیر سیاسی ہیڈ کانسٹیبل کی وجہ سے اپنے افسرانِ بالا کے لیے مزید مسائل پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

حوالدار سکھیا رام کو جواب طلبی کا پروانہ ملا کہ ہر گاہ ہمارے علم میں آیا ہے کہ تم نے ریاست سے متعلق نہایت بیش قیمت، نادر و نایاب تاریخی اہمیت کے حامل ایک ہتھیار کو کہ جو تمھاری تحویل میں وغیرہ وغیرہ... سکھیا رام کو لائن حاضر کر دیا گیا۔

بانے منّی دادا کو آرام کرنے کے لیے، زمینوں پر بھیج دیا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ ہر کس و ناکس کو حوالدار سکھیا، سابق انچارج اسٹیٹ مال خانہ کے زوال کی داستان سناتے پھرتے تھے۔

مگر کسے معلوم تھا کہ منّی دادا کا تقریباً زوال بھی ہم لڑکوں کو دیکھنا پڑے گا۔ ایک بات پر بانے ان سے سخت ناراض ہوئے، باڑے کی ایک کوٹھری خالی کرائی گئی، اور منّی دادا کو پہلی بار ہماری ڈیوڑھی سے کچھ دور چھاؤنی چھانا پڑی۔

ہوا یوں کہ دادا کے انتقال کے بعد شاید پہلی بار ہماری ایک بہن قبیلے سے باہر بیاہی گئی۔ لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر سخت سویلین تھا کہ اس کا تعلق کسی مارنے دھاڑنے والے قبیلے سے نہیں تھا۔ شادی کے بعد، ہمارے یہاں کے دستور کے مطابق، داماد کو لے جایا گیا کہ وہ منّی دادا کو سلام کرے اور منّی دادا اسے دو روپے سلامی کے دیں۔ ظاہر ہے وہ اس کے بزرگ تھے۔ کوئی بوڑھا ادھیڑ اس وقت موجود نہیں تھا اس لیے ہم لڑکوں کو مقرر کیا گیا کہ داماد کو لے جا کر رسم پوری کرائیں۔ منّی دادا علیل تھے، نئے داماد کو دیکھ کر مسکرائے، جیوٹ کر کے اٹھ بیٹھے۔ ہم نے دائیں بائیں تکیے لگا دیے۔ سلام لے کر انھوں نے داماد کے سر پر ہاتھ پھیرا، سلامی کے دو روپے عطا کیے اور پھر ''پشتونیات'' کی بساط پھیلا دی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے تک نیا داماد منھ کھولے منّی دادا کے انکشافات سنتا رہا۔ ''ساکھ بجر'' پر ایک سیر حاصل تبصرے کے بعد منّی دادا نے داماد کو بتایا کہ یہ میر زائی خیل بڑے جیوٹ والے کٹھپ ہیں، خونخوار اتنے کہ ''مزال'' ہے کوئی ان کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ لے؛ اور یہ کہ جو چالیس پچاس گھر اس محلے میں ایک ساتھ چلے گئے ہیں، یہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ہر گھر نے دوسرے گھر میں ایک کھڑکی اتنی بڑی نکال رکھی ہے کہ ایک سالم آدمی مع تلوار یا ''زنل'' کے گزر سکتا ہے۔ اگر محلے کے اس سرے پر بیرونی حملوں کے کسی گھر پر حملہ ہو تو ''دس منٹ'' میں اِس سرے سے اُس سرے تک، سو سوا سو مسلح پٹھان بچے صورتِ حال پر قابو پانے اور حملہ آور کو تہس نہس کرنے کے لیے جمع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً سنہ فلاں میں فلاں محمد خاں ایک ذرا سی بات پر نائب کوتوال کو مع اس کے گھوڑے کے قتل کر دینے کے بعد کھڑکیوں کھڑکیوں، گھروں گھروں گزرتے ہوئے صاف نکل گئے تھے۔ تو یہ فائدہ ہے ان مربوط مکانوں کا۔ پھر اس طرح عزیز پیاروں میں آپس میں میل محبت بھی رہتی ہے اس کی مثال منّی دادا نے یوں دی: کہ یہ جو اپنے بچھمیاں بیٹھے ہیں تو ان کے فلاں نے پر دادے نے انھی کے فلاں نے پرپانے کو صرف اتنی سی بات پر قتل کر دیا تھا کہ دونوں ایک جگہ ولیمہ کھانے گئے تھے؛ پر دادے پہلے سے موجود تھے کہ پرپانے آئے۔ دونوں میں جائداد پر معمولی سا مقدمہ چل رہا تھا (ویسے کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ان لوگوں میں نالشیں، فوجداریاں ہوتی ہی رہتی تھیں؛ ڈنڈا مڈنڈا، تلوار مِتلوارا بھی چلتی رہتی تھی، کس لیے کہ غیرت بچے ہیں آخر کچھ نہ کچھ تو کریں گے ہی) اب جو ان کے پرپانے ولیمے کی فرشی نشست پر جانے کے لیے پاپوشیں اتارنے لگے تو ان کی ایک پاپوش ان کے اس پر دادے کی پاپوش پر چڑھ گئی کہ جو پہلے سے موجود تھا اور نووارد پرکھے کی حرکات و سکنات کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ پاپوش کا پاپوش پر چڑھنا تھا کہ ان کا پہلے والا پرکھا چھک کر اٹھا اور خبردار کہہ کر تلوار کا جو بھرپور ہاتھ مارا ہے تو دوسرے پرکھے کی گردن بھٹا سی دور جا پڑی۔

داماد کے چہرے سے پسینا بہہ بہہ کر شادی کی نئی شیروانی کے کالر میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دو تین بار پانی پی چکا تھا اور حد درجہ بے چین تھا۔ دیر بھی بہت ہو گئی تھی، ہم اسے زنانے میں لے آئے۔

دوسرے دن طوفان پھٹ پڑا۔ منّی دادا بیمار تھے، ان سے تو بانے کچھ نہیں کہا، اماں کے سامنے گرجتے برستے رہے کہ کیا بجید کا بالکل ہی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ داماد کو اس قدر دہلا دیا کہ وہ گھر جا کر گم صم لیٹ گیا۔ لڑکی سے پوچھتا تھا کہ کیا یہ سب باتیں صحیح ہیں؟ اور کیا تم قاتلوں، خوں خواروں کی اولاد ہو؟ کیا تمھارے یہاں بات بات پر تلوار مِتلوارا ہوتی ہے؟ پوچھ رہا تھا: تمھارے گھر میں اب کتنی تلواریں ہیں؟ اور کیا سب لوگ اب بھی ولیمے کی دعوتوں میں تلواریں باندھ کر جاتے ہیں، تاکہ ایک دوسرے کو قتل کرنے میں آسانی ہو؟ حد ہو گئی۔ آخر یہ گڑے مردے اکھاڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہر گھرانے میں کچھ نہ کچھ پاگل پن ہوتا ہی رہتا ہے تو کیا اس کو اس طرح مشتہر کیا جاتا ہے؟ لاحول ولاقوۃ!

ہفتے بھر بعد باڑے میں ایک کوٹھری تیار کر دی گئی اور منّی دادا کو وہاں

فروکش ہونا پڑا۔

ڈیوڑھی سے دوران کی بیماری نے شدت اختیار کر لی۔ ویسے تو انھیں ہم سب گھیرے رہتے تھے؛ مگر وہاں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ انھیں پتا چل گیا تھا کہ دابادوالے معاملے میں میاں خفا ہو گئے ہیں اور اسی لیے ان کو ڈیوڑھی سے دور کر دیا گیا ہے۔ بڑی حسرت ناکی باڑے پر اور اس کے گردو پیش چھائی ہوئی تھی۔ ایک روز کہنے لگے، ''اب مزید کھاں لسپ جی حسین کا بوجھا بنتا جا رہا ہے۔ چل چلاؤ کا تیم ہے'' وہ ابا کو بلوا کر اپنی صفائی پیش کرنا چاہتے تھے۔ میں نے جا عرض کیا کہ منی دادا بہت بیمار ہیں، آ کر دیکھ لیجیے۔ ابا آئے تو جیسے منی دادا کھل اٹھے۔ تکیموں ویدوں کے ''نکھسوں'' پر باتیں کرتے رہے... ''ازل گرہتا'' اور ''بھان کے'' وغیرہ بھی شروع ہو گیا۔ پھر اچانک بڑی چہک دار آواز میں، جیسے ابا کو کوئی لطیفہ سنا رہے ہوں، کہنے لگے کہ میاں، وہ دابادوالے معاملے میں آپ خفا ہو گئے، شاید اسی لیے مجھے یہاں پھنکوا دیا۔ ابا نے کچھ ہوں ہاں کر دی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ منی دادا کی بیماری سے، ان کی حسرت ناکی، ان کے لطیفہ سنانے کے انداز سے؛ جو ظاہر ہے ابا کو راضی کرنے کی بڑی رقت انگیز کوشش تھی، وہ بہت متاثر ہوئے ہیں۔ منی دادا کہنے لگے، ''میاں! ویسے تو آپ ماشے فلاں بچے والے ہو، بڑے میرے آگو کے بچے ہو۔ میری مصلے تیں آپ نہیں سمجھ سکتے۔ یہ یوں کہتے ہیں نا کہ داگڑا باکستی دارو بچے اول، تو میں نے صاحب جادے کو کھبر دار کر دیا ہے کہ ہاں کھبر دارا پٹھانوں سے ملا ہے... اب صاحب جادے جیا دہ سمجھ نہیں پتا کہ نہیں کریں گے انا ڈال''

ابا نے اسی دن منی دادا کی ڈیوڑھی میں بحالی کے احکام صادر کر دیے۔ تو جیسے سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔ منی دادا کی حالت بہتر ہونے لگی مگر وہ بہت بوڑھے ہو گئے تھے، زیادہ دن چلتے نظر نہیں آتے تھے۔ اماں نے ان کی محبوب جمرت کو ان کی دیکھ بھال کی اجازت دے دی۔ وہ آ کر منھ دھلاتی، کپڑے بدلواتی، اپنے ہاتھ سے دلیا کھلاتی، پرچ میں انڈیل انڈیل کر چائے پلاتی۔ مہینوں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ابا نے ڈاکٹروں کو دکھایا، کئی طرح کے علاج بدلوائے مگر منی دادا پھر سنبھل نہ سکے، گرتے ہی چلے گئے۔ ان کا آدھا بستر سمیٹ دیا گیا۔ چارپائی کی بان دو طرف سے کھینچ کر درمیان میں ایک خلا بنا دیا گیا اور اس کے نیچے تام چینی کا تسلا رکھ دیا گیا۔ حوائج ضروری کے لیے وہ اب بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ جمرت نے ان کی صفائی ستھرائی کی سب ذمہ داری سنبھال لی تھی مگر وہ کنیے دار عورت تھی، رات میں نہیں رک سکتی تھی۔ راتوں میں، میں دیکھتا کہ ابا گرم پانی کے لوٹے لیے کئی کئی بار ڈیوڑھی کی طرف جاتے اور کئی بار کم زور سی آواز میں منی دادا کے احتجاج کرنے اور رونے کی آواز آتی۔ وہ ابا سے خدمتیں نہیں لینا چاہتے تھے۔ اماں نے ان کی دیکھ بھال کے لیے اپنے میکے سے کوئی ملازم بلوانے کو کہا تو منی دادا نے سختی سے منع کر دیا۔ میرے ابا ان کے سامنے کے بچے تھے، بیٹوں کی طرح تھے۔ تو بیٹوں کی بات ٹھیک ہے''میں غیروں کے سامنے ڈھکا کھلا نہیں ہو سکتا۔ بیٹا! وہں سے تو اچھا ہے مجھے اسپتال پہنچا دیو'' مگر سب جانتے تھے، وہ اسپتال میں دو گھنٹے بھی نہیں نکال سکیں گے۔ ختم ہو جائیں گے۔ انھوں نے اعلان کر دیا تھا کہ میں اس گھر میں مرنا چاہتا ہوں۔ وہ کئی کئی گھنٹے غشی کی حالت میں پڑے رہتے۔ دن میں جمرت اور ہم لڑکے، رات میں ابا، امکان بھر ان کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر سب تھک چکے تھے۔

ور اس تھکن اور بوکھلاہٹ میں جمرت کو منی دادا کی ایک واضح ہدایت کا خیال نہیں رہا۔ وہ غشی کی حالت میں تھے کہ میں نے انھیں ''ڈھکا کھلا'' دیکھ لیا... میں نے دیکھا کہ ان کی مسلمانیاں نہیں ہوئی تھیں۔

اپنے چھوٹے سے ذہن میں بہت سے سوالات لیے میں خاموشی کے ساتھ ڈیوڑھی سے چلا آیا۔ اس نئی اور عجیب بات کی سنسناہٹ مجھے چین نہیں لینے دیتی تھی۔ چھت پر گیا، باڑے میں ٹہلا، اماں کے پاس بیٹھا۔ بہت دیر آنڈے باڈے گھومتا پھرا۔ مگر منی دادا بہت بیمار تھے اور وہ ہم سب سے بہت محبت کرتے تھے۔ میں پھر ڈیوڑھی میں پہنچ گیا۔

میں نے سنا، ان کے ٹھہر ٹھہر کر غصہ کرنے اور رونے کی کم زوری آواز آ رہی تھی۔ جمرت نے شاید انھیں بتا دیا تھا کہ کیا غضب ہو گیا ہے۔

''بھان کی گھوڑی مرتے مرتے کا لک لگوا دی تو نے... لڑکے کیا سوچیں گے۔'' پھر ان کے رونے کی آواز آئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی ''ٹھی کی کی کی ک ہے — تیلی کا لنڈ پٹھانوں کے پالے سے پٹھان تو نہیں بن جاتا۔''

میں اب ڈیوڑھی میں نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر باڑے کی طرف نکل گیا۔

تو کیا منی دادا ساری زندگی ہم سے جھوٹ بولتے رہے؟ تو کیا محلے کے دھوبی ٹھیک کہتے تھے؟ ایسا لگ رہا تھا جیسے شکر کا نام لے کر کسی نے مجھے مٹھی بھر ریت پکڑا دی ہے۔ مگر یہ بات میں کسی سے کہہ بھی تو نہیں سکتا تھا۔

وہ چار دن اور زندہ رہے مگر یہ چار دن غشی اور بیداری کی بھول بھلیاں تھے۔

ان کے انتقال کے کئی مہینے بعد وہ ایک سوال جو اس سنسناہٹوں والے دن سے برابر میرے ساتھ تھا، مجھے بے چین کیے ہوئے تھا، میں نے یک بارگی ابا کے سامنے رکھ دیا۔ ابا مسجد جانے کے لیے ڈیوڑھی سے گزر رہے تھے کہ منی دادا کی کوٹھری کے سامنے مجھے خاموش کھڑے دیکھ کر رک گئے۔ آہستہ سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا، بولے ''کیا بات ہے؟''

میں نے بات بتا دی۔

وہ بہت دیر خاموش کھڑے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے، ''وہ کوئی بھی تھے؛ تمھیں بس ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ تم سے محبت کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ تم اپنے دادوں پر دادوں کی طرح عزت کے ساتھ جینا سیکھ جاؤ... بچے! جاؤ اب کھیلو'' پھر وہ جاتے جاتے غصے سے پلٹ پڑے ''اور سنو کون خبیث کہتا ہے وہ مسلمان نہیں تھے؟ کون کہتا ہے پٹھان نہیں تھے؟''

زندگی سے مجھ کو پیار ہے

فاری شا (لندن)

ڈیئر عزیز۔

شاید آپ نے سنا ہو کہ میں گذشتہ سال حج کرنے گیا تھا۔ چنانچہ جون جولائی کی جو ڈاک میرے نام آئی وہ جمع ہوتی رہی۔ واپس آیا تو بے شمار دوسری مصروفیات نے گھیر لیا اور میں یہ ڈاک ایک بڑے سے بیگ میں رکھ کے بھول گیا۔ ابھی دو روز پہلے " فنون " کا تازہ شمارہ پوسٹ کرنے کے سلسلے میں مجھے بعض کاغذات کی تلاش تھی۔ یہ بیگ ملا تو پوری کی پوری ڈاک، ایک برس پرانی ڈاک، مل۔ اس میں آپ کا کرم نامہ بھی تھا اور پھر ساتھ ہی افسانہ بھی تھا۔ بے حد و حساب ندامت کا احساس ہوا۔ کاش یہ افسانہ مجھے پہلے مل جاتا تو تازہ شمارے کی زینت میں اضافہ ہوتا۔ اب 'مردہ گھر میں مکالمہ' کاتب کے حوالے کر رہا ہوں تا کہ ستمبر اکتوبر کے شمارے میں شامل ہو سکے۔ ایک بار پھر اظہار معذرت کرتا ہوں۔ دعا ہے آپ بخیریت ہوں۔ عزیزہ فرزانہ بی بی سے دعا کہیے گا۔ اِس عریضے کی ایک سطر ہی رسید ضرور بھجوایئے گا تا کہ ندامت میں اضافہ ہو۔

احمد ندیم قاسمی

پیارے اسد میاں

میں خط لکھ رہا تھا۔ بجلی چلی گئی تھی۔ پنکھا بند تھا۔ جیسے ہی تمہیں خط لکھنے بیٹھا، بجلی آ گئی اور پنکھا چلنے لگا۔ یقین کرو تمہارا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کراچی کی دو خصوصیات ہیں روزی کمانے کی مصروفیت اور فاصلے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قریبی عزیز اور گہرے دوست بھی ایک دوسرے سے مہینوں نہیں مل پاتے۔ اس لیے تمہارے جواب میں تاخیر سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ 'شاہین' کی ڈرامائی تشکیل اور presentation دونوں ہی بہت خوب تھے، پسند آئے تمہیں اور اختر (جمال) دو بار طارق سے ملنے جیل جا چکے ہیں۔ کیوں کہ وہ کلاس 'بی' میں ہے اس لیے لکھنے پڑھنے کی سہولت حاصل ہے۔ گو پورے دو سال بے جرم بے گناہی کی سزا کاٹتے گذر گئے ہیں لیکن اُس کی پیشانی پر بل نہیں۔ صحت ٹھیک ہے۔ جب بھی جاتے ہیں خوش نظر آتا ہے (شاید اس لیے کہ ماں باپ پریشان نہ ہوں) ہم نے سوچا تھا کہ طارق کی شادی کر دیں گے۔ بہو ملے گی جو بیٹی کا نعم البدل ہو گی اور پھر پوتا پوتیوں کو کھلایا کریں گے۔

لیکن: زندگی / کتنی ظالم ہو تم / غم ہی غم / دکھ ہی دکھ / تم نے مجھ کو دیے / کل جو گذرا / بہت تھا اُداس / کل جو آئے گا / اُس میں نہیں کوئی آس / جو بھی چاہوں وہ ملتا نہیں / جو بھی سوچوں وہ ہوتا نہیں / پھر بھی میں / چاہنا ختم کرتا نہیں سوچنا بند کرتا نہیں / کیوں کہ / اے زندگی / مجھ کو تم سے بہت پیار ہے۔

ہم دونوں زندہ ہی نہیں بلکہ صحت مند رہنے کی کوشش میں بفضلِ خدا ابھی تک کامیاب ہیں۔ زندہ رہنے میں ہی ہماری جیت ہے۔ اِن حالات میں مرنا ہار کے مترادف ہوگا۔ سولہ مہینے مقدمہ چلائے بغیر نظر بند رکھنے کے بعد یونیورسٹی کے تینوں اساتذہ پر اسپیشل ملٹری کورٹ میں مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمہ کی کارروائی ۱۸/اپریل ۸۳ء کو ختم ہوئی۔ لیکن فیصلہ ہنوز نہیں سنایا گیا۔ کارروائی کے دوران یہ واضح تھا کہ طارق کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں ہوا ہے اور ہمیں امید تھی کہ طارق رہا ہو جائے گا۔ لیکن فیصلے میں تاخیر کے سبب یہ اُمید ماند پڑتی جا رہی ہے۔ دعا کرو کہ طارق جلد رہا ہو جائیں اور ہم تینوں کراچی آ سکیں۔ اختر تم سب کو دعا کہتی ہیں۔ فرزانہ بیٹیا کو بہت سی دعائیں۔ ممن ایمن اور غزل کو پیار۔ تم سب کو لے کر کچھ دن کے لیے اسلام آباد کیوں نہیں آتے۔ ہمیں بہت خوشی ہوگی۔ ہم بہت اکیلے ہیں۔

احسن علی خان احسن

برادرم

اس سے پہلے ایک رجسٹرڈ لیٹر ارسال کر چکا ہوں اور صبح شام اُس کے جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔ خدا کرے کہ جس پریشانی کا ذکر آپ نے اپنے اولین خط کے بین السطور میں کیا تھا، اب تک دور ہو چکی ہو۔ بواپسی ڈاک اپنی اور عزیز و اقربا کی خیریت کی اطلاع دیں۔

'فردا' اب تکمیل و ترتیب کے آخری مراحل میں ہے۔ بہت سا حصہ کتابت ہو چکا ہے۔ اب صرف آپ کی چیزوں کا انتظار ہے۔ خدا کرے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں اور اس طرح مجھے اپنی چیزیں بروقت ارسال کر سکیں تا کہ میں انھیں 'فردا' کی اسی اشاعت میں درج کر سکوں۔

اختر حسین جعفری

ڈیئر مکرم،

آج میں شفیق دومیرہ صاحب سے کتابیں لے آیا۔ بڑی محبت سے ملے۔ کتابیں علی امام، ساجد رشید، الیاس شوقی کو دے دی ہیں کل گریش سے ملاقات ہوگی تو ان کی کاپی بھی دے دوں گا۔ ابھی بس پہلا افسانہ پڑھا ہے۔ آپ کی نثر پڑھ کر واقعی دل سے تعریف نکلتی ہے کہیں سے بھی کتابی نثر نہیں معلوم ہوتی۔ ہمارے یہاں ایسی نثر لکھنے والے خال خال ہوں گے۔ پھر ایسی مردانہ تہہ دار نثر! اس کا ایک ایک لفظ بولتا ہے کہ یہ اسد محمد خاں کی نثر ہے۔ اور ایسا بھی نہیں کہ کہیں موضوع سے متعارض ہوتی ہو۔ آپ کے افسانوں کو کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ چاہے بھی تو نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ بے حد پسند کیا جائے گا۔ ابھی دسمبر کے آخری ہفتے میں، یہاں، ایک سیمینار میں گوپی چند نارنگ آئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ میں فروری میں آ رہا ہوں، اسد محمد خاں کے افسانوں پر آپ لوگوں سے گفتگو ہوگی۔

آپ کی کتاب دیکھ کر ایک افسوس ہوا۔ ایسے چار مجموعے اور کیوں نہیں؟ ڈائجسٹوں اور ٹی وی کے لیے لکھنا آپ کی مجبوری ہوگی۔ لیکن ایسی چالیس کہانیاں اور کیوں نہیں؟ یہ ہمارا دکھ ہے۔ آپ ڈائجسٹوں اور ٹی وی کے لیے ضرور لکھیے۔ لیکن سال میں تین چار کہانیاں ہم لوگوں کے لیے بھی لکھیے۔ اتنا حق تو آپ پر ہم لوگوں کا ہے ہی۔ اجمل کمال، آصف فرخی، ذیشان اور افضال سید، انور زاہدین رائے کیسے ہیں؟ ان سے میرا سلام کہیے۔

انور خاں

اسد پیارے۔

یار خدا کے لیے مجھ سے جلد ملو۔ خدا کی قسم، ایسا تحفہ ہے کہ جھوم جھوم اٹھو گے۔ یوں سمجھ لو کہ اس تحفے کے لیے، تم مجھ سے زیادہ مستحق ہو مگر شرط یہ ہے کہ ملو۔ یوں کرو کہ پرسوں شام آصف جمال کے گھر آجاؤ۔ وہ تحفہ اسی کے پاس ہے اور وہ تم کو بہت یاد کر رہا ہے۔ میں پرسوں شام ۱۸ ستمبر کو آصف جمال کے یہاں تم سے ملوں گا۔

اطہر نفیس

پیارے خان اعظم، ڈھیروں دعائیں اور پیار

تمہاری تینوں کہانیاں ('آج' میں) پڑھ کر اتنا excite ہوا کہ عرصے سے نہیں ہوا تھا۔ ایک زمانے میں بلراج (مینرا) یا سریندر (پرکاش) کو پڑھ کر excitement ہوتی تھی۔ میں نے ۸۳ء کے بعد فکشن نہیں لکھی۔ پندرہ برس ہو گئے۔ تم اسی طرح excite کرتے رہے تو کوئی تعجب نہیں، میں دوبارہ متحرک ہو جاؤں۔ بہر حال، مبارک۔

(یہ 'آج' مجھے [مولانا] ذکاء الرحمٰن نے دیا تھا)۔ 'آج' کے بہت اچھے اچھے شمارے ملے ہیں پڑھنے کو۔ لیکن ارصاقی راے، نیر (مسعود) اور تمہاری وجہ سے میرے لیے اس شمارے کی قدر بہت زیادہ ہے۔

اجمل (کمال) صاحب سے ملاقات ہو تو اس شمارے کی اشاعت کے لیے میری طرف سے مبارک اور شکریہ ادا کر دینا۔ کبھی کبھی خط لکھنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ امید ہے تم مع الخیر ہو گے۔ کم از کم اس خط کا جواب ضرور دینا، تاکہ یقین ہو، میں نے ایڈریس درست لکھا ہے۔

ڈاکٹر انور سجاد

برادر عزیز

آپ کا مجموعہ 'برج خموشاں' آج مجھے ملا ہے اس پر آپ نے ۳۰ / اکتوبر ۱۹۹۰ء کی تاریخ ڈالی ہے گویا مجھے یہ کتاب تقریباً ساڑھے تین سال بعد ملی ہے آپ نے معلوم نہیں کتاب کسے بھجوائی تھی۔ مجھے تو کل محمد اظہار الحق صاحب نے پہنچائی ہے۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ میں نے آپ کو کتاب کی رسید تک نہ بھجوائی۔ میں اپنی جگہ پر اب شرمندہ ہو رہا ہوں، اور یہ خط اسی وضاحت کے لیے لکھ رہا ہوں۔ ویسے، میں نے آپ کی یہ کتاب اسی زمانے میں بازار سے خرید لی تھی اور پڑھ بھی لی تھی۔ میں آپ کے افسانوں کا قاری ہوں اور آپ میرے پسندیدہ لوگوں میں سے ہیں جنہیں پڑھ کر ایک فکری تحرک ہوتا ہے۔ اب میرے پاس آپ کی اس کتاب کے دو نسخے ہو گئے ہیں۔ یہ تو میں رکھوں گا کہ دستخطوں سے عنایت ہوا ہے اور دوسرا کسی صاحب ذوق کو دے دوں گا۔ امید ہے آپ اچھے ہوں گے۔ (میرے پاس آپ کے گھر کا پتہ نہ تھا اس لیے یہ خط کتاب پر چھپے پتے پر ہی لکھ رہا ہوں۔

ڈاکٹر رشید امجد

بھائی اسد محمد خاں صاحب، محبت اور سلام!

'کفر کی بھر آسمان' کا انتظار تھا۔ پا کر مسرور ہوں۔ آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے خدا معلوم یہ مسرت کب نصیب ہو گی۔

پروفیسر فتح محمد ملک

مکرمی اسد محمد خاں صاحب آداب،

میں آپ کا ممنون گار ہوں کہ 'برج خموشاں' کی رسید فوراً نہ دے سکا۔ نہایت ... (لفظ پڑھا نہیں جا رہا) آدمی ہوں، جس کو محبت سے خط لکھتا ہوں، مکروہات زمانہ سے ایسے خط ملتے رہتے ہیں۔ غالباً دوستی کو کراچی پہنچوں گا۔ آپ کی کتاب پر ہر طرح کے نام چھپے ہیں نہیں ہے تو اپنا پتہ اور فون نمبر۔ خیر، کسی کو تو خضر راہ کروں گا اور آپ تک ضرور پہنچوں گا، اس لیے کہ جب سے آپ کی تازہ کہانیاں پڑھی ہیں (مئی دادا) کا تو پہلے سے قائل تھا۔ اب گھائل ہوں، آپ کی ایک کہانی نے تو عجب اضطراب سے دو چار کیا۔ خیر، وہ میر اور ستن کا معاملہ ہے۔ آپ ستن لکھ چکے، اب وہ قاری کی قلمرو میں ہے۔

آپ کو بس دیکھوں گا، ملوں گا، مجھے خوشی ہو گی۔ اور کیا عرض کروں۔ ہو سکے تو مشفق خواجہ صاحب کے پاس اپنا فون نمبر چھوڑ دیں، تاکہ رابطہ کر سکوں اور ان سے مدد لوں۔ یہ رقعہ بھی مشفق خواجہ صاحب کے ذریعے بھجواتا ہوں؛ حالاں کہ وہ اپنا تحقیقی کام کرنے کے لیے کالم نگاری جیسی لعنت کو ترک کیے بیٹھے ہیں لیکن مجھ جیسوں کے لیے، ان کو اپنا وقت مسلسل برباد کرنا پڑتا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

برادرم اسد محمد خاں صاحب۔ سلام و نیاز،

آپ نے ۳۱ / اکتوبر ۱۹۸۳ء کو ایک محبت بھرا خط لکھا تھا جس میں مجھے دلاسا دیا تھا اور خود اپنے ۔۔۔ ء سے بے سایہ سفر کرنے کا ذکر کیا تھا۔ میں نے خط پڑھ کر دل میں سوچا تھا یہ بے چارے تو ہم سے بھی زیادہ کھٹر پیچ تم نکلے۔ بہر حال خدا آپ کو خوش رکھے اور مجھے ٹھیک ہدایت دے کہ دوستوں کے خطوں کے جوابات وقت پر دینے لگوں۔ دراصل گرتی ہوئی صحت اور حد سے زیادہ بڑھی ہوئی مصروفیت نے کہیں کا نہیں رکھا۔ پھر والد صاحب کے ادھورے چھوڑے ہوئے کاموں میں پھنسا رہا۔ اکتوبر ۱۹۸۳ء میں بھارت گیا تھا (حالاں کہ وہاں اب اپنا کوئی نہیں) جو گندر پال کے گھر ٹھہرا، اور وہاں سے آتا ہوا اور بہت سے کام اپنی جان ناتواں پر لاد لایا۔ آپ کے کیا حال ہیں۔

برادرم اجمل کمال عرصے سے نظر نہیں آئے۔ کیا وہ 'آج' کے پہلے شمارے سے اتنے مطمئن ہیں کہ مزید شمارے نہیں نکالنا چاہتے؟ میں اپنے افسانوں کے تیسرے مجموعے کو چھپوانے کی فکر میں ہوں۔ لیکن چھپنے کے بعد کی صعوبتوں سے نہیں گذرنا چاہتا۔ اگر کوئی پبلشر صاحب آپ کے ذہن میں ہوں تو لکھیے۔ چھ افسانے، تقریباً دو سو صفحات۔

TV.PLAYS کے علاوہ اور کیا لکھ رہے ہیں؟ ایم بی بی ایس کے زمانے میں میں نے لاہور کی فلم انڈسٹری کی دلیز پار کر لی تھی۔ مرتضیٰ جیلانی صاحب میرے ایک اسکرین پلے کو لیے لیے پھرے۔ لیکن اس کی ہیروئن

چالیس سال کی کنواری تھی اور اُسے دورے پڑتے تھے۔ کوئی نفسیاتی اُنھیں نہ ٹل سکا۔ وہ کہانی، سید شوکت حسین رضوی کو scenario کے لحاظ سے پسند تو بہت آئی (فلم تکنیک پر اُن دِنوں بہت کچھ پڑھ ڈالا تھا) لیکن جس کہانی کو انھوں نے مجھے مکمل کرنے کو کہا، وہ میرے بس کی نہیں تھی۔ پہلے ہی سین میں قتل، شک شبہ اور نہ جانے کیا کیا تھا چنانچہ میں امتحان میں لگ گیا اور یوں فلم اسٹوڈیو سے باہر آ گیا۔ خط لکھتے رہا کیجیے اور ملنے کی کوشش بھی کیجیے۔

ڈاکٹر حسن منظر

برادرم اسد محمد خاں صاحب سلام مسنون،

گرامی نامہ ملا یاد فرمائی کے لیے شکرگزار ہوں آپ نے جس محبت سے اپنے خط میں میرا ذکر کیا ہے اس کے لیے نہ صرف شکرگزار بلکہ دل سے دعا گو ہوں۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور لافانی تخلیقات کی توفیق عطا فرمائے۔ مجھے یاد ہے کہ آپ کا گیت 'مدھیا چل کی آتما'، 'نیا دور' میں شائع ہوا تھا میرے خیال میں شمیم احمد کا تبصرہ 'نیا دور' میں شائع کرنا مناسب ہوگا۔ جیسے ہی وہ تبصرہ لکھ لیں تو ایک کاپی مجھے فوراً بھجوا دیجیے گا۔ "نیا دور" کا تازہ شمارہ زیرِ ترتیب ہے اس لیے 'آپ اپنی منظومات فوراً بھجوایے۔ میں منتظر ہوں۔ "نیا دور" ایک آدھ دن میں آپ کو مل جائے گا۔ آدمی ڈاک خانے گیا تھا مگر عید کارڈوں کی لائن اتنی لمبی تھی کہ وہ واپس آ گیا۔ امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

پیارے اسد محمد خاں، خوش رہیے!

کوئی ایک آدھ ماہ پہلے شاہد رودولوی نے آپ کی کتاب 'بُرے خوشاں' دی تھی۔ دو ایک روز پیشتر میں نے کتاب کی بیشتر کہانیاں پڑھ لیں اور اتنی خوشی ہوا کہ اسی وقت آپ سے ہمکلام ہونے کو تڑپنے لگا۔ شاہد صاحب کو فون کیا کہ آپ کا پتہ مل جائے۔ (کتاب میں آپ کا پتہ درج نہ تھا) اُن سے نہیں ملا تو یہ چٹھی اپنے بھائی محمد علی صدیقی کے توسط سے بھیج رہا ہوں۔ وہ ضرور آپ کو جانتا ہوگا یا پھر ڈھونڈ ھ لے گا۔ آپ کی دو کہانیاں 'گھس بیٹھیا' اور 'بُرے خوشاں' اس قدر ہانٹ کر رہی ہیں کہ آپ کو ڈھونڈے بغیر کوئی چارہ نہیں رہا۔ یقین کیجیے یہ چٹھی لکھ کر میں گویا اپنی ہی نجات کی تدبیر کر رہا ہوں۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔

جوگندر پال

اسد ڈیئر! کیسے ہو۔

بہت دن سے کوئی ترجمہ، کوئی نظم، کوئی مراسلت نہیں۔ اچھے تو ہو؟ بہت جلد اپنی چیزیں بھیجو، اور سنو، دسمبر میں شوبنکا، پاکستان آ رہا ہے۔ ہم نے لیکچر دینے کے لیے بلایا ہے۔ اس موقعے پر اُس کے ڈراموں نظموں اور مضامین پر مشتمل SelectedWorks شائع کرنے کا پروگرام ہے۔ آپ کو جو چیز اچھی اور مناسب لگے ترجمہ کر دیں۔ مگر جولائی تک مجھے مل جائے۔ بڑا مزا آئے گا۔ آپ کو دسمبر میں لاہور آنا بھی ہوگا۔ مہمان میرے گھر، بڑی خوشی سے، کہ ایک عمر ہو گئی لاہور نہیں آئے۔ میں جواب کی منتظر ہوں۔

کشور ناہید

برادرم اسد محمد خاں! آداب۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ اِن دِنوں میرے افسانوں کی ایک انتھالوجی 'منشا یاد کے تیس منتخب افسانے' شائع ہوئی تھی، آپ کو بھیجنے کی کوشش کروں گا۔ یہ خاور نقوی نے مرتب کی ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ کچھ کہانیاں اہلِ ذوق تک ضرور پہنچنی چاہئیں کلیات تو لائبریری کی زینت بنتے ہیں۔ آپ کی کہانی 'غصے کی نئی فصل' کو ذہن سے الگ کرنے میں بہت دشواری ہوئی۔ اللہ آپ کے قلم کو طاقت دیے رکھے۔ آپ کے بارے میں ایک طالبہ کو مختصر سی رائے لکھ کے بھیجی ہے۔ یہ جیسی بھی ہے میری سچی رائے ہے۔ امید ہے آپ کبھی کبھی یاد کرتے رہیں گے؛ اگرچہ اب ہماری آپ کی مصروفیات بڑھ گئی ہیں (گھریلو اور ادبی) کہ خط لکھنے کا بھی وقت کم ملتا ہے۔ کبھی جی چاہے تو اس طرف کا چکر لگائیے۔ کوئی نئی کہانی؟ ہم ایک پرچہ 'علامت' لاہور سے نکالتے ہیں۔ اس کے لیے بھیج سکیں تو ممنون ہوں گا۔

منشا یاد

محترمی، السلام علیکم!

'کھڑکی بھر آسمان' کی ترسیل کا شکریہ۔ 'منشور' سے لے کر 'میں اور میرے لوگ' تک اس میں شامل ہر تحریر اپنے اُسلوب کے اعتبار سے منفرد ہے۔ نظموں کا حصہ جدید تر حیثیت کا حامل ہونے کے باوجود نامانوس نہیں لگتا۔ بلکہ ہر نظم ایک داخلی کشش کے ذریعے پڑھنے والے کو فوری طور پر اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اسی طرح فسانوں کی علامتی اور تجریدی فضا، بہت سے نئے امکانات کی نشان دہی کرتے ہوئے، بھرپور تاثر چھوڑتی ہے۔ کتابت اور طباعت کے اعتبار سے بھی اس میں ایک خاص قسم کی جدت پائی جاتی ہے۔ اس کتاب کو اردو ادب میں ایک خوبصورت اضافہ قرار دینا بے جا نہ ہوگا۔ میرے بھائی، آپ سچے اور کھرے آدمی ہیں۔

مسیح الدین احمد صدیقی

پا پیر، پا پیر تسمہ پا، جناب اسد محمد خاں صاحب قبلہ! آداب۔

'بُرے خوشاں' پہنچ گئی۔ احمد سہیل سے احمد داؤد اور احمد داؤد سے محمد اظہار الحق کی معرفت۔ اور آپ کی تحریروں کا تسلسل، گذشتہ دو دنوں میں، کتاب میں شامل 'مناجات' تمیں چالیس فرلانگ کو سنا چکا۔ ریش بکروں اور گھوڑوں سے چھپ چھپا کر۔ بے ثمر نے قوالوں اور ڈوم ڈھاڑیوں سے بچ بچا کر۔ شیر شاہ سوری کو دوبارہ ٹیلی وژن سکرین پر دیکھا اور آپ بےطرح یاد آئے۔ آپ کی آواز گلے ورد ہے۔ جانے اس حیاتِ مستعار میں دوبارہ ملاقات ہوتی ہے یا نہیں۔ میں ان دنوں "پاکستانی ادب" پانسو صفحات میں انتخاب کر رہا ہوں۔ آپ کا ایک گیت اور افسانہ 'ترلوچن' چنے ہیں۔ "اورنگ" پریس جا رہا ہے۔ خدا نے چاہا تو بہت جلد رسالہ خدمت کروں گا۔ انور شعور تک سلام پہنچے۔

مرزا حامد بیگ

برادرم السلام علیکم!

ایک مدت سے نامہ و پیام موقوف ہے۔ چند دن ہوئے ایک دکان

پر آپ کی کتاب "برج خموشاں" نظر آئی فوراً خرید لی۔ دو تین افسانے پڑھے ہوئے تھے، بعض میرے لیے نئے تھے۔ اب افسانہ لکھنے والے ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ ان میں آپ بھی ہیں۔

ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا: کئی سال پہلے اپنے دوست محمد عمر میمن کو، جو اردو افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ کرتے رہتے ہیں، ترجمے کے لیے آپ کا کوئی افسانہ تجویز کیا (اب یاد نہیں کون سا تھا)۔ انھیں افسانہ تو پسند آیا لیکن ترجمے کی طرف نہ آئے۔ کہنے لگے کہ یہ ٹیڑھی کھیر ہے۔ وہ تو ہمت ہار گئے لیکن کبھی موقع ملا تو ترجمے کی جسارت خود ہی کروں گا۔ آپ کو شاید کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ امید ہے کہ بخیر ہوں گے۔

محمد سلیم الرحمٰن

"برادرم اسد محمد خاں صاحب!" دفاداروڈ ادا پستہ دلاوام روڈ ادا پنگ"، یعنی السلام علیکم۔

کراچی دوران قیام آپ سے ملاقات نہ ہو سکنے کا افسوس ہے۔ افسوس تو اور بھی بہت سے ہیں۔ جب آدمی کی لگام دوسرے کے ہاتھوں ہو تو پھر اس کے چاہنے نہ چاہنے سے کوئی لمبا چوڑا فرق نہیں پڑتا۔ بہرحال۔ حضرت، میں نے چکوئن کی پاکستانی کہانیوں کے مترجم کی کتاب کے لیے "سی دادا" کا ترجمہ کرلیا ہے جو آپ کی صوابدید کے لیے ملفوف ہے۔ آپ ٹھونک بجا کر دیکھ لیں، بلکہ جمیا جتا کر اطمینان کرلیں کہ آپ کے عندیے کی مسلمانیاں تو نہیں ہو گئیں۔

اور اگر بعد انخواست ہو گئی ہوں تو اس صورت میں جناب خود ترجمہ کر کے بھیج دیں۔ میری انگریزی کی صلاحیت پہ آپ کو بہت زیادہ اعتبار تو شاید کبھی نہیں تھا۔ دو چار لفظ گرفت میں نہ آئے، اور ایک آدھ جملہ بھی۔ لغت دیکھی تو وہاں وہ الفاظ نا پید تھے۔ ذرا جلد از جلدان کی وضاحت فرما دیں۔ میں نے ایسے تمام مقامات کی حواشی میں نشان دہی کر دی ہے اور سب سے پہلا کام آپ یہ کریں کہ خط ملتے ہی رسید اگلی ڈاک سے بھیج دیں تا کہ مجھے تسلی ہو جائے کہ ترجمہ منزل مقصود پر پہنچ گیا ہے۔ دو تین دن جو ترجمے پر لگے اچھے گزرے۔ کم ہی ایسی صحبت رہتی ہے۔ بیشتر کو اردو لکھنے کی تمیز نہیں۔ جو چند حضرات استثنیٰ میں آتے ہیں ان میں نیر مسعود اور آپ سرفہرست ہیں، اور پھر شمس الرحمٰن فاروقی اور محمد سلیم الرحمٰن، اجمل کمال وغیرہ۔ باقیوں کا خدا حافظ! اور کیا حال ہیں حضور (پر نور)؟ کن نئی فتوحات مکیہ میں لگے ہوئے ہیں؟ کیا کچھ نیا لکھا؟ کیا کچھ لکھنے سے رہ گیا؟ کیا کچھ لکھنے کی حسرت ہے؟

محمد عمر میمن

محترم اسد محمد خاں صاحب!

آپ کی کتاب "برج خموشاں" ملے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں؛ جس کو میں نے انھی دنوں میں پڑھ ڈالا تھا۔ بعض چیزیں پہلے سے میری نظر سے گذر چکی تھیں۔ انھیں دوبارہ پڑھا اور پھر ایک بار مزا آیا۔ دوسری چیزیں نئی تھیں، وہ مجھے سوغات کی طرح لگیں۔ میں دیر سے سہی مگر تہہ دل سے آپ کی اس نوازش کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے یاد رکھا اور اتنی عمدہ کتاب عنایت کی۔ میرے لیے یہ امر بھی خوشی کا باعث تھا کہ آپ نے کتاب کو نہایت نفیس طریقے سے، اور اچھی کتابت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ یہ چیز آج کل لوگوں کی نظروں سے نکلتی جا رہی ہے۔ پبلشر نہایت ردی لکھائی کے ساتھ خراب کاغذ پر چھاپتے ہیں۔ میری کتاب کوئی لائبریری لاہور نے چھاپا۔ مگر اس میں اتنی کتابت کی غلطیاں تھیں کہ میں نے کتاب کو لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اب خیال ہے کہ اس کا دوسرا ایڈیشن خود چھپوا کر، کم از کم دوستوں میں تقسیم کر دوں۔ دوسرا مجموعہ افسانوں کا تیار ہے اور اس سلسلے میں آپ سے مشورہ لینا چاہتا ہوں۔ یہ بتائیں کہ آپ کی طرح اگر یہ کتاب خود چھپوائی جائے، تو اس پر کیا لاگت آئے گی؟ پبلشروں کے چکر میں پڑنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ کیوں کہ یہ لوگ کتاب کا مسودہ لے کر اُسے دراز میں رکھ دیتے ہیں۔ نئی دہلی کے مکتبہ جامعہ نے میرے ساتھ یہی کیا۔ چار سالوں کے بعد میں نے انھیں لکھ دیا کہ میری کتاب کیا شاعت اپنے پروگرام میں سے نکال دیں۔ آپ کے افسانوں میں مجھے کہانیاں پڑھنے کو ملیں اور اس چیز کو میں بہت اہمیت دیتا ہوں۔ کیوں کہ، جب تک بات میرے پلے نہیں پڑے گی، اس وقت تک میں لکھے ہوئے سواد سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ ...... نے مجھے اپنی کتاب دی تھی، جس کی اکثر کہانیاں میرے پلے نہیں پڑیں۔ یہاں پر، آسٹریا میں، جہاں پر ہم، ان دنوں تعطیلات کے سلسلے میں آئے ہوئے ہیں، یہ ٹرینڈ دیکھنے میں آتا ہے کہ زبان کی طرف خاص توجہ دی جا رہی ہے، کہانی کی طرف نہیں۔ اس حد تک تو میں سمجھ سکتا ہوں، کیوں کہ کہانی نئی زبان کا تجربہ تو ملتا ہے۔ ابھی یہ مرحلہ اردو ادب میں نہیں آیا۔ بلکہ وہاں پر کہانیوں کو اس زبان میں لکھنے کی ضرورت ہے جو وہاں کے معاشرے کو صحیح معنوں میں پیش کر سکے اگر معاشرہ ٹوٹ رہا ہے تو اردو کے مغلق لکھنے میں کیا تک ہے؟ پھر ایک بار کتاب بھیجنے کا شکریہ

منیر الدین احمد

برادرم اسد محمد خاں!

'صدف' کے "رئیس فروغ نمبر" کے لیے سائیکلو سٹائلڈ دعوت تحریر پر آپ کے دستخط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ مجھے اس کام سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے تو اس وجہ سے کہ آپ کا اس سے تعلق ہے۔ البتہ یہ مشکل درپیش ہے کہ مرحوم کا کوئی مجموعہ کلام تو سامنے ہے نہیں کہ کچھ اس حوالے سے لکھ سکوں؛ اور اس کے سوا میرے لکھنے کی کوئی وجہ بھی نہیں بنتی۔ ہاں ایسی چیزیں منتخب کر کے بھجوا دیں، جو اوّل تو آپ کو پسند ہوں (ام ضحے کی حیثیت سے) اور دوسرے، آپ کے خیال میں تجزیاتی مطالعہ طلب کرتی ہوں۔ پھر میں ان میں کوئی ایک چن لوں گا اور ایک تجزیہ لکھ دوں گا۔ اندریں حالت اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اگر آپ کی نظر میں کوئی دوسری صورت ہو تو فرمایئے، ورنہ اسی پر غور فرمایئے۔ اپنے حصے کی زحمت قبول کیجیے اور باقی کے لیے مجھے کچھ وقت (دو تین ہفتے) عنایت کر دیجیے۔ ایک سے زیادہ چیزوں کا انتخاب اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے بھی تو اپنی جگہ یہ وہم رہے کہ میں اپنی پسند سے یہ کام کر رہا ہوں۔ اگرچہ یہ خوشی بھی شامل ہوگی کہ: مشفق گر دید رائے بوعلی با رائے من

خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔ دوستوں کو سلام پہنچے۔

مظہر علی سید

برادرم اسد محمد خاں صاحب! آداب۔

اجمل کمال نے آپ کا اتنا اچھا خط دیا۔ پڑھ کر خیال ہوا کہ میرا اہم نام کوئی اور بھی ہے۔ اُس کی قسمت پر رشک آیا کہ میرا پسندیدہ ترین افسانہ نگار اُسے پسند کرتا ہے۔ منصوبہ یہ تھا کہ اجمل سے آپ کے بارے میں خوب جم کر گفتگو ہوگی 'جانی میاں' کے بارے میں کچھ بات بھی ہوئی۔ مجھے یہ بات بہت تکلیف دہ معلوم ہوئی تھی کہ آپ نے جانی میاں کے سے انوکھے اور جان دار کردار کو بنا کر مٹا دیا۔ اس انکشاف نے عجب صدمہ پہنچایا کہ یہ جعلی کردار تھا۔ آپ سے بھی شکایت پیدا ہوگئی تھی۔ پھر اچانک آپ کی چابک دستی کا احساس ہوا کہ ایک غیر متعلق پڑھنے والا، جسے جانی میاں سے کوئی جذباتی لگاؤ نہیں ہو سکتا، اس کے پردے میں ایک پیشہ ور اداکار کو دیکھ کر ایسے صدمے سے دوچار ہوتا ہے تو سلطان بھائی کے لیے یہ کتنا بڑا صدمہ ہو سکتا ہے۔ یہ احساس پیدا کرنے کا اس سے بہتر پیرایہ ممکن نہیں تھا۔ اور جانی میاں کے ساتھ سلطان بھائی کا جذباتی لگاؤ پورا صفحہ اس طرح ظاہر نہیں کر سکتا تھا جس طرح جو حید نے مجھے سے کہے ہوئے اس کے ایک جملے، ''انھیں ہاتھ پکڑ کر سڑک پار کرانا'' نے ظاہر کر دیا ہے۔ اجمل سے 'ایک سنجیدہ ڈیٹیکٹو اسٹوری' پر بھی لمبی گفتگو کرنا تھی۔ لیکن سارا منصوبہ جس طرح تہہ بالا ہوا اس کا علم آپ کو ہو چکا ہوگا۔

زقدرت ملکوتش یکے نشاں آن است   کہ کار ہا بہ خلافِ مراد ما باشد

مَیں ابھی بستر سے لگا ہوا ہوں۔ بولنے تک کی اجازت نہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ ممانعت اتنی شدید نہیں کہ سخت ضرورت پڑنے پر بھی نہ بولوں۔ لیکن سخت ضرورت شاید کبھی نہیں پڑتی۔ خلاصہ یہ کہ اگر بولتا ہوں تو بلا ضرورت بولتا ہوں۔ فون پر گفتگوئیں البتہ ختم کر دی ہیں۔ طبیعت بدمزہ اور غیر حاضر رہتی ہے۔ جس کی تیر بہدف دوا یہ ہے کہ آپ کا کوئی تازہ افسانہ یا خالد اختر صاحب کی نئی تحریر پڑھنے کو مل جائے۔ ذرا خیال رکھیے گا۔ تفصیل سے ان شا اللہ طبیعت بحال ہونے پر خط لکھوں گا۔ اسے اپنے خط کی رسید اور بہت بہت شکریہ سمجھیے۔

نیر مسعود

ڈیئر مکرم! تسلیم۔

'کھڑکی بھر آسمان' کی تمام جلدیں نسیم احمد میرے حوالے کر گئے تھے۔ کتاب جن جن لوگوں کے نام تھی اُن کو پہنچا دی گئی۔ صرف ایک جلد مظہر الاسلام کے نام رہ گئی ہے، وہ بھی دو ایک دن میں ان تک پہنچ جائے گی۔ اعجاز راہی، اقبال فریدی اور منشا یاد کے نام جو جلدیں تھیں وہ مَیں نے احمد داؤد کے حوالے کر دی تھیں۔ احمد داؤد نے مجھ سے کہا کہ آپ مجھ پر اعتماد کریں، مَیں کتابیں پہنچا دوں گا۔ کتاب کے خوبصورت نام کے انتخاب، اور اس خوب صورت کتاب کی طباعت پر دلی مبارک باد قبول کریں۔

فرصت یا عدیم الفرصتی کا عالم یہ ہے کہ نسیم احمد کی واپسی کے بعد آپ کو کتاب کی رسید کی طور پر خط لکھنے کی مسلسل کوشش کرتا رہا ہوں، سو اس چھوٹے سے کام میں آج کامیاب ہو سکا ہوں۔ اس دوران میں شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی کی دعوت پر یومِ اقبالؒ کی تقریب میں شرکت کے لیے مَیں ۱۱ر نومبر کو پشاور گیا تو مَیں نے خاطر غزنوی سے وعدہ کر لیا کہ ان کے رسالے "احساس" کے لیے "کھڑکی بھر آسمان" اور بعض دوسری کتابوں پر تبصرے لکھ بھیجوں گا۔ جب آپ کی کتاب پر تبصرہ لکھ دوں گا تو اس کی ایک نقل آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ اس سے پہلے آپ خاطر غزنوی کے نام کتاب کی ایک جلد بھیج دیں۔ وہ اس کتاب کے پڑھنے کا اشتیاق رکھتے ہیں۔ اور سب بدستور۔ امید کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ ذرا نسیم احمد کو فون کر کے کہیے کہ وہ نذر چودھری کی کتاب کا فوٹو اسٹیٹ بھیج دیں انھیں خط لکھنا چاہتا ہوں اور لکھ نہیں پاتا۔

نظیر صدیقی

ڈیئر اسد محمد خاں!

'دریافت' کا نیا شمارہ کل چھپ کر آ جائے گا۔ ۱۲ر اپریل کو ہم یہ شمارہ اور پچھلا شمارہ دونوں آپ کی خدمت میں بھیجیں گے۔ مجھے امید ہے آپ دیکھ کر تھوڑا بہت خوش ضرور ہوں گے۔ اگر ممکن ہو، اور یہ پرچہ پسند آئے تو اپنی کوئی تازہ کہانی چھپنے کے لیے، مضمون کیسا تھا یا مضمون کے بغیر، بھیج دیجیے۔ اگر آپ کا جی چاہے تو آپ نظم یا غزل یا نظم بھی بھیج سکتے ہیں۔ مجھے آپ کی کہانیاں بہت پسند ہیں۔ اگر آپ کے کوئی دوست آپ کی کہانی پر مضمون یا تبصرہ لکھیں۔ یا دو تین دوست مل کر تجمل نالک کریں تو مَیں شائع کرنے میں بڑی مسرت محسوس کروں گا۔ ساقی نے اپنی کچھ انگریزی نظمیں بھیجی ہیں تو وہ بھی مَیں 'دریافت' میں شائع کر دوں گا۔ اگر آپ ایسا کرنا پسند کریں تو مَیں آپ کے گھر ساقی کی انگریزی نظمیں پہنچوا دوں گا۔ اپنی رائے مجھے جلد لکھیے، انتظار کروں گا۔

قمر جمیل

پیارے اسد

مجھے معاف کر دے کہ اتنے دنوں بعد تیرے خط کا جواب دے رہا ہوں۔ اصل میں آتے ہی اپنے دفتر کے کمپیوٹر ور زندگی اور آمد (نظموں کی آمد) میں اس طرح الجھا کہ جس خاطر جمعی کی ضرورت تیری نظموں کو درکار ہے عنقا تھی۔ اور ابھی کچھ نسیم بھائی کی نظموں غزلوں کے ساتھ ہوں انشا اللہ نومبر میں دونوں مجموعے ترتیب دے کر بھیجوں گا۔ مجھے صدق دل سے معاف کر دے کہ تو اور کیا کر سکتا ہے مگر تجھے قسم ہے کہ انتقام نہ لے اور فوراً میری نظموں پر اپنی رائے بھیج۔ خوبصورت بھابھی (اسے تو lucky ہے، سالے!) اور سندر سندر بھتیجوں کو میری طرف سے سلام اور پیار پہنچا۔ مَیں تجھ سے بہت شرمندہ ہوں مگر مجھے ذلیل جان کر معاف کر دے۔ فوراً خط لکھ۔ اپنی نئی چیز یں بھی فوراً بھیج۔

ساقی فاروقی

اسد بھائی!

'آسیبی گھر' آپ تک پہنچ گیا ہوگا۔ پچھلے دنوں جو کچھ لکھا اُن میں سے کچھ کے عکس آپ کی لیے ہیں۔ مقصد یہ کہ آپ کو خط لکھنے کی کوئی صورت بن جائے۔ ایک حکایت بھی لکھی ہے، جس کی کاپی اس وقت مو جود نہیں۔ اگلے خط میں سہی۔ روز و شب کی یکسانیت بہت پریشان کرتی ہے۔ آپ کا خط ملے تو کچھ دیر کے لیے ہی سہی فضا بدل جائے۔ اجمل اگر آئے ہوں تو سلام کہیے گا۔ باقی سب بدستور ہے۔

ثروت حسین

محترمی، السلام علیکم۔

آپ کی ارسال کردہ کتاب 'کھڑکی بھر آسمان' ملی، شکریہ۔ اس کتاب میں شامل نظمیں اور کہانیاں اپنے اچھوتے مواد اور منفرد تکنیک کے باعث اردو ادب میں قابلِ قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اکثر نظمیں نئے مگر مانوس الفاظ سے منور ہیں اور سماجی مسائل کو نیم فلسفیانہ انداز میں پیش کر کے قاری کو ایک تازہ احساس سے ہمکنار کرتی ہیں۔ ترجمے کے لیے منتخب کی گئی نظمیں اور ان کے تراجم، مروجہ تصورات کے برعکس، ایک نئے شعری تناظر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کہانیوں میں اساطیری رنگ اور قدیم تلمیحات کے استعمال نے ایک نیا پن پیدا کیا ہوا ہے۔ تکنیک کے نئے تجربوں کے علاوہ فقروں کی ساخت اور اسلوب کی پختگی اُن کی ایک اضافی خوبی ہے۔ مجھے امید ہے کہ معیاری ادب پڑھنے والوں میں یہ کتاب مقبول ہوگی۔

شفیق الرحمٰن

پیارے خاں صاحب!

تمہاری غیر معمولی کتاب ملی تھی۔ بعض افسانے دوبارہ پڑھے۔ لیکن سب سے بہترین چیز تمہاری مناجات / دیباچہ / افسانہ تھا۔ تمہارا طرزِ نظم سب میں منفرد ہے اور کمال یہ ہے کہ تم ایک سے زیادہ طرز میں لکھنے پر قادر ہو۔ میں عرصے سے بیمار ہوں۔ تمہاری کتاب جب ملی تھی تو اُس وقت کچھ زیادہ ہی بیمار تھا۔ چند ہفتوں بعد آپریشن کے لیے دلی گیا لیکن سوءِ اتفاق یہ کہ آپریشن سے عقدہ کو حل نہ ہوا۔ اب آہستہ آہستہ بہتر ہو رہا ہوں۔ 'شب خون' کے لیے کچھ بھجواؤ۔

شمس الرحمٰن فاروقی

اسد!

مَیں یہ منحوس خبر تمہارے خط آنے سے پہلے پڑھ چکا تھا۔ خلیل صاحب کی موت کو اب تک قبول نہیں کر سکا۔ اس پر کیسے یقین کروں۔ بچپن سے اب تک اتنی موتیں دیکھ چکا ہوں کہ اب موت کے تصور سے کانپ جاتا ہوں۔ تم میری بزدلی سے اس ذہنی کیفیت کا اندازہ کر سکتے ہو۔ کیم جون (۸۷ء) ختم نہیں ہوئی کہ ۳۱ر نومبر نے آلیا۔ تم لوگ کراچی میں کیسے ہو، اس کو برداشت کر لے گئے۔ مجھے دیکھو، مَیں اکیلا ہوں۔ بیوی محبت کرتی ہے لیکن وہ اس کا اندازہ نہیں کر سکتی کہ اطہر نفیس میرے لیے کیا تھے۔ اور وہ نہیں رہے تو کیا مَیں وہ رہ گیا ہوں جو تھا؟ پچھلے تین سال سے مَیں اپنے کو جس جس طرح سے اذیت دے رہا ہوں کچھ مَیں ہی جانتا ہوں۔ زندہ رہنے کے عمل میں زندگی کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ یوں کہنے کو زندگی اور زمانے کا ہرنا زاٹھا رہا ہوں۔ اسد، تم خوش قسمت ہو کہ اطہر بھائی کو کاندھا تو دے سکے۔ تمہاری نظموں نے اُس کمی کا کس تو محسوس کیا جو تمہارے اور اطہر بھائی کے درمیان حائل ہوئی۔ ساقی اور مَیں اس سے بھی محروم رہے۔ مَیں کتنے چاؤ سے پاکستان آنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ اب کیا کروں گا آ کر۔

اِس گلی میں بہت سی دستکیں روپوش ہیں
اُس گلی کے موڑ پر اِک گھر تھا کل تک، کیا ہوا

اور کوئی جواب نہیں دیتا۔ ایک گھر سرسید نگر میں تھا، اور ایک کراچی میں۔ ایک دو گھر اور بچے ہیں، خدا کرے کہ آباد رہیں۔ اب مزید غم اُٹھانے کی سکت نہیں ہے۔ مَیں نیچے اور نیچے کی طرف پھسلتا جا رہا ہوں۔ بیچ میں کہیں رُکنا اب شاید میرے لیے ممکن نہیں۔ تم اپنے کو سنبھالو، سیم بھائی کو تسلی دو۔

اُس کی روح کو سکون اُسی وقت ملے گا جب ہم جیسے 'کو' کا ر مثال' بنا دیں گے۔ اعجلی کی موت میں تو دنیا کا بھی ہاتھ تھا۔ اُس غم کو تو نفرت نے آلودہ کر دیا تھا۔ اِس غم کا حاصل تو صرف محبت ہے اور محبت کے لیے ہم زندہ رہیں گے۔ جنوری میں اطہر بھائی کی یاد میں حلقے سے منانے کا پروگرام ہے۔ تم نے جو تین نظمیں بھیجیں تھیں اُن میں سے دو کا انگریزی میں ترجمہ میرے ایک عزیز دوست نے کر لیا ہے۔ وہ مضمون بھی لکھنے والے ہیں۔ کچھ اور چیزیں بھی کی جائیں گی۔ وہاں بھی تم لوگ یاد منانے کا کوئی معقول پلان بناؤ۔ مجھے اپنے سے باخبر رکھو۔ تم میں اور سیم بھائی میں ہی اب مجھے اطہر بھائی مل سکتے ہیں۔ 'کلام' کے بعد کی چیزیں، جتنی بھی دستیاب ہو سکیں، مجھے بھجواؤ۔ اُن کی کچھ تصویریں بھی مجھے درکار ہیں۔ ہاشمی دہلی میں بہت اداس ہے۔ مَیں اور وہ اس خبر کے بعد سے نہیں ملے۔ نہ اُس میں تاب ہے نہ مجھ میں حوصلہ۔ ملیں گے تو نہ جانے کیا حال ہوگا۔ مَیں نے اس خوف سے دہلی کے کئی کام ملتوی کر رکھے ہیں۔ مَیں شرمندہ ہوں کہ اتنی دیر میں تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ ویسے یہ اچھا ہی ہوا۔ وہ حالت بہت خطرناک تھی۔ نہ جانے کیا لکھ جاتا۔ اطہر بھائی کے بھائیوں عزیزوں کو میری طرف سے تسلی دو۔ خدا تم کو اس غم کو برداشت کرنے کا حوصلہ دے۔

شہریار

برادرِ محترم، سلام و نیاز۔

'کھڑکی بھر آسمان' کا بہت انتظار کیا۔ سید مظفر علی نے بتایا تھا کہ آپ نے اس کا ایک نسخہ میرے مطالعے کے لیے ارسال کیا ہے لیکن آپ کی کتاب خاطرِ غزنوی نے کوئی پانچ ماہ کے بعد، چند دن قبل عنایت کی۔ بہر حال مَیں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے اتنی بامعنی اور خوبصورت کتاب میرے مطالعے کے لیے مرحمت کی۔ لیکن بھائی! اس میں اپنے گیت بھی شامل کرتے نا۔ ہم تو آپ کے گیتوں کے بھی عاشق ہیں۔ 'جریدہ' کی تین کاپیاں ارسال کر چکا ہوں۔ رسید اور رائے کا انتظار رہے گا۔ افضال سید اور اقبال حیدر کو بھی اپنی پہلی فرصت میں 'جریدہ' پہنچا دیجیے، کرم ہوگا۔ 'جریدہ' کے لیے کچھ بھجوائیے بھی۔ اپنا بھی اور دوستوں کا بھی۔

تاج سعید

ریگِ صحرا

حمد باری تعالیٰ

سعید رحمانی (کٹک، بھارت)

ریگِ صحرا کو تو گلزار بنا دیتا ہے
خشک پیڑوں کو بھی پھلدار بنا دیتا ہے

نام لیکر ترا کرتا ہے جو آغازِ سفر
اس کی راہوں کو تو ہموار بنا دیتا ہے

حوصلہ جن میں نہیں ان کے لئے تو اکثر
رہِ آساں کو بھی دشوار بنا دیتا ہے

علم والے اگر ہو جائیں عمل سے خالی
پھر تو نا اہل کو سردار بنا دیتا ہے

کشتیاں سب کی کناروں پہ پہنچ جاتی ہیں
تند موجوں کو تو پتوار بنا دیتا ہے

سر جھکاتا ہے ترے سامنے جو بھی مولا
اس کو تو صاحبِ کردار بنا دیتا ہے

کبھی درویش کو دیتا ہے شہنشاہی بھی
اور تونگر کو بھی نادار بنا دیتا ہے

تری توصیف میں کہتا ہے جو اشعار سعیدؔ
اس کے ہر لفظ کو شہکار بنا دیتا ہے

نعت رسول مقبول ﷺ

اسلم راہی (اسلام آباد)

یاد آتی ہے جو طیبہ کی فضا طیبہ کو چل
ہاتھ میں یہ ہاتھ لے بادِ صبا طیبہ کو چل

بے سروسامانیاں ہیں زندگی کی اور ہم
ناتواں جائیں کہاں دل نے کہا طیبہ کو چل

رابطہ کرنا ہے طیبہ کے سفر سے استوار
بے یقینی کی فصیلوں کو گرا طیبہ کو چل

آرزو مجھ سے مخاطب ہے کہ تجھ کو چاہیے
شہرِ طیبہ کی اگر آب و ہوا طیبہ کو چل

بے سہارا ہوں سہارا ڈھونڈنے جاؤں کہاں
جب کہا میں نے مجھے آئی صدا طیبہ کو چل

وہ بدلتے ہیں سرِ لوحِ جبیں لکھا ہوا
سوچ مت نادان اُٹھ قسمت بنا طیبہ کو چل

صورتِ محشر یہ دنیا ہے یہاں سنتا ہے کون
والیٔ طیبہ سے حالِ دل سنا طیبہ کو چل

چشم پوشی کام ان کا عفو ہے ان کا شعار
درگزر کرتے ہیں وہ سب کی خطا طیبہ کو چل

تجھ پہ بھی ہونے لگیں گی رحمتوں کی بارشیں
آنسوؤں میں ڈھال کر صلِ علیٰ طیبہ کو چل

اے مرے بھٹکے ہوئے راہیؔ تجھے گر چاہیے
صاف سیدھا اور سچا راستہ طیبہ کو چل

نعت شریف

علیم صبا نویدی (چنئی بھارت)

سلسلہ در سلسلہ مجھ سے ہے رشتہ آپؐ کا
نقش ہے یوں دیدہ و دل میں سراپا آپؐ کا

آپؐ کے قدموں کی برکت سے ہے نورانی زمیں
ہر طرف کون و مکاں میں نور پھیلا آپؐ کا

لب کی دیواروں پہ روشن آپ کا اسمِ جمال
آنکھ کی دہلیز پر رخشندہ جلوا آپؐ کا

زندگی کے زاویہ روشن سے روشن تر ہوئے
مری سانسوں سے بندھا ہے جب سے ناتا آپؐ کا

قسمتیں کاغذ کی چمکیں' لفظ نور آور ہوئے
فکر کی پوروں سے جب بھی نور ٹپکا آپؐ کا

اوج پہ پہنچا زہے قسمت اجالوں کا نصیب
رونقِ عالم نے پایا نوری چہرا آپؐ کا

سوچ مہکی' چاندنی افکار کی پھیلی صبا
صیقلِ ادراک سے جب عکس جاگا آپؐ کا

نعت

کرشن پرویز (روپڑ بھارت)

کتنی عجیب دیکھئے شانِ رسول بھی
برسائے جس نے سب پہ ہی رحمت کے پھول بھی

جب بھی چلا ہوں جانب کعبہ تو دشت کا
میرے لیے تو پھول بنا تھا ببول بھی

دنیا کو کرتے اب بھی حقیقت سے روشناس
انمول گیان دیتے ہیں ان کے اصول بھی

جس کی زباں پہ نامِ نبیؐ گونجتا رہا
اللہ نے درگزر کی ہے اسکی تو بھول بھی

دولت ہے جس کے پاس یہ ایماں کی دوستو
اس سے تو خوش ہوئے ہیں دیکھو رسول بھی

رنج و الم کی یورش کا فور ہو گئیں
کھِل کھِل گئے ہیں جا کے وہاں تو ملول بھی

دلدار کی تو بات ہی پرویزؔ اور ہے
مجھ کو تو ہے قبول مدینے کی فصیل بھی

نعتِ رسولؐ

مظہر بخاری (میاں جنوں)

جونہی نبیؐ کے نور کی تشکیل ہو گئی
اِک عکسِ ر ا تمام کی تکمیل ہو گئی

فطرت کے ذہن میں تھے سراپے جدا جدا
یکجا ہوئے تو نور کی ترسیل ہو گئی

پہلے تو شر مجاز پہ پسپا نہیں ہوا
پھر یوں ہوا کہ فتحِ ر ابابیل ہو گئی

فاراں کی وادیوں سے جب اترے زمین پر
آب و ہوائے شہر ہی تبدیل ہو گئی

نورِ نبیؐ کے فیض سے تاریک رات بھی
مظہر رخِ ر حیات میں تحلیل ہو گئی

نعتِ رسولِ مقبولؐ

ناصر عباس ناصر (ماڑی شہر)

بدرالدجیٰ ہیں آپؐ ہی شمس والضحیٰ ہیں آپؐ
ظلمت سرائے دہر میں نور و ضیاء ہیں آپؐ

ویسے تو معتبر ہیں زمانے میں سب نبی
جو فخرِ انبیاء ہیں وہ خیر الوریٰ ہیں آپؐ

وہ کیوں نہ اپنے دل کو مدینے کا نام دے
جس کے بھی دل یا نبیؐ جلوہ نما ہیں آپؐ

نازاں ہے جن کی خلقتِ اقدس پہ خود خدا
کونین میں وہ منبعِ جو دو سخا ہیں آپؐ

ناصر تمہاری ذاتِ مقدس پہ کیا لکھے
اے وجہِ دو جہان دلیلِ خدا ہیں آپؐ

نعت

خورشید انور رضوی (اسلام آباد)

طلب رہی ہے اسے پھر سدا مدینے کی
ہوئی نصیب جسے بھی ہوا مدینے کی

گلی گلی جو اڑاتی ہے پھر کے باس اپنی
اڑا کے لائی ہے خوشبو صبا مدینے کی

ہزار رشک سے دیکھے ہے جس کو خود جنت
وہ ایک بستی ہے سب سے جدا مدینے کی

نثار تجھ پہ کروں جاں اے زائرِ طیبہ
کوئی تو بات مجھے بھی سنا مدینے کی

میں اور کیا دوں دعا تجھ کو اے مرے ہمدم
لگن تجھے بھی لگائے خدا مدینے کی

نفس نفس میں سمائے ہوئے ہیں خود آقا
بسی ہے دل میں نظر میں فضا مدینے کی

کہاں سے لفظ وہ لاؤں بیاں کروں جن سے
برس رہی ہے جو دل پر گھٹا مدینے کی

نظر لگی ہے مری جانبِ حرم خورشید
پھر آس پوری کرے گا خدا مدینے کی

نعت شریف

پروفیسر حامدی کاشمیری (سری نگر)

کاشفِ رازِ عالمیں تو ہے
عارفِ ذات با یقیں تو ہے

معجزہ کار ہر قدم تیرا
دشت میں خلد آفریں تو ہے

ہے گزر تیرا آسمانوں میں
یوں تو وابستہ زمیں تو ہے

دیکھے جسکو گوش شنوا ہے
حق کا پیغام دلنشیں تو ہے

تجھ سے احوالِ دل نہیں مخفی
میری شہ رگ سے بھی قریں تو ہے

اب بلا لے مجھے مدینے میں
آرزوئے دلِ حزیں تو ہے

بلا چیمپئن

اصغر ندیم سید (لاہور)

اس کا نام کچھ بھی ہوگا۔ مگر اسے سب گھر میں بلا کہتے تھے۔ نہ اس کی آنکھیں بلی جیسی۔ نہ اس کا رنگ بھورا تھا۔ گھس میلا رنگ اوپر سے کلوٹے کپڑے۔ گھر میں ایسے پڑا رہتا تھا جیسے کوئی پالتو جانور ہو یا کوئی جھاڑ پونچھ کا کپڑا۔ ابھی مشکل سے پانچ چھ سال کا بلا اصولاً بلونگڑا ہی تھا۔ اور چھیچھڑوں ملے گوشت اور قیمے سے اس کی زبان آشنا ہو چکی تھی۔ گھر میں کبھی بکرے کی سری۔ کبھی پھیپھڑے۔ کبھی کلیجی اور کبھی کھیری کی بوٹی اور کبھی کبھار پائے آ جاتے تھے۔ اسے بس اتنا پتہ تھا کہ اسکا باپ اور چاچا ہفتے میں دو دن گھر میں پڑے رہتے یا اپنی خالی دکان کھول کر محلے کے بابوں سے گپیں لگاتے ہوئے لاہور کے اچھے دنوں کو یاد کرتے رہتے ہیں جب حلیم ہریسے۔ نہاری۔ شب دیگ اور پٹھوروں کے ذائقے میں ملاوٹ نہیں ہوئی تھی۔ بلا نہیں جانتا تھا۔ اس کا باپ اور چاچا چھریاں اور لکڑی کی کھوڑی لے کر منہ اندھیرے کہاں چلے جاتے ہیں۔ ایک دن اچانک اسے باپ نے بلایا اور حکم دیا کہ اب شام کو جلدی سو جایا کرو۔ صبح منہ اندھیرے تمہیں ہمارے ساتھ کام پہ جانا ہے۔ ایک پل تو اس کے اندر جھر جھری پیدا ہوئی۔ دوسرے پل دل میں خوشی کی لہر پھوٹی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اسے سکول میں داخل ہونے کا جو خوف لگا ہوا تھا وہ اسی پل میں ختم ہو گیا۔ اب وہ کبھی سکول نہیں جائے گا۔ ہمیشہ کے لئے جان چھوٹ گئی۔ صبح منہ اندھیرے وہ گہری نیند میں تھا کہ ایک ہی چٹکل میں باپ نے اسے اچک لیا۔ اور وہ آنکھیں ملتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اس کو جو پہلا کام سونپا گیا وہ کپڑے میں لپٹی کی طرح کی بھاری اور ہلکی چھریوں کا بنڈل تھا جو اسے سر پہ اٹھا کے ساتھ جانا تھا۔ مختلف گلیوں سے گزرنے کے بعد وہ اپنے باپ اور چاچا کے ساتھ ایک پرانے سے پھاٹک پر آیا۔ جس کے اندر ایک طرف بکریوں کا باڑا تھا۔ اس کے باپ اور چاچا نے تین بکریاں وہاں سے کھولیں اور ایک بڑے سے ہال کمرے میں جو بے حد گیلا تھا۔ در و دیوار بے حد بوسیدہ تھے۔ یوں کہنے کو اس کی لمبی لمبی کھڑکیوں پہ جالیاں لگی تھیں مگر اکثر جالیاں پھٹی ہوئی تھیں۔ ہال کمرے میں سیمنٹ کے چبوترے تھے۔ اندر نالیاں تھیں۔ جن پر خون اور پانی جھاگ کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ ایک ایسی بو اس کے نتھنوں اور مساموں میں گھسی چلی گئی۔ جس کا اس نے کبھی ذائقہ نہیں چکھا تھا۔ وہ اسی ماحول کو فوری طور پر سمجھنے سے بالکل قاصر تھا۔ باہر کچھ آوارہ بلیاں اور کتے جو اس جگہ کے قدیم مکین معلوم ہوتے تھے۔ اپنے مخصوص مقام پر مخصوص قسم کی توقع کے ساتھ بے حد صبر اور تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف آنکھیں گھما کر حالات میں اپنی شمولیت کا احساس دلا رہے تھے۔ بلا اور اس کے باپ کے آنے سے پہلے بہت سے بکرے سیمنٹ کے چبوترے پر یا تو چھری پھرنے کے بعد تڑپ رہے تھے۔ یا ان کو اوپر لٹکانے کے بعد ان کی کھال اتاری جا رہی تھی۔ یہ سارا منظر اس کے لئے نیا تجربہ تھا۔ کبھی کھال کے نیچے تھرکتے ہوئے بکرے کے گوشت کو دیکھتا۔ کبھی خون کا فوارہ چھوٹتے دیکھتا۔ کبھی بکرے کو عجیب طرح کی دردبھری چیخ میں مبتلا ہو دیکھتا۔ کبھی ٹانگوں کو پکڑ کے اسے بے بس کرتے دیکھتا۔ اسے سب سے مزیدار تجربہ بکرے کی کھال اترتے محسوس ہوا۔ اسے ایسے لگا جیسے اس نے ٹکی کے ہٹنے سے سبز رنگ کا غلاف کھینچ کر اتار رہا ہو۔ اگرچہ اس کا آدھا کام ختم ہو چکا ہے۔ اس نے جو چھریاں سر پہ اٹھا کر وہاں پہنچائی تھیں۔ ان سے کام لیا جا رہا تھا۔ وہ خاموش ایک طرف کھڑا دیکھنے لگا کہ اس کے چاچا نے ایک بکرے کو ٹانگوں سے اٹھا کر پٹخ دیا اور اس کے باپ نے اپنا گھٹنا اس کی گردن پر رکھتے ہی بکرے کے منہ پر ایک ہاتھ رکھا اور چھری گلے پر پھیر دی۔ گلابی رنگ کے خون کا فوارہ نکلا جو بڑی جلدی جھاگ بن گیا۔ اور نیچے تک بہنے لگا۔ بکرے نے کچھ دیر تک مزاحمت کی۔ پھر بے حرکت ہو گیا۔ اگلے پچھلے پاؤں میں حرکت کے آثار باقی رہ گئے۔ بلا چاروں طرف اس عمل کو دیکھ رہا تھا۔ ایسے میں اس نے دیکھا کہ بلیوں اور کتوں میں باہمی معاہدے کے تحت اپنی اپنی طرف آنے والی آنتوں اور اسی طرح کے ناکارہ حصوں پر اطمینان کا مظاہرہ دکھائی دیا۔ جانوروں نے یہ مقام پانے میں کتنی ریاضت کی ہوگی بلا اس حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ اب اس نے اپنی توجہ دوسرے ذبح ہونے والے بکرے پر لگائی۔ جسے پہلے بکرے کی طرح پٹخ کر ذبح کیا گیا۔ پھر تیسرے کو اسی طرح چھری پھیر کے ٹھنڈا ہونے کے لئے رکھ دیا۔ اسے نہیں معلوم تھا ذبح کے بعد ایک وقفہ آتا ہے جس میں دوسرا تیسرا بکرا حلال کیا جاتا ہے۔ اب پہلے بکرے کے پہلے پاؤں کاٹے گئے پھر اسے مخصوص طریقے سے اوپر لٹکایا گیا۔ اس کا سر جدا کیا گیا اور پھر چھوٹی چھری سے کھال اتارنے کا نازک عمل شروع ہوا۔ وہ دیکھتا جاتا تھا کہ بکرے کی کھال اتارنا کتنا مشکل اور مہارت کا کام ہے۔ اس کے باپ نے اسے بلایا اور کہا کہ دیکھو قصائی کا سب سے مشکل امتحان کھال اتارنا ہوتا ہے۔ اگر کھال کو ٹک لگ جائے یا بکرے کا گوشت کھال کے ساتھ کٹ جائے تو جانور تو اللہ کے حضور شکایت کرتا ہی ہے۔ قصائی کا پیشہ بھی اسے لعنت ملامت کرتا ہے۔ پہلے بکرے کی ٹانگوں سے کھال کو بڑی باریکی سے الگ کیا جاتا ہے اس کے بعد گردن سے کھال کو الگ کرنا ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے کہ عام طور پر گردن پر چربی کی تہہ چڑھی ہوتی ہے۔ یہ چربی گردن پر ایسے دبی چاہیے جیسے دودھ پر بالائی کی تہہ جمی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس عمل کے بعد اس نے دیکھا کہ اس کے باپ نے اپنے ہاتھ کو مکا بنا کر کھال کے اندر کئی بار ایسے ٹھوکے لگائے کہ کھال آہستہ آہستہ نیچے کی طرف سرکنے لگی۔ لیکن آخری مرحلہ بہت حیران کن تھا کہ جب اس کے باپ نے اپنا پاؤں اس میں ڈال کے ایک ہی جھٹکے سے کھال کو بکرے سے الگ کر دیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ایک بار مجلے

کی لڑکی زینو سے اس کا جھگڑا ہوا تو وہ اسے مارنے کے لئے اس کی طرف بھاگا۔ وہ آگے آگے بھاگی تو پکڑتے ہوئے اس کی ململ کی کرتی اس کے ہاتھ میں ایسے آئی کہ کرتی کا پچھلا حصہ اتر کر اس کے ہاتھ میں آ گیا اور اس کا ننگا پنڈا ایک حیرت بن کر سامنے آیا۔ اس نے پہلی بار کسی لڑکی کی کمر ننگی دیکھی تھی۔ بکرے کی کھال اترنے کا تجربہ اسے زینو کی پیٹھ سے کرتی اترنے کی طرح محسوس ہوا۔ یہ گلابی جاڑوں کے دنوں کی بات ہے۔

جب صبح صبح ہلکی سردی محسوس ہونے لگتی تھی۔ اس مذبح خانے میں آ کر اسے اچانک گرمائش محسوس ہونے لگی۔ تازہ پانی سے اٹھتی بھاپ کے ساتھ بکروں کے گرم گرم خون نے ایک طرح سے ماحول میں حدت پیدا کر دی تھی۔ پھر بکروں کے پیٹ سے جب آنتیں کھینچی اور اوجھری نکالی جاتی تھی تو اور زیادہ بھاپ فضا میں محسوس ہوتی تھی۔ ابھی تک اس نے بکرے کے اعضاء اور گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ تھرکتے ہوئے گوشت میں گرمی موجود تھی۔ مگر یہ بے حد آسودہ کرنے والی تھی۔ جیسے وہ اس گرمی کو اپنے بچپن کے کسی کونے میں رکھ کے بھول گیا تھا۔ کبھی اس کی ماں جب اسے لپٹا کے سوتی تھی یا پھر جب وہ بھائی کے ساتھ لپٹ کے سونے لگا تھا تو اسے یاد آیا۔ یہ بھی اسی طرح کی گرمائش تھی۔ مگر وہ ان سب باتوں کو نامعلوم طریقے سے صرف محسوس کر سکتا تھا۔ اس کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس طرح ہوتے ہوتے ایک دن اسے دکان پر بٹھا دیا گیا۔ جہاں اور لڑکے بھی کام کرتے تھے۔ جو اس سے بڑے تھے۔ مثلاً ایک لڑکا جھورا تھا جو بے حد مہارت سے گوشت بناتا تھا۔ بلے کو اس پر رشک آتا تھا۔ وہ پھرتی سے بکرے کے جسم کے ہر حصے کو چربی اور چھیچھڑوں سے ایسے صاف کرتا جیسے مالی گھر سے باغیچے کو قینچی سے مونڈ کے صاف کرتا ہے۔ جھورے کی ٹریننگ میں یہ بات شامل تھی کہ وہ جب گاہک کے کہے ہوئے گوشت کو چھیچھڑوں اور چربی سے صاف کرے تو چربی ایک طرف رکھتا جائے اور چھیچھڑوں کے ساتھ گوشت کے کچھ ٹکڑے چھوڑتا جائے۔ اب یہ چھیچھڑے بلے کے پاس آتے تھے۔ وہ ان سے گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو الگ کرنا سیکھنے لگا۔ جلدی وہ سیکھ گیا اسی طرح شام کو دو ڈھائی کلو قیمہ مفت میں نکل آتا تھا۔ جو یہ گھر لے جاتے تھے۔ بلا اپنے اس نئے کام سے کافی خوش تھا لیکن وہ ترقی کر کے جھورے کی جگہ لینا چاہتا تھا۔ جو بکرے کی دونوں رانوں کے بیچ کھنی پھنسا کے ایک ہی وار میں دو ٹکڑے کر دیا کرتا تھا۔ جھورے کو استاد نے بتایا تھا کہ جب تک تم بچھڑے کا گوشت بنانا نہیں سیکھتے تمہیں مکمل قصائی ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے بڑی محنت سے بچھڑے کو بیچ سے چیرنا سیکھا۔ اور اسی تناسب سے بوٹی بنانے کا ہنر اپنے ہاتھ میں پیدا کر لیا۔ اب وہ آنکھیں بند کر کے ٹوکا چلاتا تھا اور گنڈیریوں کی طرح بوٹیاں بننے لگتی تھیں۔ اب بلا لڑکپن میں آ چکا تھا اور اس کے اندر جوش اور دوسروں کو زیر کرنے کا جذبہ سر اٹھانے لگا۔ وہ چاہتا تھا کوئی اس سے لڑے تو وہ

اس بکرے کی طرح پٹخے۔ اس کی ٹانگوں میں کھنی ڈال کے اسے چیر دے۔ یا پھر اس کی کھال اتار دے۔ جب اس نے گوشت بنانا سیکھ لیا تو طبیعت میں ٹھہراؤ آ گیا۔ اس لئے کہ دن بھر تین چار بکرے کاٹنے کے بعد اس کے اندر ایک طرح کا اطمینان آ جاتا تھا۔ اب تین کی جگہ دس بکرے روزانہ بنانے پڑتے تھے۔ یا تو لاہور کی آبادی بڑھ گئی تھی یا پھر لوگوں میں گوشت خوری کی عادت بڑھ گئی تھی۔ ایسے میں شادیوں اور دوسری تقریبات میں کھانوں کا ایسا رواج بڑھا کہ سرکار کو ان تقریبات میں کھانوں پر پابندی عائد کرنی پڑی۔ اور بکرے کے گوشت کی مہنگائی کے باوجود ڈیمانڈ بڑھتی ہی گئی۔ اب بلا مارکیٹ میں اپنے قد کاٹھ کی وجہ سے بلا چیمپئن مشہور ہو گیا۔ کسی نے اسے مشورہ دیا کہ رات کو تمہاری دکان خالی رہتی ہے تم اس میں تکے کڑاہی اور چانپ کا باربی کیو لگا لیا کرو۔ اس خیال نے اس میں گدگدی تو پیدا کی مگر اسے یہ کام اپنے شایان شان محسوس نہ ہوا۔ اس لئے کہ وہ ہوٹل والوں اور کیٹررز کو بڑی منتوں اور نخرے سے گوشت سپلائی کرنے پر آمادہ ہوتا تھا۔ اس کا باپ پرانی وضع کا آدمی تھا۔ اسے یہ بات پسند نہیں تھی کہ وہ شادیوں اور کیٹرنگ کے ساتھ ہوٹلوں میں گوشت سپلائی کرے۔ وہ بکروں کی تعداد بڑھانے کے خلاف تھا۔ اسے اپنے پرانے گاہکوں سے عشق ہو گیا تھا۔ وہ ان سے جب تک گپ نہیں لگا لیتا تھا گوشت نہیں تولتا تھا۔ وہ بابے ایک ایک کر کے اس کے پاس آ کر ایسے بیٹھ جاتے جیسے کبوتر کسی درگاہ پر اتر آتے ہیں۔ وہ بابے جانتے تھے کہ جب تک وہ کوئی بات نہیں سنائیں گے بلے کا باپ گوشت نہیں تولے گا۔ بلا باپ کی اس حرکت سے بہت نالاں تھا۔ لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اب وہ کھڑے کھڑے چار چھ بکروں کی کھال ایک آن میں کھینچ کے الگ کر سکتا تھا۔ اس کے اندر ہر وقت ایک ہی خواب چلنے لگا کہ ایک بڑا ہال کمرہ ہو اور اس میں دونوں طرف کھال کے بغیر بکرے لٹکے ہوں اور وہ اس میں چلتا رہے۔ اس کی سانسوں میں اور مساموں میں بکروں کے گوشت کی مخصوص بو رچ بس گئی تھی۔ خاص طور پر سردیوں میں وہ جب کھال اتار لیتا تو بکرے کے گوشت سے جو گرم گرم بھاپ اٹھتی وہ اس سے بہت آسودگی محسوس کرتا۔ اور پھر جب وہ گرم گرم بکرے کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر ہک اپ میں رکھتا تو جتنی دیر سالم بکرا اس کے جسم اور ہاتھوں سے لگا رہتا اتنی دیر اسے نامعلوم قسم کی لذت محسوس ہوتی۔ اس کا باپ اب بوڑھا ہو چلا تھا۔ عملاً سارا کام بلا چیمپئن نے سنبھال لیا تھا۔ باپ گلے پر بیٹھتا تھا اور گوشت تولنے تک محدود ہو گیا تھا۔ وہ اب بلا کی شادی کے لئے پر تولنے لگا تھا۔ اپنی برادری میں رشتے تو بہت تھے لیکن بلا نے کبھی عورت کے متعلق سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں تھا۔ بچپن میں زینو کی پھٹی کرتی سے ننگی کمر کبھی کبھی اس کے بدن میں جھرجھری پیدا کرتی تھی۔ زینو اب بیاہی گئی تھی۔ اسے اپنی یادداشت میں کہیں اس کی ایک جھلک ہی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ عورت سے کسی طرح کا کوئی رشتہ معلوم نہیں کیوں نہ بن

سکا۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کا حلقۂ احباب ایسا نہیں تھا جو مجرا دیکھتا ہو یا سٹیج ڈرامے میں ڈانس دیکھنے جاتا ہو۔ یا شراب وغیرہ کی محفلوں میں لڑکیوں کو دل بہلانے کے لئے منگاتا ہو۔ جو ملکہ ترنم نور جہاں کے ان گانوں پر تھرک تھرک کے ان کا دل لبھاتی ہوں۔ ایک تو یہ گانا ان دنوں شراب کی محفلوں میں بے حد مقبول ہوا۔ تھوڑی پی گئی اے تھوڑی پاٹ گئی اے میری ویل دی قمیض۔ اور دوسرا گانا جس نے شراب کی محفلوں میں جگہ بنائی تھی وہ یہ تھا۔ ساتوں نوٹ وکھا ساڈا موڈ بنڑے۔ ملکہ ترنم نور جہاں کو اسی طرح کے گانوں کے باوجود عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا تو وہ شاید ان کے ماضی کی موسیقار تھے جن میں خواجہ خورشید انور رشید عطرے۔ اے حمید ماسٹر عنایت حسین اور نثار بزمی۔۔۔۔ وغیرہ شامل تھے۔ اور جنہیں ملکہ ترنم نور جہاں نے ایک وقت میں آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا تھا کہ تم کون ہو۔ میری وجہ سے تمہاری شہرت ہے اس پر خواجہ خورشید انور نے ناھید نیازی کو دنیائے موسیقی میں نامور بنا دیا تھا۔ بلا چیمپئس اس طرح کے مسائل سے آزاد تھا۔ نہ اسے پتہ تھا کہ تھوڑی پی گئی اے تھوڑی پاٹ گئی اے سے کیا مراد ہے۔ وہ تو بس سارا دن بکروں میں گزارتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کی عیاشی یہ ہوتی تھی کہ وہ رات کو گوالمنڈی یا لکشمی چوک کا چکر لگا کر تکاتک یا کڑاہی گوشت سے دل بہلا لیتا تھا۔ اس میں بھی وہ بکرے کے گوشت کے نقص نکال کے واپس آتا تھا۔ اس کی ایک خواہش ایسی تھی جس پر اس کے باپ کی لمبی ہوتی ہوئی عمر نے پہرہ بٹھا دیا تھا۔ وہ خواہش یہ تھی کہ وہ دن میں سو بکرے کرے اور اس کی سپلائی شہر کے بڑے کیٹررز اور فائیو سٹار ہوٹلوں میں ہو اور ایک وقت ایسا آئے کہ وہ لاہور شہر کی کھابہ مارکیٹ کا چیئرمین ہو جائے۔ بلا چیمپئس اپنے اس خواب کے ساتھ جڑا رہا یہی وجہ ہے کہ اسے نہ تو شادی کا خیال آتا تھا نہ ہی عورت کو اس نے محسوس کرنے کا طریقہ دریافت کیا تھا۔ جب کوئی اس سے مذاق میں بھی پوچھتا کہ یار کوئی عشق وشق کرتے ہو یا کوئی معشوق وشوق بنائی ہے تو وہ ایک ہی جواب دیتا تھا کہ ساڈا خاندان ای خالی اے سیا جتھو چ نکیرا ای نہیں اے۔ اب اس بات کو نفسیاتی طور پر سمجھنے کی ایسی ضرورت بھی نہیں تھی کہ بلا چیمپئس فوڈ مارکیٹ اور بکروں کے اندر کہیں پھنسا ہوا تھا۔ دن بھر بوٹیاں کاٹنے۔ کھالیں اتارنے اور رات کو تکوں اور تکاتک کے ماحول میں اس کے اندر کی حساسیت کہیں دبتی چلی جا رہی تھی۔ محبت کرنے اور محبت میں مبتلا ہونے کے لئے جس دھیان کی ضرورت ہوتی ہے اس کا بلا چیمپئس کی زندگی میں دور دور تک نشان نہیں تھا۔ یوں اس کے اندر ایک معصوم سا بچہ ابھی بھی موجود تھا جو صرف زینو کی کمر کو دیکھ کر حیرت میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ لیکن اس سے آگے کی کوئی منزل اس نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جب اس کے باپ کی عمر کچھ اور ڈھلنے پہ آئی اور ہاتھ میں رعشہ آ گیا تو اس کے لئے گوشت تولنا ذرا مشکل ہو گیا۔ لیکن وہ اپنی گدی چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اور اپنے پرانے گاہکوں کو خود ہاتھ سے گوشت کی ران تول کے دینے پر اصرار کرنے لگا۔ اگرچہ اس طرح تھوڑا وقت ضرور لگتا تھا۔ لیکن اسے اپنی زندگی کا اس میں مصرف محسوس ہوتا تھا۔ اس لئے اس کے معمول میں کمی نہ آئی۔ البتہ اس نے سنجیدگی سے بلا چیمپئس کی شادی پر زور دینا شروع کر دیا۔ بلا چیمپئس کو اپنی شادی میں سب سے زیادہ دلچسپی ویسے میں محسوس ہوئی کہ اس طرح وہ بکرے کے گوشت کے تکے۔ قورمہ اور پلاؤ کے ذریعے لوگوں سے اپنے فن کی داد وصول کر سکتا تھا۔ اس طرح اس نے اپنی شادی میں دلچسپی لینا شروع کی۔ اور مہمانوں کی فہرست کو زیادہ سے زیادہ طول دینا شروع کر دیا تا کہ زیادہ بکروں کی مدد سے وہ اپنی مطلوبہ خواہش پوری کر سکے۔ مثلاً پہلے تو رشتہ داروں عزیزوں کی فہرست بنی۔ پھر ڈرائیور کے عزیزوں کو بھی شامل کر لیا گیا۔ اس کے بعد محلے کے معززین کے ساتھ روز کے گاہکوں کو بھی بمعہ اہل وعیال شامل کیا گیا۔ کیونکہ بلا چیمپئس کی ساری توجہ دیگوں کی تعداد پر مرکوز تھی۔ اس لئے اس نے فوڈ سٹریٹ کے بڑے دکانداروں کو بھی مدعو کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد شہر کے نامور قصابوں کو بھی اس فہرست میں جگہ دینے پر اتفاق کر لیا گیا۔ اس کے بعد کونسلر حضرات۔ اور علاقے کے عمائدین۔ ناظم حضرات اور سیاسی جماعتوں کے محلے کی سطح کے رہنماؤں کو بھی دعوت دینے میں کسی کو تامل نہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی مذہبی رہنماؤں اور میڈیا سے تعلق رکھنے والے اس علاقے کی ایک معقول تعداد کو شامل کرنے کو اپنے لئے شہرت اور عزت افزائی کا ذریعہ سمجھنے میں بھلا کسے اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ایک بڑی فہرست تقریباً ایک ہزار لوگوں کی تیار ہو گئی۔ اس کے مطابق بکروں کی تعداد کا یقین کیا گیا۔ اور بلا چیمپئس شادی کی تیاریوں سے زیادہ بکروں کی خریداری اور ان کے ذبح کرنے کے ساتھ گوشت کی تیاری تک کے مراحل طے کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے لئے اس نے گوشت بنانے والے ماہرین کا ایک گروپ تشکیل دیا۔ جنہیں سب ڈیوٹیاں سونپ دی گئیں۔ اور اسے اطمینان ہو گیا کہ کھال اتارنے سے لیکر دیگوں تک کے تمام مراحل خوش اسلوبی سے طے ہو جائیں گے۔ بلا چیمپئس کے لئے رشتے کے حصول کا مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ نہ اس کی کوئی پسند تھی۔ نہ اس کے سامنے کوئی معیار تھا۔ اس لئے۔ اس کی ماں اور بہنوں نے بڑی آسانی سے اپنی ترجیحات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے دور پار کے عزیزوں سے ایک لڑکی دریافت کر لی۔ ترجیحات میں ایک پہلو بے حد نمایاں یہ تھا کہ لڑکی سٹار پلس کے ڈرامے شوق سے دیکھتی تھی اور اکثر ان پر تبصروں میں ان بہوؤں کو ناپسند کرتی تھی جو ساسوں کو ناکوں چنے چبواتی ہیں۔ یا اپنی نندوں کو آوارگی کا طعنہ دیتی ہیں۔ یہ ایک ایسا میرٹ تھا جس پر بڑی آسانی سے فیصلہ ہو گیا۔ نہ بلا چیمپئس نے اس لڑکی کو دیکھا نہ تصویر دیکھنے پر اصرار کیا۔ شادی کی تمام تیاریاں گھر والوں نے کیں۔ اس کے ذمہ صرف ویسے کے بکروں کی بنوائی اور پکوائی تھی۔ جو اس نے اپنی حکمت عملی سے بخیر وخوبی طے کر لی تھی۔ اس کی ہدایت کے مطابق۔ چانپیں

سکا۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کا حلقہء احباب ایسا نہیں تھا جو مجرا دیکھتا ہو یا سٹیج ڈرامے میں ڈانس دیکھنے جاتا ہو۔ یا شراب وغیرہ کی محفلوں میں لڑکیوں کو دل بہلانے کے لئے منگاتا ہو۔ جو ملکہء ترنم نور جہاں کے ان گانوں پہ تھرک تھرک کے ان کا دل لبھاتی ہوں۔ ایک تو یہ گانا ان دنوں شراب کی محفلوں میں بے حد مقبول ہوا۔ تھوڑی پیس گئی اے تھوڑی پاٹ گئی اے میری ویل دی ٹیمیں۔ اور دوسرا گانا جس نے شراب کی محفلوں میں جگہ بنائی تھی وہ یہ تھا۔ ساڈوں نوٹ وکھا ساڈا موڈ بنڑے۔ ملکہء ترنم نور جہاں کو اسی طرح کے گانوں کے باوجود عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا تو وہ شاید ان کے ماضی کی موسیقار تھے جن میں خواجہ خورشید انور رشید عطرے۔ اے حمید ماسٹر عنایت حسین اور نثار بزمی ۔۔۔۔ وغیرہ شامل تھے۔ اور جنہیں ملکہء ترنم نور جہاں نے ایک وقت میں آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا تھا کہ تم کون ہو۔ میری وجہ سے تمہاری شہرت ہے اس پر خواجہ خورشید انور نے ناہید نیازی کو دنیائے موسیقی میں نامور بنا دیا تھا۔ بلا چیمپئیس اس طرح کے مسائل سے آزاد تھا۔ نہ اسے پتہ تھا کہ تھوڑی پیس گئی اے تھوڑی پاٹ گئی اے سے کیا مراد ہے۔ وہ تو بس سارا دن بکروں میں گزارتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کی عیاشی یہ ہوتی تھی کہ وہ رات کو گوالمنڈی یا لکشمی چوک کا چکر لگا کر تکاتک یا کڑاہی گوشت سے دل بہلا لیتا تھا۔ اس میں بھی وہ بکرے کے گوشت کے نقص نکال کے واپس آتا تھا۔ اس کی ایک خواہش ایسی تھی جس پر اس کے باپ کی لمبی ہوتی ہوئی عمر نے پہرہ بٹھا دیا تھا۔ وہ خواہش یہ تھی کہ وہ دن میں سو بکرے کرے اور اس کی سپلائی شہر کے بڑے کیٹررز اور فائیو سٹار ہوٹلوں میں ہو اور ایک وقت ایسا آئے کہ وہ لاہور شہر کی کباب مارکیٹ کا چیئرمین ہو جائے۔ بلا چیمپئیس اپنے اس خواب کے ساتھ جڑا رہا یہی وجہ ہے کہ اسے نہ تو شادی کا خیال آتا تھا نہ ہی عورت کو اس نے محسوس کرنے کا طریقہ دریافت کیا تھا۔ جب کوئی اس سے مذاق میں بھی پوچھتا کہ یار کوئی عشق وشق کرتے ہو یا کوئی معشوق وشوق بنائی ہے تو وہ ایک ہی جواب دیتا تھا کہ ساڈا خاندان ای خالی اے۔ یا جٹھہ وچ ٹکیراں ای نہیں اے۔ اب اس بات کو نفسیاتی طور پر سمجھنے کی ایسی ضرورت بھی نہیں تھی کہ بلا چیمپئیس فوڈ مارکیٹ اور بکروں کے اندر کہیں پھنسا ہوا تھا۔ دن بھر بوٹیاں کاٹنے۔ کھالیں اتارنے اور رات کو تکوں اور تکاتک کے ماحول میں اس کے اندر کی حساسیت کہیں دبتی چلی جا رہی تھی۔ محبت کرنے اور محبت میں مبتلا ہونے کے لئے جس دھیان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا بلا چیمپئیس کی زندگی میں دور دور تک نشان نہیں تھا۔ یوں اس کے اندر ایک معصوم سا بچہ ابھی بھی موجود تھا جو صرف زینو کی کمر کو دیکھ کر حیرت میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ لیکن اس سے آگے کی کوئی منزل اس نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جب اس کے باپ کی عمر کچھ اور ڈھلنے پہ آئی اور ہاتھ میں رعشہ آ گیا تو اس کے لئے گوشت تولنا ذرا مشکل ہو گیا۔ لیکن وہ اپنی گدی چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ اپنے پرانے گاہکوں کو خود ہاتھ سے گوشت کی ران تول کے دینے پر اصرار کرنے لگا۔ اگرچہ اس طرح تھوڑا وقت ضرور لگتا تھا۔ لیکن اسے اپنی زندگی کا اس میں مصرف محسوس ہوتا تھا۔ اس لئے اس کے معمول میں کمی نہ آئی۔ البتہ اس نے سنجیدگی سے بلا چیمپئیس کی شادی پر زور دینا شروع کر دیا۔ بلا چیمپئیس کو اپنی شادی میں سب سے زیادہ دلچسپی ولیمے میں محسوس ہوئی کہ اس طرح وہ بکرے کے گوشت کے تکے۔ قورمہ اور پلاؤ کے ذریعے لوگوں سے اپنے فن کی داد وصول کر سکتا تھا۔ اس طرح اس نے اپنی شادی میں دلچسپی لینا شروع کی۔ اور مہمانوں کی فہرست کو زیادہ سے زیادہ طول دینا شروع کر دیا تا کہ زیادہ بکروں کی مدد سے وہ اپنی مطلوبہ خواہش پوری کر سکے۔ مثلاً پہلے تو رشتہ داروں عزیزوں کی فہرست بنی۔ پھر دور دراز کے عزیزوں کو بھی شامل کر لیا گیا۔ اس کے بعد محلے کے معززین کے ساتھ روز کے گاہکوں کو بھی بمعہ اہل وعیال شامل کیا گیا۔ کیونکہ بلا چیمپئیس کی ساری توجہ دیگوں کی تعداد پر مرکوز تھی۔ اس لئے اس نے فوڈ سٹریٹ کے بڑے دکانداروں کو بھی مدعو کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد شہر کے نامور قصابوں کو بھی اس فہرست میں جگہ دینے پر اتفاق کر لیا گیا۔ اس کے بعد کونسلر حضرات۔ اور علاقے کے عمائدین۔ ناظم حضرات اور سیاسی جماعتوں کے محلّی سطح کے رہنماؤں کو بھی دعوت دینے میں کسی کو تامل نہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی مذہبی رہنماؤں اور میڈیا سے تعلق رکھنے والے اس علاقے کی ایک معقول تعداد کو شامل کرنے کو اپنے لئے شہرت اور عزت افزائی کا ذریعہ سمجھنے میں بھلا کسے اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ایک بڑی فہرست تقریباً ایک ہزار لوگوں کی تیار ہو گئی۔ اس کے مطابق بکروں کی تعداد کا تعین کیا گیا۔ اور بلا چیمپئیس شادی کی تیاریوں سے زیادہ بکروں کی خریداری اور ان کے ذبح کرنے کے ساتھ گوشت کی تیاری تک کے مراحل طے کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے لئے اس نے گوشت بنانے والے ماہرین کا ایک گروپ تشکیل دیا۔ جنہیں سب ڈیوٹیاں سونپ دی گئیں۔ اور اسے اطمینان ہو گیا کہ کھال اتارنے سے لیکر دیگوں تک کے تمام مراحل خوش اسلوبی سے طے ہو جائیں گے۔ بلا چیمپئیس کے لئے رشتے کے حصول کا مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ نہ اس کی کوئی پسند تھی۔ نہ اس کے سامنے کوئی معیار تھا۔ اس لئے۔ اس کی ماں اور بہنوں نے بڑی آسانی سے اپنی ترجیحات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے دور پار کے عزیزوں سے ایک لڑکی دریافت کر لی۔ ترجیحات میں ایک پہلو بے حد نمایاں یہ تھا کہ لڑکی سٹار پلس کے ڈرامے شوق سے دیکھتی تھی اور اکثر ان پر تبصروں میں ان بہوؤں کو ناپسند کرتی تھی جو ساسوں کو ناکوں چنے چبواتی ہیں۔ یا اپنی نندوں کو آوارگی کا طعنہ دیتی ہیں۔ یہ ایک ایسا میرٹ تھا جس پر بڑی آسانی سے فیصلہ ہو گیا۔ نہ بلا چیمپئیس نے اس لڑکی کو دیکھا نہ تصویر دیکھنے پر اصرار کیا۔ شادی کی تمام تیاریاں گھر والوں نے کیں۔ اس کے ذمہ صرف ولیمے کے بکروں کی ہونق اور پکوائی تھی۔ جو اس نے اپنی حکمت عملی سے بخیر وخوبی طے کر لی تھی۔ اس کی ہدایت کے مطابق۔ چار نہیں

سیخوں پر تکوں کے لئے تیار ہوتی تھیں گردن اور سینے کا گوشت پلاؤ کے لئے اور چٹھ اور ران کے ساتھ شانے کے گوشت سے قورمہ اور چینوٹی کنیا تیار کرنے کے احکامات جاری کر دیئے گئے۔ اسے یقین تھا کہ اس کی ٹیم اس کی توقعات پر پورا اترے گی۔ گویا اس شادی میں سب سے اہم بات ولیمے کا کھانا تھا جس کی داد وصول کرنے کے لئے اسے اس دن کا انتظار تھا۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں سہاگ رات کا کوئی تصور گدگدی نہیں کر رہا تھا۔ جو لیکن انہونی بات بھی نہیں تھی کہ اسے نہ تو کسی قسم کا کوئی پہلے سے اس کا تجربہ تھا نہ ہی اس کے دماغ میں کسی قسم کی کوئی جنسی کج روی موجود تھی۔ اس لئے وہ یا تو اندر سے کنفیوز تھا یا اس کا دماغ اس طرف آتا ہی نہیں تھا۔ یا پھر آنے والی صورت حال کو وہ بے حد معمولی اور آسان سمجھ کے نظر انداز کر رہا تھا۔ بہر حال عورتوں کے شعبے میں ہونے والی ہر سرگرمی سے وہ نہ صرف غافل تھا۔ بلکہ اسے بھی خواتین نے اہمیت دینا مناسب نہ سمجھا۔ وہ سب کچھ سٹار پلس کے ڈراموں میں ہوتا تھا۔ اس کی بھونڈی نقل خواتین نے اپنی بساط کے مطابق پیش آنے کی کوشش کی۔ شادی کی رات بلا چیمپئن کی ٹیم نے پچاس کے قریب بکرے بنانے تھے۔ تاکہ صبح کسی وقت گوشت ولیمے کے باورچیوں کے پاس پہنچ سکے۔ دلہا بن کر وہ مسلسل یہ سوچ رہا تھا کہ اس کی ٹیم اس کی مرضی سے کام کرے گی یا نہیں۔ اس کے اندر کئی بار یہ خیال بھی سر اٹھا چکا تھا کہ کاش وہ اس موقع پر اپنی ٹیم کے ساتھ ہوتا اور اپنی مرضی کے مطابق گوشت تیار کراتا۔ شادی کے بینڈ باجے کے شور میں بھی کبھی کبھی اس کا دھیان ادھر کو چلا جاتا کہ کس طرح کھالیں اتاری جارہی ہوں گی بوچڑ خانے میں کیسا ہنگامہ ہوگا لیکن جلد ہی شادی کے ہنگامے اور آوازوں نے اس کے دھیان کو دبا لیا۔ خواتین سٹار پلس کے ڈراموں کی نقل میں بلا چیمپئن پر طرح طرح کے تجربے کرنے میں مصروف تھیں جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔

لڑکی والوں کے گھر یوں تو کھانا بہت پر تکلف تھا اور دیکھنے میں سب کو رجھانے اور بھوک چمکانے والا تھا۔ لیکن ذائقے میں ایسا نہیں تھا جس کی بلا چیمپئن کو توقع تھی خاص کر بکرے کے گوشت کی کوالٹی بے حد ناقص تھی۔ جس پر بلا چیمپئن کو اپنے سسرالیوں کے ذوق پر ملال ہوا لیکن ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ اگر اس کی ٹیم نے صحیح پرفارم نہ کیا تو ولیمے کے کھانے میں اس کی سبکی ہوگی۔ جب تمام رسومات اپنے انجام کو پہنچیں تو گھر میں دلہن کو لایا گیا اور سلامیوں کا سیشن شروع ہوا۔ اس دوران بلا چیمپئن کا موبائل سے اپنی ٹیم کے ساتھ رابطہ ہوا اور اس نے ان سے کام کی رفتار کا جائزہ لیا جو اطمینان بخش تھا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ خود موقع پر پہنچ جائے۔ اب سلامیوں کے بعد ہر طرح کے رسمیں نمٹ گئیں تو دلہن کو عروسی کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ دودھ پانی وغیرہ کے گلاس بھی رکھ دیئے گئے۔ اور گھر کے افراد تھکاوٹ کے باعث کمروں میں کانا پھوسی کرتے کرتے لیٹنے لگے۔ اب بلا چیمپئن کو خیال آیا کہ اس کی زندگی کا سب سے اہم لمحہ اس کے سر پر آن کھڑا ہے۔ وہ کمرے میں گیا تو دیکھا دلہن حجلہ عروسی میں عروسی دوپٹے کے گھونگھٹ کے اندر کہیں بیٹھی ہے۔ دلہن دبلی پتلی تھی جسے عرف عام میں سنگل پسلی کہتے ہیں۔ اسے سمجھ نہ آئی کہ وہ کیا کرے۔ اس نے غور کو دیکھا تو پتہ چلا کرنسی نوٹوں کا ہار اس کے گلے میں ہے۔ جو اس نے اتار لیکن اس سے پہلے پگڑی اتاری۔ اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ کہیں سے سن رکھا تھا کہ گھونگھٹ اٹھایا جاتا ہے۔ اس نے گھونگھٹ اٹھایا تو دلہن کو زیورات میں لدا پھندا پایا جس میں اس کا چہرہ کہیں چھپ گیا تھا۔ دلہن سٹار پلس کے ڈرامے دیکھ دیکھ کر اپنے دولہا سے اسی برتاؤ کی توقع رکھتی تھی جو ان ڈراموں کے دولہا اکثر پرفارم کیا کرتے تھے لیکن یہاں بلا چیمپئن نے فقط سلام کیا۔ اور دوپٹہ اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ دلہن کو یوں لگا جیسے اس کے سر سے کسی نے چھت کھینچ لی ہو۔ وہ چھوئی موئی ہو گئی۔ بلا کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کلمہ بولے۔ دو چار جملے سوچے بھی پھر اس کا دھیان ولیمے کے بکروں کی طرف چلا گیا۔ اس نے خیال کو جھٹک دیا اور سوچنے لگا پہلے دلہن کے زیور اتارے یا کپڑے۔ یا کیا کرے۔ زیور اتارنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے اپنے بازو دلہن کے گرد حائل کیے۔ تو اسے پتہ چلا دلہن تو بہت ہلکی پھلکی ہے۔ جسم بہت دبلا پتلا ہے۔ اسے یکدم خیال آیا کہ جب وہ بکرے کا گوشت آنکنے کے لئے بکرے پر ہاتھ پھیرتا تھا تو اس طرح کے جسم والے بکروں کو اپنے قابل نہیں سمجھتا تھا اور چھوڑ دیتا تھا۔ اس کے اس عمل سے دلہن اور بھی سکڑ کر اپنے میں سمٹ گئی۔ اب بلا ڈائریکٹ ایکشن پر آگیا۔ اور اس نے اس کا لمبا چوڑا دوپٹہ ایک طرف کیا اور اس کی کرتی اتارنے لگا۔ دلہن نے لہنگا پہن رکھا تھا۔ مختصری کرتی نازک سے جسم سے ایک پل میں الگ ہو گئی۔ اسے زینو کی کمر یاد آگئی۔ مگر اس کمر پر بریزیئر کی پٹی تھی۔ جسے اتارنے کا اسے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ دلہن اس غیر متوقع حملے کے لئے تیار نہیں تھی وہ تو سٹار پلس کے رومان میں گرفتار تھی۔ بلا نے ایک ایسا ہاتھ بریزیئر کو کھولنے کے لئے مارا کہ جو کھینچ پڑا اور بریزیئر اتر گئی۔ اس کی دلہن جسمانی طور پر چونکہ کمزور سی تھی۔ تو اس کا دھیان اس کی چھاتیوں کی طرف نہیں گیا۔ ویسے بھی دلہن نے اپنے دونوں بازو آگے کر کے سینہ چھپا لیا۔ اب بلا چیمپئن کے پاس اور کوئی چارہ رکنے کا نہیں تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے لہنگا نیچے کی طرف ایسے کھینچا جیسے وہ آخری ہاتھ مار کے بکرے کی کھال اتار لیا کرتا ہے۔ دلہن نے اس حرکت پر اور تو کچھ نہ کیا اس کی طرف پیٹھ کر کے اپنے دونوں ہاتھ اور ٹانگیں سکیڑ کر اپنے جسم کو چھپانے لگی۔ بلے کے سامنے وہ ایسے پڑی تھی جیسے کھال اتر جانے کے بعد بکرا پڑا ہوتا ہے۔ فرق اتنا تھا کہ اس کے نزدیک یہ بکرا ذرا سا تھا۔ اس نے ماتھے پر پسینہ محسوس کیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اسے بازوؤں میں اٹھائے گا تو اسے بکرے کے جسم سے اٹھتی بھاپ اور گرمی محسوس ہوگی۔ اس نے اسے دیکھا اور پھر چشم زدن میں دروازہ کھول کے باہر چلا گیا۔ سردی میں بھی اسے جسم پر پسینے کے قطروں کے رینگنے کا احساس ہوا۔

دل کی آبرو ریزی

''چہار سو'' سلطانہ مہر (برمنگھم، یوکے)

وہ اسی شہر میں بیاہ کر آئی تھی۔ اسی دھرتی پر اس نے بچوں کو جنم دیا۔ اور اس مٹی نے اسے سیراب بھی کیا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی سرزمین پر وہ سومناتھ کے دیس سے آئی تھی۔ اس کے آباؤ اجداد راجپوت دھیر کی اولاد سے تھے۔ پھر ان میں سے کسی نے اسلام کے دامن میں پناہ لی۔ یوں ان کا رشتہ محمد بن قاسم سے جڑا۔ وہ سندھ میں آباد ہوئے۔ پھر روٹی کی پکار پر ہجرت کے تجربے سے گزرے۔ اور یہ ہجرت نسلوں پر اور سالوں پر محیط ہوئی۔ اسے تو بس اتنا یاد تھا کہ اس کا بچپن سومناتھ کے مندر کے بتوں سے کھیلتے گزرا۔ وہ ساحل سمندر پر سیپیاں چنتے چنتے جب کبھی تھک جاتی تو مندر کا رخ کرتی۔ ان مورتیوں کو تکتے ہوئے سوچا کرتی کہ وہ جب بولتی ہوں گی، کام کرتی ہوں گی تو کیسی ہوں گی۔ انہیں کس کا کوسنا لگا کہ وہ ایک دم سے چپ پتھر ہو گئیں۔

نانی اسے بچپن میں ان مورتیوں کی کہانی سنایا کرتی تھیں۔ نانی نے ہی اسے بتایا تھا کہ کسی بزرگ کی بددعا سے یہ چلتے پھرتے جسم پتھر میں ڈھل کر رہ گئے تھے۔

''ایسا کیا قصور کیا تھا انہوں نے؟''

''خدا کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ رسول ﷺ کے نام کا کلمہ نہیں پڑھا تھا'' نانی نے اسے سمجھایا تھا۔

دوبارہ اس نے ان مورتیوں کو دیکھا تو اس کا دل گہری اداسیوں میں ڈوب گیا۔

''ان چھوٹے چھوٹے بچوں کا کیا قصور تھا۔ اللہ میاں۔ جو ماؤں کی گود میں پتھر ہو گئے۔'' مگر اس کے ذہن نے اس کے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ تب اس نے یہی سوال رات کو نانی سے پوچھا اور نانی اس نے اسے تھپکی دی۔

''سو جاؤ بٹی۔ اللہ کے کام اللہ بہتر جانے'' وہ نانی کے اس جواب سے مطمئن تو نہیں ہوئی۔ مگر ''اللہ کے کام اللہ بہتر جانے'' کا ورد کرتی سو گئی۔

پھر ایک اور ہجرت کا پل اس نے طے کیا۔ 1947ء کے فسادات کا ریلا اس کے خاندان کو حیدرآباد سندھ لے آیا۔ اسے اس کا بہت دکھ رہا کہ وہ وہاں سے ہجرت کرتے ہوئے وہ سومناتھ کے ان ننھے منے پتھر کے بچوں سے الوداعی ملاقات بھی نہ کر سکی۔

اور جب بیاہ کے بعد چار سال تک اس کی کوکھ سونی رہی تو وہ کسی کے کہنے پر عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر گئی۔ اور اس نے جھولی پھیلا کر دعا مانگی کہ چاند سے بیٹے سے اس کی جھولی بھر دی جائے۔ اس کی مراد پوری ہو گئی۔ اس نے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائی اور جب پہلے پہل تخلیق کے جان لیوا عمل سے گزری تو نرس نے اس کے وجود کا ایک حصہ اس کے پہلو میں لٹا دیا۔ اس نے جھک کر بچے کو دیکھا۔۔۔ اور پہلے ہی دن اس کی چھاتیوں میں ماتا امنڈ آئی۔ میٹھے درد کی ایک لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی..... کیسا عجیب نشہ تھا یہ اور کیسا پیارا درد کہ جسم و جان اس درد سے پھر ہم آہنگ ہونے کو ہولے ہولے لرزنے لگے۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے اتر آئے ...... اور سہاگ کی پہلی رات کی دلہن کی مانند اس کا وجود مہک اٹھا۔ نیند نے ہنس کر الوداع کہی اور جاگنے کی دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوئی۔

نیند سے ناتا ٹوٹا تو اس نے پلٹ کر بچے کو دیکھا۔ تب جانے کیوں اسے سومناتھ کے مندر میں پتھر ہو جانے والے بچے اچانک یاد آ گئے۔ اور ماں کی چھاتی پر منہ رکھ کر دودھ پیتا بچہ آپ ہی آپ مسکرایا تو اس نے ہولے سے آیت الکرسی پڑھی اور بچے کے کانوں میں، اس کی آنکھوں پر، اس کے سراپے پر دم کرنے لگی۔

یوں اللہ آمین سے اس نے تین بچے پال لئے اور اپنی تین جوانیاں وار دیں۔ مگر اس کا حسن ماند نہیں پڑا۔ وہ نکھرتا ہی چلا گیا۔ آج بھی وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی تو ناک میں ڈلی لونگ کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی ہیرے کی کنیاں جگمگاتی نظر آتیں۔ یہ حسن اسے ورثے میں ملا تھا۔ سومناتھ کی مورتیوں کا حسن اور اس پاکیزہ خوبصورتی کو اس نزاکت کو اس نے ورثے کے طور پر اپنی بیٹی کو بخش دیا تھا۔

ماہین۔۔۔۔ اس کی بارہ سالہ بیٹی کی اٹھان بارھویں کے چاند کی سی تھی اور اس سے تین سال بڑا اس کا بیٹا۔ مرادوں اور منتوں سے مانگا ہوا بیٹا منیج میٹرک کا امتحان پاس کر کے کالج میں داخلہ لے چکا تھا اور ماہین سے ایک سال چھوٹا اس کا دوسرا بیٹا رفیع اسکول میں پڑھ رہا تھا۔

زندگی کی اس منزل تک پہنچنے کے لئے اس نے بڑے پاپڑ بیلے تھے۔ محنت مزدوری بھی کی تھی۔ کیونکہ سرکاری ملازمت کرنے والا شوہر اپنے پیروں میں اور اپنے ذہن میں اتنی سکت نہیں رکھتا تھا کہ اوپر جانے کے لئے زینے پھلانگ سکے۔ یوں خدا داد کالونی کے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں زندگی افتاں و خیزاں گزر رہی تھی۔ پیوند لگی چادر کی سلامتی کے لئے اس نے ایک اسکول میں ملازمت کر لی اور پرائمری کے بچوں کو اردو پڑھانے لگی۔ انٹر کے سرٹیفکیٹ سے ماہانہ ملنے والے چار سو روپے بڑے غنیمت تھے کہ تین وقت دودھ پتی کی چائے اور گیہوں کی روٹی میسر آ جاتی تھی۔ باقی اخراجات میاں کی تنخواہ سے اس طرح پورے ہو رہے تھے جیسے پھٹی ہوئی چپل کو موچی گانٹھ کے پہننے کے قابل بنا دیتے ہیں۔

اور یہ زندگی بھی بھلی ہی گزر جاتی اگر منیج اچانک گم نہ ہوتا۔ قیامت کی یہ گھڑی بھی اس کی زندگی میں آئی۔ آہیں بھر بھر کے اس نے دنوں کو بھی رات کی طرح تاریک بنا لیا مگر اس کا بیٹا نہ ملا۔ اخبار میں تلاش گم شدہ کا اشتہار بھی دیا۔ آنکھیں دروازے پر لٹکا کر تین سو پینسٹھ دن کا حساب بھی کیا۔ مگر منیج واپس نہ آیا۔ جانے اسے کوئی اٹھا کر لے گیا یا وہ خود روٹھ کر چلا گیا تھا۔ اس گتھی کو وہ سلجھا نہ سکی۔

یوں تو اس کا منیج بھولا بھالا اور سیدھا سا نوجوان تھا۔ گھر سے کالج جاتا اور کالج سے ٹیوشن دینے کے لئے۔ یہ ٹیوشن بھی اس نے پچھلے آٹھ ماہ سے

شروع کی تھی۔مگر گھر میں اس نے کبھی کبھار ہی سو پچاس روپے دیے ہوں گے۔ اسے بس نئے کپڑے پہننے کا شوق تھا۔کالج میں ہینگر پرانے بغیر استری کے کپڑے پہن کر جاتے ہوئے اسے بہت شرم آتی تھی۔وہ زیادہ تر چپ ہی رہتا تھا۔لیکن غربت کی مار کھاتے کھاتے کبھی بلبلا کر کہہ اٹھتا۔

''امی۔تم ورلا غریب گھر میں کیوں پیدا ہوئے آخر؟''

''بیٹے اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی۔''وہ صبر وقناعت کا درس دہراتی۔مجو جیسے اس جواب کا عادی ہو چکا تھا۔مگر اب کچھ اور سننا چاہتا تھا۔ چنانچہ بے بسی سے باپ کا منہ تکتا اور وہ منہ لٹکا لیتے۔لیکن ان کی آنکھوں میں نفرت اور بے بسی کے سانپ پھنکارتے صاف نظر آتے۔نفرت اور بے بسی کی یہ ذوتی ابھرتی پرچھائیاں ممکن ہے اس معاشرتی ناانصافی کے خلاف احتجاج کر رہی ہوتیں۔مگر مجو کو محسوس ہوتا جیسے وہ بھی صبر کی تلقین کر رہے ہوں اور وہ صبر کی صورت بن جاتا۔بالکل چپ ہو جاتا۔جیسے پتھر کا بن گیا ہو۔

''ایسا صبر ورضا کا پیکر بچہ کہاں جا سکتا ہے۔ضرور کسی نے اغوا کر لیا ہوگا۔''صابرہ کلیجہ مسوس کر کہتی۔

سات سال کا عرصہ زخم مندمل کرنے کے لئے کم نہیں ہوتا۔شفیع کے غائب ہونے کے دوسرے سال پھر اس کی گود بھر گئی۔ننھے شفیع کو دودھ پلاتے ہوئے وہ سوچتی۔

''اللہ تعالیٰ انسان کو اس کے مقدر بھر ہی دکھ دیتا ہے۔اس کے دکھ سہنے کی استطاعت سے زیادہ نہیں۔مجو کا زخم بھرنے کو ہی اسے اللہ نے شفیع دے دیا۔اس کا روپ ایک بار پھر پورے چاند کی طرح نکھر آیا۔مگر مجو کی یاد کالے بادلوں کی طرح اکثر اس چاند پر سایہ کئے رہتی۔

ماہین نے بیسویں سال میں قدم رکھا تھا۔وہ بی اے کر رہی تھی۔ اسی دوران ایک اچھا رشتہ آنے پر صابرہ نے ہاں بھر لی اور چھوٹی موٹی رسومات کے ساتھ منگنی بھی کر دی۔

لڑکیوں کی پیدائش کے بعد سے ہی مائیں جہیز کے لئے جمع جوڑ کرنے لگتی ہیں۔طے یہ ہوا کہ ماہین بی اے کر لے تو اگلے سال بیاہ کر دیا جائے۔

صابرہ کے ذہن سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا۔اب سال تمام ہونے میں وقت ہی کتنا رہ گیا تھا۔بیٹی کا گھر آباد ہونے کے دل آویز خوابوں نے اسے مدھ ماتی نیندوں کے حوالے کر دیا تھا۔کتنے طویل عرصے تک اس نے مجو کی جدائی کے سنگریزے ان زخمی آنکھوں سے چنے تھے۔وہ سوتے ہی چونک پڑتی تھی۔۔۔اور اب یہ پہلی رات تھی کہ وہ سارے دکھ گروی رکھ کر سو رہی۔اس لئے کہ اگلی رات اسے رشتے کی ایک نند کی بیٹی کی مہندی میں جانا تھا۔شادی بیاہ میں شرکت سے ہی اس کے ہاں بھی لوگوں کا آنا جانا ہوگا۔ورنہ اس نے تو مدت سے جوگ لیا ہوا تھا۔

شام کے سات بج چکے تھے۔ماہین تیار تھی۔روپہلی جوڑے میں وہ چاندنی کی طرح چھائی ہوئی تھی۔صابرہ نے اسے دیکھا اور نظریں پھیر لیں۔پھر آیت الکرسی پڑھ کر اس پر دم کیا۔میاں ٹیکسی لینے گئے تھے۔رفیع اور شفیع ساتھ جانے کو تیار کھڑے تھے۔اس نے سائڈ بورڈ سے تالا اٹھایا۔باہر نکل کر کنڈی چڑھائی۔تالا ڈالا اور پھر تالا کھینچ کر اطمینان کرنے کے بعد وہ گلی سے نکل کر سڑک پر آئی۔میاں ٹیکسی لے کر انتظار میں تھے۔انہیں نیو کراچی جانا تھا۔پل بھر میں ٹیکسی فراٹے بھرنے لگی مگر نیو کراچی پہنچتے پہنچتے بھی گھنٹہ لگ گیا۔آٹھ بج چکے تھے۔ٹی وی ڈرامے کا ایک سیریل شروع ہوا تھا۔چار قسطیں دکھائی جا چکی تھیں۔آج پانچویں قسط تھی۔اور مقبولیت کی دوسری سیڑھی پر۔

ٹیکسی مین روڈ سے نکل کر ایک گلی میں داخل ہوئی تو قریب کے گھر سے ڈرامے کے مکالمے اونچی آواز میں سنائی دینے لگے۔ماہین نے دھیرے سے کہا۔

''امی آج قسط چھوٹ گئی۔ہم ڈرامہ دیکھ کر نکلتے تو۔۔۔!''

''ہنو۔پھر بہت دیر ہو جاتی۔ڈرامہ تم پھوپھی کے گھر دیکھ لینا۔''

اس نے باہر نظریں دوڑائیں۔سڑک کی روشنیاں جیسے دھند میں لپٹی ہوئی تھیں۔

''اے ہے۔کیسا سناٹا ہے۔ان ٹی وی ڈراموں نے تو اور بھی ہولنا کی مچائی ہوئی ہے۔لوگ سرِ شام ہی گھروں میں بند ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔''وہ اونچی آواز میں بولے جا رہی تھی۔غیر ارادی طور پر اس خاموشی کے خوف سے باہر آنے کے لئے۔شاید اس کی آواز اونچی ہو رہی تھی۔ورنہ وہ تو ہمیشہ سے دھیمے لہجے میں بات کرنے کی عادی تھی۔اسی لمحے زور کی چرچراہٹ کے ساتھ ٹیکسی دھچکے سے اچانک رک گئی۔یکایک ایک دم ہی لگے تھے۔صابرہ کی آنکھوں کے آگے اور بھی اندھیرا چھا گیا۔سامنے کالے کالے دھبے تھے اور لمبے لمبے سائے۔

''لڑکی کو نیچے اتارو''۔کسی نے ٹیکسی کی کھڑکی میں ڈھاٹے سے بندھا چہرہ اندر کر کے کہا۔ٹیکسی ڈرائیور کی گردن پر بندوق کی نال رکھی ہوئی تھی۔

''شور مچایا تو سب کے سب لمبے لیٹ جائیں گے۔چپ کر کے لڑکی کو اتارو''

ڈرائیور کے برابر بیٹھے ہوئے صابرہ کے میاں کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔شفیع ماں کی بغل سے چپک کر رہ گیا تھا۔ماہین نے ماں کا پلو کس کے دبا لیا تھا۔وہ بری طرح گھگھیا رہی تھی۔رفیع کا جوان خون ابل رہا تھا۔صابرہ نے دیکھا۔داہنے ہاتھ کی دو کھڑکیوں پر بندوق اور کلاشنکوف لئے دو کالے دھبے تھے اور بائیں ہاتھ کھڑکیوں پر۔۔۔

''جلدی کرو۔''دبی دبی غراہٹ پھر سناٹے کو ایک بار چیر گئی۔۔۔

اس نے بے بسی سے رفیع کو دیکھا۔ وہ پہلو بدل رہا تھا۔۔ پھر اس نے ڈرائیور کی گردن کی جانب مال دیکھی اور ایک دم ہی ہاتھ جوڑ کر گھگیائی۔

'' مجھے اتار لو۔۔۔ مجھے لے جاؤ۔۔۔ میرے بھائی۔ میرے بچے۔ میرے مالک۔ تمہارا خدا بھلا کرے۔ مجھے لے جاؤ۔ خدا کا واسطہ۔ مجھے لے جاؤ۔ مجھے اس کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی۔

'' اترو نیچے'' یہ دو لفظ گولی بن کر اس کے ذہن میں پیوست ہو گئے۔ اور لڑکی کا زیور اتار دو۔''

'' چادر سنبھال۔ ماہین کو پرے دھکیلتے ہوئے وہ آگے کھسکی۔ ماہین نے چوڑیاں اور بندے اتار کر دے دیے۔ دروازہ کھل گیا اور جیسے اس نے اپنی لاش کو خود باہر دھکیل دیا ہو۔ ایک مضبوط ہاتھ نے اس کی باشہ پکڑی اور کھینچ کر برابر کھڑی ہوئی سیاہ رنگ کی کار میں اسے دھکیل دیا۔ پھر چاروں آناً فاناً اس میں بیٹھے اور گاڑی بھاگتی ہوئی' گلیوں سے گھومتی ہوئی سڑک پر نکل آئی۔ ٹیکسی والے کی سانس بحال ہوئی تو اس نے مسافروں کو وہیں اتارا اور کرایہ لئے بغیر ایکسیلیٹر دبایا تو پلٹ کر نہ دیکھا۔ چند نوٹوں سے زیادہ اس وقت جان پیاری تھی۔

صابرہ نے چادر کا کونا کھینچ کر سر ڈھانپنے کی کوشش کی تو اس کے برابر بیٹھے ہوئے نوجوان نے اس کی پسلی میں کہنی ماری اور اپنے ساتھی سے بولا۔

''وقت کھونا نہ کر گاڑی دبا جلدی۔''

گاڑی ایک جھٹکے سے اچھلی اور صابرہ گٹھری بن کر اس نوجوان کی گود میں اوندھی ہو گئی۔

گھپ اندھیرے میں وہ گاڑی سے اتاری گئی اور روشنی سے ڈوبے کمرے میں اس کا لباس تار تار کر دیا گیا۔ ایک نوجوان نے اس کی چادر سے اپنے ننگے بدن کو ڈھانپا اور اس کے برہنہ جسم پر نیل ڈال دیے۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا آیا تو اس کے سوکھے ہونٹوں کو اپنی انگلیوں سے مسوستے ہوئے بچی کھچی شراب اس کے منہ میں انڈیل دی۔

'' پیاس تو لگی ہو گی نا۔۔۔ پی لے تھوڑی۔ چھوکری کو بچا لیا تم نے۔ مجازی۔۔۔ اب خود کو بچا۔'' وہ اسے جھنجھوڑنے لگا۔۔۔

اس کا جوڑ جوڑ اور پور پور فریادی بن کر چیخنے لگا۔ لیکن وہ چپ تھی۔ صابرہ شاکر۔ وہ اپنی بیٹی کو بچانے کی قیمت ادا کر رہی تھی۔

پھر تیسرا آیا۔ وہ ادھ مری ہو رہی تھی۔ چکا چوند روشنی شیشے کی کرچیوں کی طرح اس کی آنکھوں میں اتر رہی تھی۔ مندی مندی آنکھوں سے اس نے دیکھا۔ ڈولتا ہوا نوجوان اپنی پنڈلیوں اور رانوں پر منڈھی ہوئی جینز کی زپ پر ہاتھ رکھے ہوئے اسے گھور رہا تھا۔

''تم۔ تم مجو ہو۔۔۔ وہ پوری جان سے چیخی اور پھر پتھر بن گئی۔

دوسری رات وہ اپنے گھر میں تھی۔

وہ کس طرح پہنچی۔ اس کا اسے علم نہ تھا۔ وہ سن رہی تھی کہ رات کے اندھیرے میں وہ گھر کے سامنے والی سڑک کے فٹ پاتھ پر بیٹھی تھی۔ ایک چادر نے اس کا آدھا سر آدھا بدن ڈھانپا ہوا تھا۔ پھر محلے کا ایک لڑکا اسے گھر کے دروازے پر پہنچا گیا۔ آدھی رات تک سارے محلے والے اور پڑوس والیاں اس کے گھر میں باری باری پھیرا لگا رہے تھے۔ اور اسے دیکھ کر خود حیرت کی تصویر بن جاتے۔ وہ سب کو ٹکر ٹکر دیکھے جاتی۔ بولنا چاہتی پر بول نہ سکتی۔۔۔ اس کی زبان پتھر کی ہو چکی تھی۔ لوگ یہی سمجھ رہے تھے اور یہی کہہ رہے تھے کہ ڈاکوؤں نے اس کے گہنے لوٹ لئے۔ زیور چھین لئے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے ہاتھوں کو دیکھتی جن سے کنگن اتار دے گئے۔ اپنے کانوں کو چھوتی وہاں سے بندے نوچ لئے گئے تھے۔ اپنے گلے پر ہاتھ پھیرتی جس سے گلوبند چھینا گیا۔ اور آہستہ آہستہ ہنستی۔ پھر یکبارگی دل کو دبوچ کر دوہری ہو جاتی۔

بچے اس کے سامنے آنے سے گریز کر رہے تھے۔ شوہر نے اس سے منہ چھپا لیا تھا صرف ماہین اس کے سامنے آتی' اس کے بھینچے ہوئے دانتوں میں گلوکوز اور پانی ٹپکا دیتی۔ اور پھر غسل خانے میں جا کر خون کے آنسو روتی۔ یہ کیسا المیہ تھا۔ اس کی ماں نے اسے بھیڑیوں سے بچانے کے لئے اپنا آپ ان کے سامنے ڈال دیا تھا۔ ان کے خونی پنجوں اور دانتوں کے نشان ماں کے جسم پر جا بجا موجود تھے۔

دوسرے دن رفیع ڈرتے ڈرتے ماں کے سامنے آیا۔ اس کی آنکھیں بھی متورم ہو رہی تھیں۔ وہ آہستگی سے ماں کے سامنے بیٹھ گیا۔

''امی جان۔۔۔'' اس نے لب کھولے۔ ماں کے پاؤں پر ہاتھ رکھا۔

صابرہ غور سے اسے ایک ٹک دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم ہی بپھر کر اس نے رفیع کا گلا دبوچ لیا۔

'' تم۔۔۔ تم۔۔۔ مجو ہو۔۔۔ تم نے ماؤں کے جسم کی نہیں ان کے دلوں کی آبرو ریزی کی ہے۔ میں تم کو پھانسی دوں گی۔ اپنے ہاتھوں سے پھانسی دوں گی۔'' وہ پاگلوں کی طرح چیخے جا رہی تھی اور طاقت سے رفیع کا گلا دبا رہی تھی۔ اسی لمحے اس کا شوہر بھاگ کر آیا اور اپنی ساری طاقت صرف کر کے اس نے رفیع کو الگ کیا۔

''پاگل خانے بھیجنا ہو گا۔ مجبوری ہے۔ کیا کریں۔ کون سنبھالے گا اسے؟'' بڑبڑاتے ہوئے اس نے بے بسی سے صابرہ کی طرف دیکھا۔

صابرہ کی خوبصورت آنکھیں دیوار پر لگی ہوئی تھیں۔ ساکت و صامت۔ سونا تھی کی مورتی کی طرح۔ لیکن اس کی گھٹی گھٹی آہیں اور کراہیں اس کی زبان بن گئی تھیں۔

مانوسیوا اسمیتی

(خدمت گار انساں سوسائٹی)

کوثر صدیقی (بھوپال بھارت)

''نہیں میں شاکر ہی سے شادی کروں گی'' روتے ہوئے ریتا نے چیخ کر کہا۔

''نہیں بیٹی' یہ شادی ممکن نہیں ہے۔ ایک مسلمان لڑکے سے ایک ہندو لڑکی کی شادی کیسے ہو سکتی ہے'' ریتا کے باپ گھنشیام داس نے اسے سمجھایا۔

''ہو سکتی ہے' ہم کورٹ میرج کریں گے۔ وہ اپنے مذہب پر قائم رہےگا' میں اپنے دھرم کا پالن کروں گی۔ ہم دنیا کے سامنے ایک مثالی شادی اور ہندو مسلم ایکتا کا بہترین نمونہ پیش کریں گے۔'' ریتا نے پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔

''خوب سوچ لو۔ زندگی کے فیصلے جذبات اور جوش میں نہیں ہوش میں کیے جاتے ہیں''

گھنشیام داس غصے میں اپنے پاؤں زمین پر زور زور سے پٹختا ہوا چلا گیا۔

ریتا اور شاکر ایک ہی محلے میں رہتے تھے اور ساتھ ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ ایک ہی اسکول میں پڑھ کر ہائر سکینڈری کیا تھا کالج تک پہنچتے پہنچتے بچپن کی دوستی محبت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ دونوں خود کو زندگی کے لمبے راستے کا ہمسفر مانتے ہوئے منزل کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ دونوں نے ڈاکٹر بننے کے بعد ایک مانوسیوا اسمیتی بنا کر انسانی خدمات کی اسکیم بنائی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ملک کی ایک چھت کے نیچے رہ کر بھی ہندو مسلمان سکھ عیسائی الگ الگ خیموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ انھیں پیار اور انسانی خدمات کے ذریعے ہی ایک پلیٹ فارم پر لایا جا سکتا ہے۔

شاکر پری میڈیکل ٹیسٹ پاس نہیں کر پایا اس لیے وہ بی ایس سی اور ایل۔ ایل۔ بی کر کے وکیل بن گیا۔ ریتا نے ایم بی بی ایس کر کے خود کی ڈسپنسری کھول لی۔ ریتا کے گھر والوں کو ان دونوں کے عشق و محبت کی خبر تو اسی وقت لگ گئی جب انھوں نے کالج میں داخلہ لیا تھا۔ دونوں کے والدین مغربی تعلیم یافتہ' روشن دماغ اور جدید خیالات کے تھے لیکن بین المذاہب یعنی انٹر کاسٹ شادی کی اجازت دینے کی حد تک روادار بھی نہیں تھے۔ شاکر کے گھر والوں کی سوچ تھی کہ لڑکے کا معاملہ ہے' کھیلنے کودنے کے بعد سمجھ آ جانے پر خود ہی راہ راست پر آ جائے گا۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ ریتا کے گھر والے اس شادی کے سخت مخالف ہیں۔ ریتا کے ماں باپ سوچتے تھے کہ ریتا شاکر سے چاہے جتنی محبت کرتی ہو لیکن ایک مسلمان سے شادی کر کے خاندان کی رسوائی کی حد تک قدم نہیں اٹھائے گی۔

اس زمانے میں شہر میں فرقہ پرستی نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ مندر مسجد کے جھگڑے نے ہندو کو مسلمان سے اور مسلمان کو اپنے ہندو بھائی سے الگ کر دیا تھا۔ محلہ محلہ کوچہ کوچہ باہمی نفرت کی گہری خندقیں کھد گئی تھیں جس میں گر گر کر ہندو مسلمان آپس میں دست و گریباں ہونے لگے تھے۔ دھیرے دھیرے نفرت کی آگ دشمنی بن کر ہر دل میں سلگ رہی تھی۔ آخر ایک رات کی سیاہ صبح کو فرقہ واریت کا دیو اپنے منہ سے آگ اگل کر شہر میں دنگے کے شعلے بھڑکا تا ہوا نفرت کی گہری خندق سے نکل پڑا۔ رام مندر رز مان کے کارسیوکوں کو گودھرا (گجرات) میں فتنہ خیز شیطانی طاقتوں کے ذریعہ سابرمتی ایکسپریس کی ایک کوچ کو جلا دینے کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر شعلوں کی لپیٹ آ گیا تھا۔ ایسا لگا جیسے ہر گلی اور کوچے میں پہلے ہی سے بارودی سرنگ بچھی ہوئی تھی صرف ایک چنگاری کی ضرورت تھی۔

مکانوں، دکانوں کی آگ تو فائر بریگیڈ بجھا سکتے ہیں مگر دلوں کی آگ بجھانے والے فائر بریگیڈ کی لاریوں کے ٹائر پھٹ کر ان کے پہیے زمین میں دھنس گئے تھے۔ ان کا پٹرول ختم ہو چکا تھا۔ ان کو چلانے والے آگ میں جھلس جانے کے ڈر سے اپنی جان بچا کر بھاگ گئے تھے۔ شہر میں محبت کا کاروبار ٹھپ تھا۔ صرف نفرت کا کاروبار اپنے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ کر نئی تاریخ لکھ رہا تھا۔ اس کے بیوپاریوں نے تلوار' خنجر' بلم' بھالے' بندوق اور بم بنانے کے کارخانے راتوں رات کھول لیے تھے جو چوبیسوں گھنٹے کام کرنے لگے تھے۔ شہر کے غنڈوں بدمعاشوں کے علاوہ آس پاس کے علاقوں کے جرائم پیشہ آدی واسیوں کو جمع کر کے انھیں ٹرینڈ کر کے توڑ پھوڑ' قتل' لوٹ اور آتش زنی کرائی جا رہی تھی۔ اس آتشیں کاروبار میں کرائے پر حاصل کیے گئے ان لوگوں کو شراب و کباب اور ''شکار کا شباب'' بطور بونس مہیا کرنے کا بھی انتظام تھا۔ خوب پی پا کر خوب نشے کی حالت میں انسانی خون بدمزہ نہ لگے۔ آگ تھی کہ جنگل کی آگ کی طرح بجھنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ ادھر بجھی ادھر لگی۔ ادھر لگی ادھر بجھی۔ کبھی گھٹی کبھی بڑھی۔ انسانیت کا قتل ہو چکا تھا۔ ہر طرف شیطان ننگا ناچ دکھا رہا تھا۔ خوف اور موت کے سیاہ سائے میں قتل' خون' لوٹ' آگ' بلاتکار (زنا) جلتی لاشیں' جلے ادھ جلے مکانوں میں سڑتی لاشوں کا انتہا تعفن۔ جن ہاتھوں پر شیطان کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالنے کی ذمہ داری تھی وہ الٹا شیطان کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے۔

ایسے ماحول میں جب کہ قانون تماش بین کی طرح دور کھڑا تھا' گھن شیام داس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے سوچا شاکر کو اگر دنگوں کے بہانے ختم کرا دیا جائے تو کچھ دن رو پیٹ کر ریتا کو خود بخود صبر آ جائے گا اور یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ دوسرے دن ہی خبر ملی کہ دنگائیوں نے شاکر اور اس کے ماں باپ کو سوتے میں پٹرول ڈال کر زندہ جلا دیا اور گھر بھی جل کر راکھ کا ڈھیر ہو

۔باقی بشری لاڑکی میں۔

گل وگلزار کا رنگ

محمود الحسن (راولپنڈی)

کیا کرے دیکھ کے کوئی گل وگلزار کا رنگ
وہ کہاں اور کہاں آپ کے رخسار کا رنگ

ان کے جاتے ہی یہ کیا حال ہے میرے گھر کا
اب نہ وہ در کی ہی صورت ہے نہ دیوار کا رنگ

چاندنی رات کبھی، پر تو خورشید کبھی
ایک سے ایک ہے دلکش ترے انوار کا رنگ

میرے اشکوں کو لہو رنگ کیا ہے تو نے
میری آنکھوں سے برستا ہے ترے پیار کا رنگ

خون عشاق کی رگ رگ میں رواں ہے جب تک
یوں ہی گلرنگ رہے گا رسن و دار کا رنگ

میں نے مانا کہ وہ زخموں سے ہے لاچار مگر
قابل دید ہے پھر بھی ترے بیمار کا رنگ

تیری پہچان یہی رنگ بنے گا اے دوست
رنگ لائے گا کسی دن تو مرے پیار کا رنگ

کاش پھر ملتِ بیضا میں نظر آئے کبھی
کہیں رازی کا، کہیں رومی و عطار کا رنگ

میرے اشعار ہیں عشقِ شہِ بطحاؐ کی دلیل
کیوں نہ ہو سب سے نرالا مرے اشعار کا رنگ

عشق کا رنگ بھی کچھ کم تو نہیں ہے محمود
ہے گرانما یہ اگر حسن کے بازار کا رنگ

محسن احسان (پشاور)

حیران زمانے کو بہت کر گئے ہم بھی
دشمن کو تو للکارا، مگر ڈر گئے ہم بھی

یاروں کو شکایت تھی بہت تشنہ لبی کی
پیمانوں میں سب تن کا لہو بھر گئے ہم بھی

شاید کسی ملبوس کی خیرات ہی مل جائے
پیوند سجائے ہوئے گھر گھر گئے ہم بھی

خورشید نہ مہتاب، نہ جگنو، نہ ستارہ
جینے کی ہوس دل میں لئے مر گئے ہم بھی

دن بھر کے دکھوں کو لئے ہم اپنی بغل میں
محسن ہوئی جب شام تو پھر گھر گئے ہم بھی

○

سید مشکور حسین یادؔ (لاہور)

چپ ہو صلائے عام کی آنکھوں میں آنسو ہیں
کچھ تو کہو کلام کی آنکھوں میں آنسو ہیں

اپنے لیے تو عمرِ دو روزہ بھی کم نہ تھی
کیا کیجئے دوام کی آنکھوں میں آنسو ہیں

ہر شے کو ہے عزیز ہماری سلامتی
ہر اک دعا سلام کی آنکھوں میں آنسو ہیں

انسان کیوں نہ کر سکا انسان کی شناخت
پیہم نمود و نام کی آنکھوں میں آنسو ہیں

رونے کا اپنے ہم نہیں کر سکتے کچھ حساب
اس درجہ صبح و شام کی آنکھوں میں آنسو ہیں

بے نظم و ضبط دیکھ کے نوعِ بشر کی زیست
ہر حسنِ اہتمام کی آنکھوں میں آنسو ہیں

یادؔ اس حسیں کے چہرے پہ کیوں پڑ گئی نظر
بس یوں سمجھ تمام کی آنکھوں میں آنسو ہیں

○

ڈاکٹر مظفرؔ حنفی (دہلی بھارت)

مدت سے ڈھونڈتے ہیں اسے ہم خرابِ شہر
تھی ایک شکل دل کے لیے انتخابِ شہر

بیٹے سی کانپتی ہوئی بوڑھی شفیق ماں
آیا ہے تار گاؤں میں لے کر جوابِ شہر

تیری کوئی کرن مری تقدیر میں نہیں
میں جنگلوں کی رات ہوں تو ماہتابِ شہر

رکشا چلا رہا ہوں، ابھی کل کی بات ہے
شانے پہ دل کا بوجھ تھا آنکھوں میں خوابِ شہر

کچھ اس قدر خلوص کہ دم پھولنے لگے
اتنی زیادہ روشنی جیسے نقابِ شہر

انسان ہاتھ پاؤں سے معذور ہو گیا
نازل ہوا مشین کی صورت عذابِ شہر

قصبے کی آبرو تھے مظفرؔ میاں کبھی
مسحور کر چکا ہے انھیں اب سرابِ شہر

○

شبنم شکیل
(اسلام آباد)

ہم تو گواہ ہیں کہ غلط تھا لکھا گیا
کیا فیصلہ ہوا تھا مگر کیا لکھا گیا

یہ کیسی منصفی تھی کہ منصف کے روبرو
جھوٹی شہادتوں کو بھی سچا لکھا گیا

مکتوبِ غم ہمارا پڑھا ہی نہیں گیا
ورنہ تو اس میں حال تھا سارا لکھا گیا

ملزم کو بھی تو ملتا ہے کچھ بولنے کا حق
پھر کیوں نہیں بیان ہمارا لکھا گیا

ہم چپ رہے کہ فیصلہ سارا تھا طے شدہ
یعنی جو مدعی نے لکھایا' لکھا گیا

پہلے عطا ہوا ہمیں تخلیق کا ہنر
کلکِ ازل سے پھر ہمیں تنہا لکھا گیا

○

مامون ایمن
(نیویارک)

اِشارہ بے محابا ہو رہا ہے
زمانہ خواب پیما ہو رہا ہے

کِسی قطرے کی قسمت جاگ اُٹھی
سمندر دشت آسا ہو رہا ہے

چھپائے جا رہی ہیں غم کو آنکھیں
خوشی کا راز اِفشا ہو رہا ہے

نصیبہ ڈھونڈ تا پھرتا ہے خود کو
اَزل سے اِک تماشا ہو رہا ہے

تِری باہوں میں ہیں زخمی شگوفے
یہ کیوں کر' اے بہارا' ہو رہا ہے

کِسی دیوار سے کٹ کر' جفاؤ کا
پیامی کوئی جھونکا ہو رہا ہے

پنپتی ہے فنا سَر دوریوں میں
قرابت کا تقاضا ہو رہا ہے

نئی منزل کی خاطر کوئی رستہ
نئے رخ سے ہویدا ہو رہا ہے

سوالوں سے اَنا ہے آئینہ' یوں
عدو اپنا سراپا ہو رہا ہے

ہدف نا آشنا ہیں تیر کیا اب
سفر منزل شناسا ہو رہا ہے

تجی یادیں سہارا بن رہی ہیں
کہ زخموں کا مداوا ہو رہا ہے

کھلے جاتے ہیں تنہائی میں ایمنؔ
بھری محفل کا سودا ہو رہا ہے

انور سدید

(لاہور)

یہ اہلِ درد نے دل کھول کر اٹھایا ہے
خزانہ ہوں نے خوشبو کا جو لٹایا ہے

مجھے یقیں ؟ کہ اب روشنی ہی پھیلے گی
چراغ اس نے اندھیرے میں اک جلایا ہے

رقیب خیر منائیں اب اپنی پگڑی کی
مجھے تو اس نے بھری بزم سے اٹھایا ہے

تھا انتظار تو میں نے چراغِ دل اپنا
کبھی جلایا، کبھی آپ ہی بجھایا ہے

بکھرتی جائیں گی انور سدیدؔ خوشبوئیں
کہ ہوں اک ترے آنگن میں مسکرایا ہے

○

کرشن کمار طور

(دھرم شالہ بھارت)

خدا اب ہے خدا پہلے نہیں تھا
تو کیا اچھا برا پہلے نہیں تھا

یہ پانی کوئی آبِ زر نہیں ہے
جو ہے لکھا ہوا پہلے نہیں تھا

مجھے اول تماشا دیکھنا ہے
زمیں پر دوسرا پہلے نہیں تھا

ہے اب شہرت ہوا جب سے قلم سر
کوئی پہچانتا پہلے نہیں تھا

ہنر مجھ میں کوئی باقی نہیں ہے
زیاں ایسا مرا پہلے نہیں تھا

ہے کچھ اب اور ہی میرے لہو سے
کہ یہ رنگِ حنا پہلے نہیں تھا

جو پہلے تھا وہی تو طورؔ ہے اب
جو ہے طور اب وہ کیا پہلے نہیں تھا

○

ڈاکٹر خالد حمید شیدا
(ٹیکساس)

طناز وہ اک ناز سے دیکھے ہے جدھر بھی
زخمی وہ کرے دل بھی ہے سب کا وہ جگر بھی

کچھ ایسی سمائی ہے وہ آنکھوں میں ہماری
آتی ہے نظر ہم کو ادھر بھی وہ ادھر بھی

دردِ غمِ الفت میں ہے تاثیر کچھ ایسی
ہو جائے ہے زائل وہاں دارو کا اثر بھی

پیچیدہ کچھ ایسی ہے رہِ منزلِ جاناں
ہو جائے ہے گمراہ وہاں جا کے خضر بھی

اللہ رے چلنے کا یہ انداز ہے کیسا
جب پاؤں لڑھکتا ہے لچکتی ہے کمر بھی

روتا ہے جدائی میں تری ابرِ بہاراں
دیدہ مرا بارش نے کیا اور ہے تر بھی

شیدا ہے طلبگار ترے ریشِ نظر کا
اے جانِ جہاں نوشِ رداں دیکھ ادھر بھی

پی۔ایس۔جین جوہر (میرٹھ بھارت)

وہی نظارے، وہی مراحل، وہی شب و روز کے مشاغل
مگر نہ وہ ولولے ہیں دل میں، نہ لطف ہوتا ہے مجھ کو حاصل
بڑے بڑے واقعات سن کر نہ ہوتی ہے میرے دل میں ہلچل
نہ جانے کیا مجھ کو ہو گیا ہے، بزرگوں میں ہو گیا ہوں شامل
میں بچپنے میں یہ سوچتا تھا بنوں گا اقبالؔ اور ٹیگور
یہ کیا پتہ تھا کہ بیچ میں ہی ڈبو دیں گے زیست کے ساحل
نکلنے کو میرے ذہن و دل سے، ہزاروں نغمے تڑپ رہے ہیں
کہاں سے لاؤں میں وقت فرصت، سجاؤں شورِ وغل کی محفل
کبھی میں شاعر، کبھی ہوں تاجر، میں ساتھ دو زندگی جیا ہوں
کہ دن میں ہوں ایک کاروباری، تو شب میں شعر و سخن پہ مائل
سمیٹ کر سب کا درد دل میں وطن کی آواز بن گیا ہوں
کبھی سمندر کا ہوں تلاطم، کبھی میں امن و اماں کا ساحل
جسے سمجھتے تھے کل ہم اپنا، وہ آج بیگانہ ہو گیا ہے
مری سیاست کا بھید لے کر، وہ ہو گیا دشمنوں میں شامل
نہ زندگی کا کوئی بھروسہ، نہ موت کا وقت ہی معین
ہزاروں ارمان دل میں لے کر، چلا ہے انسان سوئے منزل
کھڑے ہیں ایسے مقام پر ہم، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن
ادھر عزیزان و اقربا ہیں۔ ادھر منتظر سنہری منزل
سوا دِ گنگ و چمن سے اڑ کر، بچی ہے کچھ خاک پائے اردو
اسی کا ہوں اک حقیر خادم، نہ ہونے دوں گا اب اور زائل
تمام سرحد کی بندشوں کو، بہ جنبشِ یک قلم اڑا دیں
نہ بچھڑے کنبوں کو پھر ملانے میں کوئی قانون ہو گا حائل
مجھے یہ لگتا ہے نسلِ انسان جلد ہی خود کشی کرے گی
کبھی تو آئے گی ہی قیامت، چلیں گے ایٹم بم و میزائل
مزار ہوں گے، نہ ان پہ کتبے، نہ فاتحہ پڑھنے والا کوئی
تمام دھرتی چتا بنے گی، نہ کوئی مقتول اور نہ قاتل
مگر یہ قدرت کا قاعدہ ہے کہ پھر اگیں گے یہ پھر اٹھیں گے
یہ پھول پتے، یہ پیڑ پودے، یہ آدم و حوا کے مسائل
کہاں سے آتی ہیں اتنی روحیں، جو رونما ہوتی ہیں جہاں میں
گناہوں کا خود پہ بوجھ رکھنے کروڑوں جسموں میں ہو کے

سرور انبالوی

(راولپنڈی)

تیرگی سورج کی خاطر اور نہ تارے کیلئے
چھوڑ دیتی ہے یہ رستہ صبح کے دھارے کیلئے

عشق کی ناکامیوں کا اب گلہ! کیا فائدہ
کام ایسا خود ہی کر بیٹھے خسارے کیلئے

گھر کی چھت کو بھی وہ لے بیٹھا ہے اپنے ساتھ ہی
جو ستوں ہم نے اٹھایا تھا سہارے کیلئے

ڈوبنا ہی تھا مقدر نا خدا کا روش کیا
ہاتھ پاؤں تو بہت مارے کنارے کیلئے

ہم لگائیں گے گلے خود بڑھ کے نخلِ دار کو
منتظر بیٹھے ہیں قدرت سے اشارے کیلئے

ایک اک کر کے دیئے گل کر گئی ہیں آندھیاں
اب تو مدت سے ترستے ہیں شرارے کیلئے

جانے کس منزل پہ لے آئے ہیں رہبر قافلے
باپ بچے بیچ دیتے ہیں گزارے کیلئے

رہ گیا میلہ بچھڑ کر بھیڑ ساری چھٹ گئی
رہ گیا بچہ ترستا اک غبارے کیلئے

شہر اس کی دید کو اُمڈا سرور انبالوی
اس نے گھر کی کھڑکی کیا کھولی نظارے کیلئے

غالب عرفان

(کراچی)

تصورات سے اوپر اچھال آیا ہے
جو میری فکر کا مجھ میں ابال آیا ہے

میں اپنے آپ کو تقسیم کر رہا ہوں پھر
یا میرے ذہن کے شیشے میں بال آیا ہے

اب اُس فقیر سے پوچھوں حیات کی قیمت
جو اپنی نیکیاں دریا میں ڈال آیا ہے

سفر سے لوٹ کے آیا تو اک ستارہ شناس
نفس نفس کا توازن سنبھال آیا ہے

گزشتہ دور کی تاریخ گم شدہ کا ورق
ہمارے سامنے بن کر سوال آیا ہے

بکھر نہ جائے وہ لہروں میں بحرِ عرفاںؔ کی
جو اپنے دل کا سمندر کھنگال آیا ہے

○

غلام مرتضیٰ راہی

(فتح پور/بھارت)

(صفوت علی صفوتؔ کی نذر)

میں اپنے آپ میں کبھی تنہا نہیں رہا
یہ اور ہے کہ دیکھنے والا نہیں رہا

موسم کا یہ تقاضا کوئی آج کا نہیں
ساحل کے بس میں پہلے بھی دریا نہیں رہا

آؤ تمھیں دکھاؤں قیامت کے منکرو!
عالم وہ ہے کہ کوئی کسی کا نہیں رہا

ہم نے جہاں بھی چاہا ذرا جم کے بیٹھنا
کچھ دیر بعد ہی وہاں سایا نہیں رہا

انداز اس کا اب بھی وہی دیکھنے کا ہے
یہ جان کر کہ اب میں تماشا نہیں رہا

جس کا ہے یہ وہ رکھے نظر اس کی چال پر
''اب ہم کو اپنے دل پہ بھروسا نہیں رہا''

○

قیصر نجفی

(لاہور)

میں زندگی کے سفر سے گریز پا تو نہیں
کہ چل رہا ہوں مسلسل کہیں رکا تو نہیں

ہر ایک شے پہ مجھے اختیار کیوں کر ہو
میں ایک بندۂ لاچار ہوں' خدا تو نہیں

یہ اور بات کہ لو تھرتھرا اٹھی ہے مری
دیا ہوں تیز ہواؤ ! مگر بجھا تو نہیں

وہ چند سانس تھے میرے جو ختم ہو گئے آخر
میں اب بھی وقت کے ہونٹوں پہ ہوں مرا تو نہیں

یہ تنگ دستی' یہ بے چارگی' یہ ناداری
مجھے ستائیں گی کب تک' میں بے خدا تو نہیں

ہوا ہوں قتل میں قسطوں میں عمر بھر یا رب
یہ موت تحفہ سہی' میرا خوں بہا تو نہیں

خدا کو تو نے یہ لکھا ہے پہلا خط قیصرؔ
کسی نے لکھا ہو پہلے' کبھی سنا تو نہیں

○

تشنہ بریلوی
(کراچی)

ٹھوکر نہ مار راہ میں پتھر ہیں سر بھی ہیں
ان کنکروں کے ساتھ چھپے کچھ گہر بھی ہیں

ہر قصرِ پُر غرور کی تعمیر میں نہاں
تخریب کے نشاں یہ ہزاروں کھنڈر بھی ہیں

اے زلفِ خم بہ خم ترے جلوے ہیں یم بہ یم
اس دل سے ملتے جلتے بہت سے بھنور بھی ہیں

فصلِ بہار کیا کسی آتش فشاں سے آئی!
پھولوں کے ساتھ شاخ پہ دیکھو شرر بھی ہیں

دیدارِ یار کے لئے مقتل میں آ گئے
دار و رسن تو نصب سرِ رہگزر بھی ہیں

ہے خندہ زن مریض بھی اس اہتمام پہ
اب چارہ گر کے ساتھ کئی نوحہ گر بھی ہیں

اپنا دیار جن کے سبب چھوڑنا پڑا
اے دل وہ مہربان شریکِ سفر بھی ہیں

○

رب نواز مائل
(کوئٹہ)

بہت اداس سا اس سے سب رہا کیوں
ہمیں جینا محال ایسا ہوا کیوں

یہاں گھر بھی تھا اس کا دوست بھی تھے
وہ یہ سب چھوڑ کر جانے گیا کیوں

یہ جیسی آفتیں اس سے بھی دیکھیں
سو اب یہ سوچتے ہیں دل ملا کیوں

نشے جب زور پہ ہوں تو نہ پوچھو
کہاں ساغر کہاں پھر غم بڑھا کیوں

یہ تم سے کتنی باتیں روز کرتا
یہ تم سے پھر اچانک دل پھرا کیوں

کہ جتنا حسن، یہ اس سے وہاں تھا
تو ذکر اتنا، نہ خوش اس کا رہا کیوں

○

رضا رامپوری
(بھوپال بھارت)

خوں بھری رکھی ہے زخموں کی قبا میرے گھر
آج کل تو بھی نہ آ بادِ صبا میرے۔۔۔گھر

وہ نہ آئے نہ قضا آئی ' نہ کوئی مہمان
رات پھر کس نے لگائی تھی صدا میرے گھر

دیکھ کر حالِ مرا خود سے کرے گی نفرت
آئے تو گردشِ ایام ذرا میرے۔۔۔گھر

مجھ کو تفریح کا سامان سمجھتے ہیں لوگ
کس کو یہ فکر کہ چولہا بھی جلا میرے گھر

آج ہونٹوں پہ کئی بار ہنسی آئی ہے
وقت اتنا کبھی ٹھہرا تو نہ تھا میرے گھر

آج تو کچھ بھی نہیں انکی تواضع کیلئے
کاش ایسے میں نہ آئے وہ رضاؔ میرے گھر

○

ماجد سرحدی
(پشاور)

کب تک ہم افسردہ رہیں گے آ کریوں میخانے میں
کب تک گھولیں زہر ہم اپنی آنکھوں کے پیمانے میں

بوجھل دھنوں کے سائے میں جینا بھی کیا جینا ہے
گلشن گلشن پھول بکھیرو رنگ بھرو افسانے میں

ریت پہ چلئے دھوپ میں جلئے تب تو کوئی بات بھی ہے
یہ کیا دن محلوں میں کاٹا شب کاٹی میخانے میں

راحت کے دھارے پر بہنا زیست سے ناانصافی ہے
جینے والوں لطف بہت ہے موجوں سے ٹکرانے میں

ناامیدی کفر ہے پیارے صبح بہاراں آئے گی
رنگ برنگے پھول کھلیں گے اک دن اس ویرانے میں

فرشِ راہ بنی ہیں ماجدؔ کتنی آنکھیں سوچو تو
لوگوں نے کیا دیکھ لیا ہے آخر مجھ دیوانے میں

○

گلشنِ کہنہ

(پ۔ کے)

دل کو نثارِ خنجرِ جاناں بنا دیا
ہم نے تمہارے عیش کا ساماں بنا دیا

رستہ مری حیات کا دشوار تھا بہت
لیکن تری نگاہ نے آساں بنا دیا

درکار اسے بھی مشقِ ستم کے لئے تھا کچھ
ہم نے بھی اپنے خون کو ارزاں بنا دیا

سارے جہاں کی ذلتیں اس نے خرید لیں
دنیا کو جس نے مقصدِ ایماں بنا دیا

بس اک نظر سے اس نے ہماری حیات کو
خنداں بنا دیا کبھی گریاں بنا دیا

پھر کس لئے امید ہے فصلِ بہار کی
گلشن کو جب کہ آپ نے ویراں بنا دیا

○

اسلم راہی

(اسلام آباد)

وہ ابر کے ٹکڑے وہ مرے خواب بہت تھے
ٹوٹے تو مگر منکرِ تہِ آب بہت تھے

غیروں کے بھلانا ز اٹھاتا بھی کہاں تک
روٹھے ہوئے مجھ سے مرے احباب بہت تھے

دنیا ترے اسلوب نے پامال کیے ہیں
اکثر وہی غنچے کہ جو شاداب بہت تھے

کس کس کو سلگتی ہوئی پلکوں پہ سجاتا
لمحات ہی تھوڑے تھے مرے خواب بہت تھے

مقتل میں کوئی لیکے جب آیا تجھی دیکھا
دشمن تھے مرے کم مرے احباب بہت تھے

ہم سے جو تلف ہوتے رہے ہیں وہی آنسو
شعروں میں پرو لیتے تو نایاب بہت تھے

سو بار وہیں سے ترا گزرا ہے سفینہ
جس راہ میں طوفان کے اسباب بہت تھے

آ شفتہ سری تو نے کہیں کا نہیں رکھا
ہر چند کہ ہم واقفِ آداب بہت تھے

کتنوں کو بجھاتیں تری ظلمت کی ہوائیں
آنکھوں میں چمکتے ہوئے مہتاب بہت تھے

وہ دن بھی مجھے اچھی طرح یاد ہیں راہی
جب مجھ پہ نچھاور مرے احباب بہت تھے

خورشید انور رضوی
(اسلام آباد)

خود بھی تو کبھی دیکھتے ہم خود سے نکل کے
رکھے گئے ہیں کتنے قدم سوچ سمجھ کے

ایسا تو نہیں سمتِ سفر اپنی غلط ہو
اِک بار ذرا دیکھ لیں رستہ ہی بدل کے

گھاٹا تو کسی ایک کو کھانا ہی پڑے گا
میزان میں رکھ دے جو کوئی بات بدل کے

کچھ سیر و سفر بھی تو بدن کی ہے ضرورت
موسم بھی نیا دیکھنا ہے گھر سے نکل کے

اب عدل و عدالت کے نئے باب کھلیں گے
اب تازہ لکھے جائیں گے سب فیصلے کل کے

اِس عالمِ اِمکاں کی کوئی ایک جہت ہے
لکھو تو ہزاروں نئے مضمون غزل کے

○

مہندر پرتاپ چاند
(انبالہ،بھارت)

میں نے کب اپنی وفاؤں کا صلا مانگا تھا ؟
اک تبسم ہی ترا بہرِ خدا مانگا تھا!

کیا خبر تھی مری نیندیں ہی اجڑ جائیں گی
میں نے کھوئے ہوئے خوابوں کا پتا مانگا تھا!

دستِ گلچیں نے بھی گلشن سے وہی پھول چنا
میں نے جس گل کے لئے دستِ صبا مانگا تھا!

شدتِ غم میں دعا کی تھی تجھے بھولنے کی
اب بھرے زخم تو نادم ہوں یہ کیا مانگا تھا!

بس اسی بات پہ برہم ہے زمانہ ہم سے
اپنے بدخواہوں کا بھی ہم نے بھلا مانگا تھا

کوئی بھی عرض نہ ہو پائی قبول اس کے حضور
غالباً میں نے ہی کچھ حد سے سوا مانگا تھا!

چوڑیاں ٹوٹیں تو زخموں سے لہو رنگ ہوئی
جس ہتھیلی کے لیے رنگِ حنا مانگا تھا

تو نے ہر غم سے نوازا ہے۔ ترا خاص کرم
مجھ کو اب یہ بھی نہیں یاد کہ کیا مانگا تھا!

آفتیں سہنے کا یارا بھی تو دیتا یا رب!
اور تو کچھ بھی نہیں اس کے سوا مانگا تھا

یہ الگ بات ، ملا کربِ مسلسل ، ورنہ
ہم نے جو مانگا بہ صد صدق و صفا مانگا تھا

ذہن پر چاند ! پھر اک برق سی لہرانے لگی
میں نے ماضی کے نہاں خانوں سے کیا مانگا تھا؟

یہ وفا کی سخت راہیں

مشتاق اعظمی (اسنسول بھارت)

راجنی گندھا کی بھینی بھینی خوشبو سے معطر خواب گواہ میں داخل ہونے کے بعد اس نے دلہن کا زرتار گھونگھٹ اٹھایا تو سرخ غلاف میں لپٹا ’سنگ مرمر سے ترشا ہوا ایک خوبصورت گلاب نگاہوں کے سامنے تھا۔ اس کی خوابیدہ آرزوؤں میں یکا یک چمک سی جاگ اٹھی اور اس نے بے اختیار ہو کر اس شگفتہ گلاب کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

لیکن یہ تو چھ مہینہ پہلے کی بات ہے۔۔۔

آج کا قصہ یوں ہے کہ ایک مشہور مصنف کا ناول اسے مل گیا تھا اور اس نے پہلی فرصت میں اسے پڑھ ڈالا تھا۔ جس میں مضمون تھا کہ ایک شادی شدہ مرد اپنی بیوی کی نگاہوں سے چھپ چھپ کر رنگ رلیاں مناتا ہے۔ لیکن ایک دن اچانک جب اس کی عیاشیوں کا پردہ فاش ہو جاتا ہے تو حیلے اور بہانے سے کام لینے کے بجائے وہ صاف لفظوں میں بیوی کے سامنے اعتراف گناہ کر لیتا ہے۔ بیوی کے دل میں اگرچہ نفرت کی جوالا بھڑک اٹھتی ہے پھر بھی وہ ضبط و تحمل سے کام لیتی ہے اور شوہر کو نشانۂ ملامت نہیں بناتی بلکہ نرمی کے ساتھ سمجھاتی ہے کہ جو ہو گیا اسے بھول جائیے۔ زندگی بہت لمبی ہے۔

بیوی کا خلاف توقع رویہ شوہر کے لیے تازیانہ ثابت ہوتا ہے اور وہ آئندہ کے لئے ایک اچھا انسان بننے کا عزم کرتا ہے۔

یہ ناول کے کلائمکس کا اثر ہی تھا کہ جب جمیلہ شام کی چائے لے کر کمرہ میں آئی تو نوشاد نے اسے پلنگ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کسی تمہید کے بغیر کہنا شروع کیا۔

’’جمیلہ! اب جب کہ ہم زندگی کی نئی مسرتوں سے ہمکنار ہو چکے ہیں اور ہماری محبت نئی وسعتوں سے آشنا ہو چکی ہے، یہ احساس میرے دل کو کچوکے لگا رہا ہے کہ ایک موقع پر مجھ سے ایسی بھول ہوئی تھی جو تمہاری امانت میں خیانت کا درجہ رکھتی ہے۔۔۔‘‘ جمیلہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ نوشاد کا چہرہ پر سکون تھا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر جمیلہ کے پہلو میں بیٹھ گیا اور اس کی چاند جیسی پیشانی کا بوسہ لینے کے بعد بولا:

’’دیکھو، ہمارا رشتہ یقین اور اعتماد کا ہے۔ ہمیں زندگی کی پُر پیچ راہوں پر قدم سے قدم ملا کر لمبا سفر طے کرنا ہے اس لیے اب میں اس بوجھ کو اتار پھینکنا چاہتا ہوں جو تمہارے پاکیزہ وجود کے احساس نے میرے ذہن پر مسلط کر دیا ہے۔ لیکن سوچتا ہوں کہ کہاں سے شروع کروں۔‘‘ اتنا کہہ کر نوشاد خاموش ہو گیا۔ چند لمحوں کی بوجھل خاموشی کے بعد وہ دوبارہ یوں گویا ہوا:

’’اس دن آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وقفہ وقفہ سے زوروں کی بارش ہونے لگتی تھی۔ میں گھر میں تنہا تھا اور اس وقت بھی زوردار بوندا باندی ہو رہی تھی جب وہ لڑکی میرے آنگن کے کنویں سے پانی لینے کے لیے آئی تھی۔‘‘

جمیلہ نے اپنا ہاتھ نوشاد کے کاندھے سے نیچے اتار لیا جسے وہ محسوس نہ کر سکا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

’’پانی لینے کے لئے وہ تو روز ہی آتی تھی۔ لیکن اس دن گھر کے سناٹے کو سیاہ بادلوں نے زیادہ گہرا کر دیا تھا۔ وہ لڑکی پانی میں بھیگ گئی تھی۔ اس کے کپڑے جسم سے چپک گئے تھے اور سائیں سائیں کرتی پر اسرار ہواؤں کے طوفانی جھکڑ اور اس کے بھیگے بدن کی دھیمی دھیمی آنچ نے میری رگوں میں چنگاریاں بھر دی تھیں۔‘‘ جمیلہ اس سے آگے نہ سن سکی۔ اس کو اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ آنکھوں کے چراغ کی لویں مدھم ہو گئیں۔ عقل اور دل کے درمیان ایک جنگ سی چھڑ گئی۔ بڑی دیر تک وہ اس ہنگامی فضا میں معلق رہی۔ بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ نوشاد کا اس طرح سب کچھ کہہ دینا اس کے مکمل اعتماد ہی کی تو دلیل ہے۔ اپنی خطا کا برملا اظہار کتنے مرد کیا کرتے ہیں! ؟ میں اسے برا آدمی کیوں سمجھوں؟

اس کی شرافت اور اخلاقی جرأت پر تو مجھے ناز کرنا چاہیے۔ اور پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک سایہ سا ابھر آیا جس کی وحشت ایسی تھی کہ وہ پسینے میں شرابور ہو گئی۔ نوشاد اس کی یہ کیفیت دیکھ کر نروس ہو گیا۔ اسے یوں لگا جیسے شاہراہ عام پر اس نے خود کو بے لباس کر لیا ہو۔ جمیلہ کے دونوں کاندھے پر اس نے پیچھے سے اپنے ہاتھ رکھ دیے لیکن احساس ندامت نے اس کی گرفت مضبوط نہیں ہونے دی۔ شرمسار لہجے میں بولا ’’مجھے معاف کر دو جمیلہ! میں بے حد شرمندہ ہوں۔ ضمیر کے اس بوجھ کو آخر کب تک ڈھوتا پھرتا۔؟‘‘

نوشاد کی اس بات نے گویا ساز کے خاموش تاروں کو چھیڑ دیا۔ وہ اس کے سینے سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کچھ دیر کے بعد جب پُرسکون ہو گئی تو اس نے دوپٹے سے آنسو پونچھے۔ بولی ’’نوشاد تم نے تو اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا۔ مگر تمہیں خبر نہیں کہ ایک بوجھ میرے دل پر بھی ہے جسے اب میں نہیں اٹھا پاؤں گی۔ آج اعتماد کی بازی جیت کر میں شرافت کی بازی ہارنا نہیں چاہتی!‘‘

’’اس شہر میں منتقل ہونے سے پہلے ہم جہاں تھے۔ یعنی جس محلے میں رہتے تھے، وہاں ایک لڑکا تھا آوارہ اور بدمعاش! لیکن محلہ والوں کو اس سے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ اس لیے کوئی اس کا مخالف بھی نہیں تھا۔ لیکن وہ اتنا نیچ ثابت ہوگا؟ ایسا کسی نے سوچا بھی نہیں تھا!

ایک دن شام کا دھندلکا چھایا تھا۔ محلے میں ایک بڑی تقریب تھی اور میرے گھر کے تمام افراد اس میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ میں گھر میں تنہا چولہے کے پاس بیٹھی روٹیاں بنا رہی تھی۔۔۔

۔باقی جمالیاتی ذوق میں۔

بھرم

یحییٰ یوسفی (راولپنڈی)

2 بجنے کو تھے اور بے پور سٹیشن آنے والا تھا جواد کا دل دھڑک رہا تھا۔ ایک انجانا سا خوف اور اضطرابی کیفیت اس پر طاری تھی۔ اسکے دماغ میں سوچوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ گھنٹیوں نے اسکے سوچنے کی طاقت کو ماؤف کر دیا تھا۔ یکا یک ایک جھٹکا لگا۔ جواد کو محسوس ہوا جیسے وہ نیند کے گہرے کنوئیں سے باہر آ گیا ہو۔ وہ سہمے سہمے دروازے تک آیا۔ تو محسوس ہوا کہ ٹرین رک چکی ہے۔ بے پور سٹیشن ایک گاؤں کا چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ نہ بجلی تھی اور نہ ہی کوئی ایک کمرے کے علاوہ دوسرا کمرا تھا۔ لرزتے قدموں سے اسنے اترنے کی کوشش کی۔ جونہی اسنے قدم زمین پر رکھا' ایک عجیب سی آواز آئی۔ پہلے تو وہ سمجھ ہی نہ سکا لیکن دوسرا قدم رکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ سوکھے پتوں کی آواز ہے۔ گاڑی نے فضا کو چیرتے ہوئے سیٹی بجائی اور آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹرین نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ جواد اندھیرے میں اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ جب اسکی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئیں تو اسے کچھ دکھائی دیا۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ صبح ہونے سے پہلے وہ اپنے گاؤں نہیں جا سکے گا۔ نجانے کیوں اسکے قدم سٹیشن ماسٹر کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ شاید پتوں کی چرمراہٹ کی وجہ سے سٹیشن ماسٹر آنے والے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اور اپنی سرخ و سبز لالٹین کو اپنے چہرے کے سامنے کرتے ہوئے جواد کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ جواد آہستہ آہستہ سٹیشن ماسٹر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور سٹیشن ماسٹر جواد کی طرف دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ آغازِ گفتگو سٹیشن ماسٹر نے ان الفاظ سے کیا۔ ''بیٹا اجنبی ہو؟ اسی لیے پسنجر ٹرین سے آئے ہو؟ یہاں کے ہوتے تو کبھی اس ٹرین سے نہ آتے۔

یہ جملہ جواد کو آج سے بیس سال پیچھے لے گیا۔ اسی سٹیشن پر عاصی اور جواد اکٹھے آیا کرتے تھے۔ عاصی جواد کو پیار سے ''جوجو'' کہا کرتی تھی اور جواد عاصمہ کو عاصی پکارتا تھا۔ جون کے مہینے میں جب سخت گرمی پڑتی تھی۔ اکثر جوجو اور عاصی دونوں اپنے اپنے گھروں سے پیدل چل کر سٹیشن پر آ جاتے اور بیٹھ کر گھنٹوں گاڑیوں کو آتے جاتے دیکھتے رہتے۔ ''جوجو تمھارے پاس کوئی پیسہ ہے؟ عاصی نے پوچھا۔ جوجو نے فوراً اپنی ساری جیبیں دیکھ ڈالیں۔ لیکن ان میں سے کوئی پیسہ نہ نکلا۔ جوجو پریشان تھا کہ عاصی نے پیسہ مانگا اور اسکے پاس پیسہ نہیں ہے۔ اسکے چہرے پر آبِ ندامت آ گیا۔ عاصی جوجو کی اس حالت سے بے نیاز ریل کی پٹڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جوجو گھبرائی ہوئی حالت میں عاصی کو دیکھ رہا تھا۔ عاصی کی عمر تقریباً 9 یا 10 سال کی ہوگی۔ رنگ گورا بال لمبے گہرے سیاہ تھے۔ اسکے گورے گالوں پر سیاہ بال اسطرح تھے کہ جیسے کوئی سانپ اپنی بلا پر کونڈ مارے بیٹھا ہو۔ ''جوجو'' عاصی نے قدرے زور سے کہا۔ جوجو چونک گیا۔ ''کیا ہے؟'' ''میں نے تم سے پوچھا ہے کہ کوئی پیسہ ہے؟'' ''نہیں' عاصی کیا کرنا ہے؟'' جوجو نے پوچھا۔ ''ریل کی پٹڑی پر رکھ کر بڑا کروں گی''۔ عاصی نے کہا۔'' کل لے آؤں گا '' جوجو نے کہا۔ یہ سوچ کر عاصی گھبرا گئی اور کہنے لگی' جوجو آج بھی بابا جانی غصہ ہو رہے تھے کہ میں تمھارے ساتھ نہ کھیلا کروں'' ''کیوں؟'' جوجو نے پوچھا ''اسلیئے کہ میں لڑکی ہوں' وہ کہتے ہیں کہ تم لڑکے ہو۔ اور لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ نہیں کھیلتیں''۔ عاصی نے بھولے پن سے جواب دیا۔ جوجو پہلے ہی کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ اور پریشان ہو گیا۔ عاصی تم کیا کہتی ہو''۔ اسنے مسکرا کر کہا' ''میں تو تمھارے سوا کسی کے ساتھ کھیلتی ہی نہیں کیونکہ تم مجھے اچھے لگتے ہو''۔ ان دونوں کا پیار اتنا سچا اور صاف تھا جیسے آبِ نساں۔ جواد عاصمہ کی پھوپھی کا بیٹا تھا۔ اچھے خاصے زمیندار تھے۔ جواد کے والد کا انتقال بہت پہلے ہو گیا تھا۔ عاصمہ کے والد پڑھے لکھے تھے۔ وہ حیوانات کے ڈاکٹر تھے۔ اعلیٰ تعلیم انھوں نے لندن سے حاصل کی تھی۔ اسکے پاس خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ اسی لیے انھیں کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ صرف اپنی بچی کی تعلیم کی وجہ سے پریشان رہتے تھے۔ عاصمہ چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی۔ انکو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ چھٹی کے بعد عاصمہ کو شہر بھیجنا پڑے گا۔ شہر میں ویسے تو اسکے بہت سے جاننے والے تھے۔ لیکن وہ عاصمہ کو کسی ذمہ دار آدمی کے پاس بھیجنا چاہتے تھے۔ ساتھ میں انھیں جواد کی بھی فکر تھی۔ جواد کو بھی کسی اچھے سکول میں پڑھانا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے۔ اکی بہن کا لڑکا کسی سے تعلیم میں کم رہ جائے اور لوگ کہیں کہ بن باپ کے بچے کو ماموں نے تعلیم بھی نہ دلوائی۔ ویسے بھی جواد ان کو دل و جان سے عزیز تھا۔ بسا اوقات وہ عاصمہ کو یہ ضرور کہتے تھے کہ'' بیٹا تم لڑکی ہو اور وہ لڑکا''۔ لیکن انکا یہ نظریہ بالکل نہیں تھا کہ پھول کو خوشبو سے جدا کر دیا جائے وہ کب چاہتے تھے کہ اسکے خاندان کا آخری دیا بجھ جائے۔

''جوجو!'' عاصی نے جواد کا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

جواد نہ جانے کن خیالوں میں گم تھا۔ ایکدم چونک کر بولا' ''کیا ہے؟ عاصی!''

''چلو گھر چلیں'' عاصمہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''چلو'' جواد بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں لہلہاتے کھیتوں کی پگڈنڈیوں میں سے بھاگتے ہوئے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ کھیتوں کی پگڈنڈیاں ایسے معلوم ہو رہی تھیں جیسے دلوالوں کے قدموں کو بوسہ دے رہی ہوں۔ کھیت جھوم جھوم کر معصوم متوالوں کو اپنے سر جھکا جھکا کر سلام پیش کر رہے تھے۔ جونہی دونوں حویلی کے دروازے پر پہنچے۔ جواد نے کہا' ''عاصی پہلے تم اندر جاؤ ماما مجھے دیکھیں گے تو غصہ ہونگے''۔ نہیں

پہلے میں نہیں جاؤں گی۔تم پہلے جاؤ۔میں کہوں گی کہ میں پھوپھی کے پاس تھی''۔ عاصمہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ابھی یہ دونوں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ایک گرجدار مگر شفیق باپ کی آواز آئی۔''دونوں اندر آ جاؤ''۔''اف خدا یا! بابا جانی'' عاصمہ نے گھبراتے ہوئے کہا۔''ہاں'' جواد نے ہاں میں ہاں ملائی۔دونوں سر جھکائے اندر چلے گئے۔کمرے میں قدم رکھتے ہی دونوں ششدر رہ گئے۔سامنے پلنگ پر جواد کی امی بھی بیٹھیں تھیں۔'' آؤ بیٹی عاصمہ آؤ'' جواد کی امی نے ممتا بھرے لہجے میں کہا اور عاصمہ کو سینے سے لگالیا۔

''باجی! تمھارے اسی لاڈ پیار نے ان دونوں کو کسی کام کا نہیں چھوڑا۔اب یہ بڑے ہو رہے ہیں۔ہمیں انکے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہیے''۔عاصمہ کے والد نے کہا۔''مستقبل کا کیا سوچنا' اللہ کا دیا سب کچھ تو ہے۔'' جواد کی امی نے بھائی کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔شیراز صاحب اپنی بڑی بہن کا بہت ادب کرتے تھے۔اور انکے سامنے انکی چلتی بھی نہیں تھی۔ایسے موقعوں پر تلملا کر رہ جاتے تھے۔عاصمہ ننھی بچی کی طرح پھوپھی کی گود میں گھسی ہوئی تھی۔وہ اسکے سر پر ہاتھ پھیرتی جا رہی تھیں۔ساتھ ہی ساتھ سمجھا رہی تھیں۔'' بیٹی! تم اب بڑی ہو رہی ہو۔تمھیں یہ کیسا شوق ہے کہ تم ریل کی پٹڑی پر چیزیں رکھدیتی ہو۔اور پھر جب وہ پچک جاتی ہیں۔تو ان کو سنبھال لیتی ہو''۔

''پھوپھو مجھے یہ سب بہت اچھا لگتا ہے''۔عاصمہ نے جواب دیا۔

'' ہاں پھوپھو! میں آپکو ایک چیز دکھاتی ہوں'' یہ کہتے ہوئے عاصمہ اٹھکر الماری میں سے کچھ نکالنے لگی۔اور جب مطلوبہ چیز مل گئی۔تو اسکو اپنی مٹھی میں بند کر کے پھوپھی کے پاس لائی۔''پھوپھی! دیکھیں یہ کیا ہے''۔عاصمہ نے پوچھا۔جواد کی امی نے غور سے دیکھا۔اور سمجھ گئیں۔مسکرا کر کہنے لگیں بیٹی! میں اسی دن سمجھ گئی تھی جب جواد کے کوٹ کے بٹن نہیں تھے۔اور جواد نے کہا تھا کہ بٹن کھیلتے ہوئے ٹوٹ گئے''۔وہ لوگ ابھی باتیں کر رہے تھے کہ نوکر نے آکر دھما کہ کر دیا۔صاحب جی! شہر سے منان صاحب تشریف لائے ہیں۔''چلو'' ڈاکٹر شیراز نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔''آؤ بیٹھ جاؤ'' کیا بہن نجمہ بھی یہیں ہیں''۔ہاں یار! انکو میں نے زنان خانے میں بھیج دیا ہے۔اچھا یہ بتاؤ لندن سے آئے ہوئے تمھیں 2 ماہ ہو گئے ہیں۔لیکن میرے پاس اب آئے ہو۔'' شیراز نے گلہ کیا۔''بس یار۔لوگوں سے ملنے ملانے میں وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔منان بولے۔

نوکر نے چائے میز پر رکھی۔خوب باتیں ہوئیں پرانے تذکرے نئی باتیں سب کچھ ہوا۔اچھا شیراز اب یہ بتاؤ کہ ہماری بیٹی کو کب ہمارے ساتھ بھیج رہے ہو۔تم نے جو کچھ لکھا تھا وہ میں سب تیار کروالایا ہوں۔اپنے پاسپورٹ میں بیٹی عاصمہ کو درج بھی کرا لیا ہے۔اور ویزہ بھی لگ گیا ہے''۔ڈاکٹر منان نے یہ جملہ ایک سانس میں کہہ ڈالا۔چوہدری شیراز کا دل یہ جملہ سن کر حلق میں آ گیا۔''کیا کہا تم نے؟'' ہاں یار تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔جب میں یہاں سے جا رہا تھا تو میری بیٹی کا کوئی آسرا نہیں تھا۔اسکی ماں مر چکی تھی اور میں لندن دوسری شادی کے چکر میں تھا۔لیکن خدا کی مرضی کے آگے کس کی چلتی ہے۔میری دوسری بیوی سے کوئی بچہ نہیں ہوا اور سات سال ہو گئے ہیں۔ڈاکٹروں کے مطابق بچہ ہونے کی کوئی امید بھی نہیں۔اسی لئے میں اپنی بیٹی کو لینے آیا ہوں''۔شیراز کو سکتا سا ہو گیا تھا۔عاصمہ بھی مہمان خانے سے آنے والی آوازیں سن چکی تھی۔تمام کی تمام سکوں کی پلیٹ چھن سے ٹوٹ گئی۔شیراز لڑکھڑاتے ہوئے عاصمہ کی طرف لپکا۔

''بیٹی! تمھارے انکل ڈاکٹر منان تمھیں تعلیم کے لیے لندن لے جانا چاہتے ہیں'' شیراز کی آواز یہ کہتے ہوئے اسکا ساتھ چھوڑ گئی۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ عاصمہ کو معلوم ہو کہ یہ منان کی بیٹی ہے۔'اف خدا یا! یہ لفظ سننے سے پہلے میں مر کیوں نہ گئی'' عاصمہ دل میں کہہ رہی تھی۔لیکن وہ اپنے بابا جانی کو دکھ نہیں دینا چاہتی تھی اسلئے اپنے آپ پر قابو رکھتے ہوئے خاموش کھڑی رہی۔اسنے محسوس ہی نہ ہونے دیا۔کہ اسنے وہ سب کچھ سن لیا ہے۔جو اسکے بابا جانی نے نو سال سے چھپایا ہوا تھا۔وہ تو اب جواد کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ کیا جو جو اور میں الگ الگ ہو جائیں گے۔کیا اب میں ریل کی پٹڑی پر کبھی نہ جا سکوں گی۔کیا میں کبھی ریل کی پٹڑی پر سکے نہ رکھ سکوں گی۔کیا یہ کھیت' یہ پگڈنڈیاں مجھ سے روٹھ جائیں گے۔عاصمہ نے فوراً دل میں فیصلہ کیا کہ وہ جوجو کو کبھی بھی نہ بتائے گی کہ وہ اسکے ماموں کی بیٹی نہیں ہے اور نہ ہی بابا جانی کو بتائے گی کہ اسنے سب کچھ سن لیا ہے۔اسنے چپ سادھ کر اللہ کی رضا کو قبول کر لیا۔جواد کو جب پتہ چلا کہ اسکی عاصی لندن تعلیم حاصل کرنے کے لیے جا رہی ہے تو وہ دیوانہ وار عاصی کو حویلی میں ڈھونڈنے لگا۔لیکن عاصی کا کہیں پتہ نہ چلا۔وہ تھک گیا۔یکا یک اسے خیال آیا کہ وہ کہاں ہو سکتی ہے۔وہ بھاگتا بھاگتا ریل کی پٹڑی کے پاس برگد کے پیڑ کے نیچے پہنچا۔وہاں عاصی کو بیٹھے دیکھا۔جو ایک بت کی طرح بیٹھی تھی۔چند سکے اسنے ریل کی پٹڑی پر رکھے ہوئے تھے۔اسکی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ایسا معلوم ہوتا تھا۔جیسے پتھرائی گئی ہوں۔''عاصی!'' جوجو زور زور سے چلا رہا تھا۔لیکن عاصی کیسے سن سکتی تھی۔ریل ٹھکا ٹھک ٹھکا ٹھک دھول اڑاتی ہوئی گزر رہی تھی۔جونہی ریل گزری جواد نے چیخ کر عاصی کہا۔عاصی نے اداس نگاہوں سے جواد کو دیکھا اور ریل کی پٹڑی کی طرف چل پڑی۔آہستہ آہستہ ریل کی پٹڑی پر پہنچ کر اسنے چند سکے جو پچک گئے تھے۔جواد کے ہاتھوں میں تھما دیے۔اور بھراتے ہوئے لہجے میں کہا۔''جوجو! یہ میری نشانی ہے اسکو سنبھال کر رکھنا۔میں ضرور آؤنگی مجھے یہ نظارہ بہت اچھا لگتا ہے۔تم ہمیشہ یہ سکے اپنے پاس رکھنا''۔

جوجو دل ہی دل میں رو رہا تھا۔اسکا دل پھٹا جا رہا تھا۔اسنے بھی دل

میں فیصلہ کرلیا تھا کہ عاصمی اگر تم اس گاؤں میں نہیں رہوگی تو میں بھی یہاں نہیں رہوں گا۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔اور یہی ہوا۔عاصمی کے جاتے ہی وہ اسٹیشن سے ہی غائب ہوگیا۔پھر اسکو گاؤں میں کسی نے نہ دیکھا۔وہ آرمی میں بھرتی ہوگیا۔اسکا بچپن بہت پیچھے رہ گیا تھا۔وہ اب بہت خوبصورت میجر جواد چوہدری ہوگیا تھا۔ یہ تو ایک کرشمہ ہی تھا کہ میجر جواد شتوں میں مشغول تھا۔اسکے جسم پر کیموفلیج ہوا تھا۔وہ جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔کہ ایک آدمی سامنے سے نظر آیا۔ جواد نے اسے غور سے دیکھا۔وقت کی دھول نے اسکو کتنی جلد بوڑھا کردیا تھا۔وہ بمشکل انہیں پہچان سکا۔ یہ تو ماما جانی ہیں اف خدایا! کیا حال ہوگیا ہے انکا۔لپک کر جواد نے ماما کو پکڑا۔''ماما جانی! میں آپکا جواد'' ''کون ہو بیٹا؟''شیراز نے غور سے دیکھ کر پوچھا۔شاید انکی بینائی اور سماعت دونوں ہی کم ہوگئی تھیں۔''ماما! میں آپکا جواد'' جواد نے قدرے چیختے ہوئے کہا اور لپٹ گیا۔اسکے آنسو عاصمی کی یاد میں بہہ بہہ کر خشک ہوگئے تھے۔وہ اب رونا بھی بھول چکا تھا۔جواد عاصمی کے بارے میں پوچھنے کے لیے بے چین تھا۔وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ماما! تم نے ہی تو عاصمی کو مجھ سے چھینا ہے۔اسے کیا معلوم تھا کہ قدرت نے دونوں سے ہی عاصمی کو چھین لیا تھا۔جواد سے رہا نہ گیا اور آخر کار پوچھ ہی لیا ''ماما جانی! عاصمی کا کوئی پتہ وغیرہ۔اسکا کوئی خط وغیرہ آیا؟''

''ہاں بیٹا ! کیوں نہیں تم سب کو بھول گئے وہ تو نہیں بھولی۔اسکے تو بہت سے خط آئے۔اور ہاں یہ تو میں بتانا ہی بھول گیا کہ میں اسی سے مل کر آرہا ہوں۔وہ شہر میں آگئی ہے اب تو وہ بھی لیڈی ڈاکٹر عاصمہ ایف۔آر سی۔پی لندن بن گئی ہے۔چلو بیٹا! میرے ساتھ میں تمھیں اس سے ملاؤں گا۔شیراز نے سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔ جواد جسکا دل یہ لفظ سننے کے لیے بیس سال سے ترس رہا تھا۔زور سے اچھلنے لگا۔نہ جانے دل ہی دل میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ماما نے کہا''بیٹا! جلدی کرو میں تمھیں اسکے پاس لئے چلتا ہوں۔نہیں ماما جانی! میں اس سے جہاں بچھڑا تھا'وہیں ملوں گا۔اور ابھی میں نے چھٹی بھی لینی ہے۔'' جواد نے کہا۔اسکو یقین نہیں آرہا تھا کہ اسکی عاصمی آگئی ہے۔آج اسکی زندگی کا بہت اہم دن تھا۔اسکے دل میں طرح طرح کے خیال آرہے تھے کہ عاصمی کیسی ہوگی۔مجھے پہچان لے گی کہ نہیں۔اب ہم دونوں ہوگئے۔ابھی وہ انہی خیالوں میں تھا کہ ماما نے کہا''بیٹا! تم چھٹی وغیرہ لے لو یہ خوشخبری میں عاصمہ کو دیتا ہوں۔چوہدری شیراز کی چال میں تیزی آگئی۔وہ جواد کو پیار کرکے چلے بھی گئے۔جواد وہیں اپنی عاصمی کے خیالوں میں گم کھڑا تھا کہ ایک جوان نے آکر کہا''سر! اب کیا حکم ہے؟'' ''ہاں'ہوں! اچھا تم لوگ یہاں ٹھہرو میں آتا ہوں۔'' جواد لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا اپنی جیپ میں سوار ہوکر اپنے کمانڈنگ آفیسر کے پاس پہنچ گیا۔''سر! جواد نے سیلوٹ مارا۔''ہیلو میجر جواد چوہدری! تم کو تو لیلنڈ پر ہونا چاہیے تھا۔تم یہاں کہاں؟'' آفیسر نے کہا۔

''سر! میں نے کبھی چھٹی نہیں مانگی۔نہ کبھی چھٹی کی ہے لیکن آج ایمرجنسی ہے۔'' جواد نے کہا۔''دیکھو میجر! میں مجبور ہوں۔لیکن تمھارا ریکارڈ اچھا ہے۔تم جاسکتے ہو۔'' جواد کو تو جیسے دو جہان مل گئے۔وہ پاگلوں کی طرح اپنے تمام دوستوں سے مل رہا تھا۔اسکی خوشی کی انتہا نہ رہی۔وہ پل بھر میں اپنے گاؤں پہنچنا چاہتا تھا۔ان ہی وادیوں میں جہاں اسکا اور عاصمی کا بچپن گزرا تھا۔وہ چاہتا تھا کہ پلک جھپکتے ہی ان فضاؤں میں پہنچ جائے جہاں اسکی عاصمی کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔اب وہ ایک پل کے لیے یہاں نہیں رہنا چاہتا تھا۔شہر کے سٹیشن پر پہنچ کر اس نے جے پور کا ٹکٹ طلب کیا۔''سر جے پور ٹسنجر ٹرین جائے گی اور یہ تقریباً دو بجے رات کو پہنچے گی۔آپ صبح کی ٹکٹ لے لیں۔وہ تقریباً گیارہ بجے دن آپ کو جے پور سٹیشن پہنچادے گی۔''نہیں نہیں!'' بے ساختہ جواد کے منہ سے نکلا۔''میں کل کیسے جاسکتا ہوں۔میں اپنی عاصمی سے پہلے پہنچنا چاہتا ہوں۔میں اسکو وہاں ویلکم کروں گا''۔

جواد منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔بکنگ کلرک نے جواد کے ہاتھ میں ٹکٹ تھمادیا۔''ارے بھائی! کیا سوچ رہے ہو۔یہاں ہی کھڑے رہوگے یا کمرے میں بھی چلوگے''بوڑھے سٹیشن ماسٹر نے طویل سکتے کو توڑا۔جواد جو اپنے بیتے دن یاد کررہا تھا۔بولا''چلو چلو اندر چلتے ہیں''سٹیشن ماسٹر اور جواد اندر آکر بیٹھ گئے اور باتوں باتوں میں دن نکل آیا۔سٹیشن ماسٹر نے جواد سے کہا ''بیٹا! اب تم گاؤں جاسکتے ہو۔راستہ صاف دکھائی دے رہا ہے''۔ ''نہیں ماسٹر جی! میں اب یہاں ہی انتظار کروں گا''۔جواد نے کہا۔''کس کا انتظار کروگے بیٹا''سٹیشن ماسٹر نے کہا۔

''ماسٹر جی! اپنی عاصمی کا'' جواد نے جواب دیا۔''اپنی عاصمی'' سٹیشن ماسٹر نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔''جی ہاں! ماسٹر جی''۔''یہ وہ عاصمی تو نہیں چوہدری شیراز کی بیٹی جو لندن پڑھنے گئی ہوئی تھی۔میں نے سنا ہے کہ اب وہ ڈاکٹر بن گئی ہے اور آج گیارہ بجے والی ٹرین سے آرہی ہے۔چوہدری صاحب نے بتایا تھا''۔

''جی ماسٹر جی! وہی تو میری کل کائنات ہے'' ''ارے بیٹا! تم نے تو یہ بتایا ہی نہیں کہ تم کون ہو؟''سٹیشن ماسٹر نے پوچھا۔''ماسٹر جی! میں چوہدری صاحب کا''ابھی جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ سٹیشن ماسٹر نے اسکی بات کاٹتے ہوئے کہا' ''تم جواد تو نہیں جو گم ہوگئے تھے''۔''ہاں ہاں ماسٹر جی! میں ہی جواد ہوں'' ''تم اتنا عرصہ کہاں رہے؟''سٹیشن ماسٹر نے پوچھا۔''یہ ایک لمبی داستان ہے۔پھر کبھی فرصت میں بتاؤں گا''۔''ہاں بھئی تم دونوں کا تو پیار ہی بہت تھا۔اور اسکو تو جیسے جنون کی حد تک ریل گاڑی کو دیکھنے اور اسکے نیچے پیسے رکھنے کا شوق تھا۔'' ماسٹر کی بات سے جواد پریشان ہوگیا اور اپنی جیبیں دیکھنے لگا۔

''اف خدایا! یہ کیا ہوا جن سکوں کو اسنے بیس سال سے سنبھال کر رکھا

ہوا تھا وہ وہیں بھول آیا تھا۔ یہ کیا ہوا ماصی کیا کہے گی کہ میری نشانی بھی سنبھال کر نہ رکھی۔ میں اس سے معافی کیسے مانگوں گا۔ اگر اسنے سکوں کے بارے میں پوچھا تو کیا جواب دونگا۔ کیا کروں کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ماصی کے آنے سے پہلے وہ جو ٹیچ بنگ والے نے دی ہے انکو اسی جگہ جہاں بچپن میں ماصی اور وہ رکھا کرتے تھے رکھوں گا۔ اور خود اسی جگہ یعنی برگد کے پیڑ کے پاس کھڑا ہو جاؤں گا۔ دیکھتا ہوں کہ ماصی مجھے پہچانتی ہے یا نہیں۔ اس خیال کے آتے ہی جواد اٹھا اور قدم بڑھاتا ہوا ریلوے لائن کے دوسری طرف سٹیشن سے ذرا دور سکے رکھنے لگا۔ اسنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سکے رکھنے شروع کیے وہ سکے میں اپنی ماصی کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو جوجو! میں آ رہی ہوں۔ جوجو! تم نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ تم نے میری نشانی کو بھی سنبھال کر نہ رکھا۔ جوجو! تم خود غرض انسان ہو۔ تم اپنی دنیا میں اتنے مگن ہو گئے تھے کہ تم اپنی ماصی کو بھول گئے اور اسکی نشانی بھی بھول آئے۔ جواد نے تمام سکے پٹڑی پر رکھ دیے۔ اور خود برگد کے پیڑ کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا اور اپنی ماصی کے خیالوں میں معافی مانگتا رہا۔ وقت گزرتا گیا اور ٹرین آہستہ آہستہ سٹیشن پر رک گئی۔ جواد کا دل دھڑک رہا تھا زور سے۔ کبھی آنکھیں کھولتا تو کبھی بند کر دیتا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ٹرین آ گئی ہے۔ ادھر ماصی کا دل بھی دھڑک رہا تھا۔ اسکا جوجو کیسا ہو گیا ہوگا۔ میں اسے خود پہچان پاؤں گی یا نہیں۔ بلکہ میں خود اسے پہچانوں گی کسی سے نہ پوچھوں گی۔ کہ میرا جوجو کہاں ہے۔ وہ مجھے پہچانے گا اور میں اسکو۔ اف کتنا لمبا عرصہ ہم نے ایکدوسرے سے دور گزارا ہے۔ ٹرین رکی۔ دھڑکتے دل لرزتے قدموں سے ماصی نیچے اتری۔ اسکی نگاہیں اپنے جوجو کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ جوجو صرف اسکا جوجو۔ بچپن کا ساتھی اسکا دوست اسکا ہمدرد اسکا پیار کہاں ہے۔ اتنے میں اسکی نظر دور برگد کے پیڑ پر پڑی جہاں ایک لمبا تڑنگا آدمی نظر آیا۔ غیر ارادی طور پر ماصی کے قدم اسطرف بڑھنے لگے۔ ٹرین جا چکی تھی۔ ارے بیٹا! کہاں جا رہی ہو؟۔ ملازم نے کہا۔ ’’جانے دو بخشو جانے دو۔ ایک عرصہ کے بعد وہ اپنے جوجو سے مل رہی ہے۔ اسکا جوجو۔ تم سامان اٹھاؤ۔ اور دیکھو باہر کوئی سواری لیکر پہنچا ہے یا نہیں۔‘‘ شیراز نے کہا۔ ماصی خراماں خراماں جا رہی تھی۔ اسنے آتشی گلابی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ اس ساڑھی میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اسکی نظریں جوجو پر تھیں۔ جوجو کی نظر ماصی کی طرف تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ماصی چلتے چلتے ریلوے لائن پر پہنچ کر حیران رہ گئی کہ جوجو نے پٹڑی پر سکے رکھے ہوئے ہیں۔ وہ سکوں پر جھکی۔ ایک سکہ اٹھاتی اور اپنے بچپن کو یاد کرتی جاتی۔ اسکی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب تھا۔ کیا جوجو مجھے بھول تو نہیں گیا۔ میں تو اسے بے وفا ہی سمجھتی رہی۔ وہ ان سکوں میں اتنی گم ہو گئی۔ کہ اسکو خیال ہی نہ رہا کہ ٹرین اس کے سر پر آ گئی ہے۔ ’’ماصی ماصی ادھر ٹرین ٹرین‘‘ جواد بے تحاشہ بھاگ رہا تھا۔

لیکن اسکی آواز ٹرین کی آواز میں دب گئی تھی۔ وہ فوجی تھا اس نے ایک جمپ لگائی۔ اور ماصی کو پرے دھکیل دیا۔ ماصی دم بخود زمین پر پڑی ہوئی ٹرین کو جاتے دیکھ رہی تھی۔ ٹرین جا چکی تھی۔ ماصی کی نظریں اسی طرف تھیں۔ کہ اسے محسوس ہوا کہ کوئی کہہ رہا ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو اسکی چیخ نکل گئی۔ جوجو بری طرح زخمی تھا۔ وہ لپک کر جوجو کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جوجو جو زندگی کی قید سے دور جا رہا تھا۔ اپنی ماصی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ دیر زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اسکی آنکھوں میں خون کے قطرے تھے۔ اپنی ماصی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ ’’ماصی! میں نے تو وفا کی لیکن زندگی مجھے وفا کرتی نظر نہیں آ رہی ہے۔ خاموش نگاہیں ماصی سے اسکے بیتے دنوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ ماصی ایک بت کی مانند اپنے بچپن کے ساتھی کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسکی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آیا۔ جب جوجو نے لرزتے ہاتھوں سے چند سکے ماصی کی طرف بڑھائے۔ ماصی نے وہ سکے اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی لیکن جواد کا ہاتھ یکلخت زمین پر گر گیا اور اسکے ہاتھ سے سکے چھوٹ کر زمین پر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ ماصی ان سکوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے ان سکوں میں جوجو کی جان ہو۔ جوجو ان سکوں کو اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماصی نے چیخ کر کہا’’ جوجو بیٹا! چھوڑ دو۔ نہ کرو۔ اور دوڑ کر ننھے جوجو کو گلے سے لگا کر خوب پیار کرنے لگی۔

☆ ☆ ☆

’’چہارسو‘‘

چہارسو میں یہی کشف ہے یہی ہے بھید
کہ اِس کے بیچ ہے گلزارِ آتشِ جاوید

اِسی کے بیچ ہے رندان و صوفیا کا ہجوم
چہارسو اِسی گلزار کی مچی ہے دھوم

نہ شرق و غرب نہ ہیں ماسوا شمال و جنوب
چہارسو یہ خدائی ہے ایک ہے مجذوب

اُفق کے پار بھی اُردو کے عاشقوں کے سبب
چہارسو تری سجنے لگی ہے بزمِ ادب

بقایا عمر کا یہ آج روزِ اوّل ہے
چہارسو یہ کہاوت مری مثل ہے

صفوت علی صفوت (نیویارک)

مشرقی لڑکی

ڈاکٹر رینو بہل (چنڈی گڑھ۔ بھارت)

جس روز سے وہ خط انھیں ملا تھا ان کی خوشیوں کو شک کا گرہن لگ گیا تھا۔ شادی کی تیاریاں زوروں سے چل رہی تھیں۔ کارڈ چھپ کر تیار ہو گئے تھے اور یہ خط بم کی طرح پھٹا تھا۔ اس بے نام خط کو محض کسی کی شرارت سمجھ کر نظر انداز بھی تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خط ارجن کے نام تھا جس کی تحریر اس طرح تھی۔

ارجن صاحب،

آپ مجھے نہیں جانتے مگر میں آپ کے بارے سب کچھ جانتا ہوں۔ آپ کی اور رشمی کی سگائی کی خبر ملی تو آپ پر ترس آ گیا۔ بہت غور و فکر کے بعد میں نے یہ اپنا فرض سمجھا کہ آپ کو آگاہ کردوں کہ جس لڑکی کو آپ اپنی شریک حیات بنانا چاہتے ہیں وہ پہلے بھی کئی لڑکوں کے دلوں سے کھیل چکی ہے۔ اس کی خوبصورتی اور سادگی کے کئی لڑکے شکار ہو چکے ہیں۔ میں نے تو یہ تک سنا ہے کہ وہ وکرم نام کے لڑکے کے ساتھ مندر میں چوری چھپے شادی بھی کرا چکی ہے جس سے وہ اب بھی آپ سے سگائی ہونے کے بعد بھی ملتی ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو آس پاس کے لوگوں سے پوچھئے یا خود اسی سے پوچھ لیجئے۔ میں نے تو ایک شریف انسان کو بچانے کے لئے یہ خط لکھا ہے۔ یقین آئے تو ٹھیک نہ آئے تو آپ کی قسمت۔ زندگی آپ کی ہے فیصلہ بھی آپ کو ہی کرنا ہے۔

آپ کا خیر اندیش''

نیچے کوئی نام نہ تھا۔ خط لکھنے والے کا مقصد تو صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ شادی تڑوانا چاہتا ہے مگر اس بات میں کتنی سچائی اور کتنا جھوٹ ہے یہ معلوم کرنا بہت ضروری تھا۔ اس کا دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ رشمی بدکار ہو سکتی ہے اتنی سادہ اور معصوم لڑکی دھوکے باز نہیں ہو سکتی۔

پہلی بار اس نے رشمی کو اپنے دوست کی بہن کی شادی میں دیکھا تھا۔ دلہن کی خاص سہیلی۔ سلک کی شلوار قمیض اور ریشمی دوپٹہ۔ کانوں میں جھولتے جھمکے' ماتھے پر چھوٹی سی بندیا' کلائیوں میں کھنکتی چوڑیاں اور کمر تک جھولتی چوٹی۔ اسے دیکھتے ہی وہ اسے دل دے بیٹھا۔ اسے ایسی لڑکی کی ہی تلاش تھی جو خالص ہندوستانی ہو سادگی اور خوبصورتی کا سنگم۔ مغربی فیشن کی زد میں آئی لڑکیوں کو دیکھ دیکھ کر وہ اکتا چکا تھا۔ پوری شادی میں وہ اس کی نگاہوں کا مرکز ہی رہی۔ موقعہ ملتے ہی اس نے اسے اپنے موبائل میں قید کر لیا اور اپنے دوست سے اس کا اتا پتا بھی معلوم کر لیا۔ گھر جاتے ہی ماں کے ہاتھ میں پتا تھما دیا۔

''خوش ہو جاؤ تمہارا کام آسان کر دیا ماں۔''

''کوئی مل گئی کیا''؟

''پسند تو آئی ہے آگے آپ تسلی کر لیں ''۔

'' کیسی ہے''؟

'' فوٹو دکھا سکتا ہوں ''۔

''بات اتنی آگے بڑھ گئی''۔

''بات تو ہوئی ہی نہیں۔ یہ تو شادی کی گہما گہمی کا فائدہ اٹھا لیا میں نے۔ اس نے موبائل سے ماں کو فوٹو دکھاتے ہوئے کہا:

''دیکھنے میں تو اچھی لگ رہی ہے۔ آگے پتا نہیں۔
تجھے پسند ہے تو ہمیں بھی پسند ہے۔ شکر ہے تجھے بھی
کوئی لڑکی پسند آئی۔ کل ہی تیرے پاپا سب معلوم
کر لیں گے۔ بس ایک بار بات بن گئی تو چٹ منگنی
پٹ بیاہ''۔

واہی صاحب کا اچھا خاصا کاروبار ہے۔ ان کا خاندان علم کی دولت سے بھی مالا مال ہے۔ ان کا بڑا بیٹا ارجن لندن سے بزنس مینجمنٹ کی ڈگری حاصل کر کے آیا تھا۔ آتے ہی اپنے پاپا کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگا۔ ویسے تو اس کی دوستی بہت سی لڑکیوں سے تھی ان کے ساتھ گھومتا تھا پارٹیوں میں جاتا تھا مگر شادی وہ ایسی لڑکی سے کرنا چاہتا تھا جو پہناوے اور تہذیب سے بھی ہندوستانی ہو۔ کئی اچھے اچھے گھروں سے رشتے آئے مگر اسے کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آئی۔ ہار مان کر ماں باپ نے فیصلہ اس پر ہی چھوڑ دیا۔

رشمی کے لئے جب واہی صاحب کے گھر سے رشتہ آیا تو خود کو انھوں نے دنیا کا سب سے خوش نصیب سمجھا۔ انکار کرنے کی کوئی وجہ ہی نہ تھی۔ قسمت کہاں بار بار دستک دیتی ہے۔ ٹھاپر صاحب بنک میں ملازم تھے اپنی بیٹی کے لئے اتنا اچھا رشتہ پا کر پھولے نہ سمائے بیٹی سے اس کی مرضی جاننا ضروری نہ سمجھا اور بہت ہی سادگی سے یہ رشتہ پکا ہو گیا۔

واہی صاحب نے جب خط پڑھا تو انھیں اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ٹھاپر صاحب کے پریوار کے بارے میں انھیں جو معلومات حاصل ہوئی تھی اس میں کوئی ایسی ویسی بات نہ تھی۔ ہو سکتا ہے کوئی یہ رشتہ تڑوا کر ٹھاپر صاحب سے دشمنی نکالنا چاہتا ہو پھر بھی بات کی تہہ تک تو پہنچنا ہی چاہیے۔ یہ سوچ کر انھوں نے ایک پرائیویٹ ڈیٹکٹیو کو کام پر لگا دیا کہ دو دن میں انھیں پوری رپورٹ چاہیے۔ شادی کا دن نزدیک آ رہا تھا اور وہ کسی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتے تھے۔ دو دن بعد وہ آدمی اپنی رپورٹ لے کر پہنچ گیا۔ اس کے مطابق رشمی کا کسی وکرم نام کے لڑکے سے دو تین سال سے چکر چل رہا ہے اور وہ اب بھی اس سے ملتی ہے۔

''اس کا مطلب ہے اس خط کا ایک ایک حرف سچ تھا''۔ ارجن نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

''اب کیا کرنا ہے''؟ ماں کی آواز میں فکر تھا۔

'' کرنا کیا ہے آنکھوں دیکھی مکھی نگلی تو نہیں جا سکتی ہے واہی صاحب نے کہا

'' لوگ کیا کہیں گے؟ اتنے تھوڑے دن رہ گئے
شادی میں اور آپ سگائی توڑ دیں گے''۔

''لوگوں کی باتوں کی خاطر میں اپنے بیٹے کا مستقبل خراب

نہیں کرسکتا۔تمہارا کیا کہنا ہے ارجن؟''

''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ پہناوے کا سوچ سے بھی گہرا تعلق ہے۔ اگر مغربی سوچ کی ہوتی تو ماں باپ سے بغاوت کر دیتی۔ مشرقی لڑکی ہے چپ چاپ اپنے دل میں اپنی محبت کو دفن کر کے ڈولی میں بیٹھ جائے گی۔ مگر پاپا مجھے ایسی جیون سنگنی نہیں چاہیے جو دل میں کسی اور کو بسا کر زندگی سے سمجھوتہ کر لے اور ساری عمر اسے ہی فرض سمجھ کر گزار دے۔ میں یہ شادی نہیں کروں گا۔

'اس کا فیصلہ سن کر واہی صاحب نے ٹھاکر صاحب کو فون گھما دیا۔

'' ٹھاکر صاحب مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے''

'' کہیے میں کب حاضر ہو جاؤں''؟

'' نہیں اس کی ضرورت نہیں بات فون پر بھی ہو سکتی ہے''

'' آپ حکم کریں''۔

'' حکم نہیں گزارش ہی سمجھئے۔ آپ کو سب سے پہلے اپنی بیٹی کی خوشی کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس کی خوشی کس میں ہے یہ آپ کو پوچھنا چاہیے''

''واہی صاحب یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا''۔

''آپ اپنی بیٹی کی شادی اسی لڑکے سے کروا دیجئے جس سے وہ آج بھی ملتی ہے۔ ہم یہ شادی توڑ رہے ہیں''۔

''مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے ہم نے تو سب تیاریاں کر لی ہیں''۔

''یہ تو شکر کرو ٹھاکر صاحب وقت پر پتا چل گیا ورنہ انرتھ ہو جاتا۔ بچوں کی خوشی میں ہی سب کی خوشی ہے۔

یہ سنتے ہی ریسیور ٹھاکر صاحب کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور وہ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے دفتر سے شادی کے لئے جو قرض لیا تھا اس میں سے کتنا پیسا تو وہ خرچ چکے تھے چھوٹے دو بچوں کی ذمہ داریاں ابھی سر پر کھڑی تھیں۔ اگر یہ شادی نہ ہوئی تو بدنامی کے ساتھ ساتھ نقصان بھی ہوگا۔ انھوں نے اپنی بیوی سے تفصیل میں بات کی اور اسی کے مشورے پر رشمی کی پسند کو ہاں کہنا پڑا جب کہ وہ اس لڑکے کے رشتے کو ٹھکرا چکے تھے۔

''وکرم کو فون کرواور اسے کہو آج ہی مجھ سے ملے''۔

یہ سنتے ہی وہ خوشی سے جھوم اٹھی اور اپنا کمرا بند کر کے اسے فون کرنے لگی۔

''میں نے کہا تھا نہ شادی کروں گی تو صرف تم سے''۔

'' کیوں زخموں پر نمک چھڑک رہی ہو۔ کتنے تھوڑے دن رہ گئے ہیں تمہاری شادی کو''۔

''تم آج ہی پاپا سے ملنے آ جاؤ۔ وہاں میری سگائی ٹوٹ گئی ہے''۔

''وہ کیسے؟''

''جو کام سیدھی انگلی سے نہ ہو سکا وہ ذرا سی ٹیڑھی کرنے پر ہو گیا۔ تم بس جلدی آ جاؤ۔

ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل گئی۔

بقیہ: حادثۂ غم

خدمت میں حاضر ہے۔ نیویارک میں سالانہ نعتیہ مشاعروں کے بانی اور معروف بزرگ شاعر جناب صلاح الدین ناصر کے مطابق علامہ صاحب تمام عمر درس وتدریس سے منسلک رہے۔ شاعری میں بھی انہیں کمال فن حاصل تھا۔ وہ فن عروض کے استاد تھے۔ غزل کے علاوہ حمد ونعت کہتے تھے اور صنعت غیر منقوطہ میں ید طولی رکھتے تھے۔ عربی اور فارسی زبان وفن پر بھی دسترس تھی۔ محبت وشفقت سے پیش آتے تھے کہ اجنبیت کا احساس ختم ہو جاتا تھا۔ انکی وفات سے اردو ادب ایک مخلص استاد اور عظیم شاعر سے محروم ہو گیا۔ نیویارک کے ایک اور معروف شاعر اور کالمسٹ ڈاکٹر صفوت علی صفوت کے مطابق علامہ صاحب بہت ہی منجھے ہوئے شاعر تھے اور انکو شاعری کی باریکیوں کا نہ صرف علم تھا بلکہ اس پر مکمل عبور بھی تھا۔ میں ذاتی طور پر انہیں اساتذہ میں شمار کرتا ہوں۔ وہ دنیا بھر میں مشہور تھے۔ اپنے فن کے ماہر تھے۔ شفیق انسان تھے۔ وہ غزل کے بہترین شاعر تھے۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ مزاح نگار جناب خالد عرفان کے مطابق علامہ صاحب ایک علم وادب کا چلتا پھرتا خزانہ تھے۔ انکا لہجہ استادانہ اور شفقانہ تھا۔

☆☆☆

بقیہ: مانوسیوا ہمیتی

گیا۔ یہ خبر سن کر ریتا چیخی ''شاکر میں زندہ ہوں میں زندہ رہوں گی۔ میں تمھارا مشن پورا کروں گی۔'' اور تیزی سے ماں سے کچھ کہے بغیر گھر سے نکل گئی۔ ماں نے روکنا چاہا مگر جس کے قدم کسی مقصد کے حصول کے لیے اٹھے ہوں اسے کون روک سکتا ہے۔ موہن شیام داس کو خبر ملتے ہی وہ ریتا کی تلاش میں نکل پڑا۔ ہسپتالوں کے مردہ خانوں میں' پولیس کے مردوں کی فہرست میں' قبرستانوں' شمشان گھاٹوں کے رجسٹروں میں کہیں ریتا کا نام نہ ملنے پر اسے گہرا دکھ ہوا۔ ایک روز وہ تلاش کے بعد مایوسی کی حالت میں پھر رہا تھا کہ اس کی نظر ایک ریلیف کیمپ (راحتی مرکز) پر پڑی۔ اسے خیال آیا کہ یہاں بھی دیکھ لیا جائے۔ وہ انفارمیشن کاونٹر (معلوماتی میز) پر گیا اور کیمپ میں پناہ گزینوں کے نام پڑھنے لگا۔ چند ورق پلٹنے پر ایک اندراج تھا

'' ڈاکٹر ریتا شاکر بیوہ شاکر ایڈووکیٹ''

جلدی سے رجسٹر بند کر کے وہ کیمپ کے اندر گھس گیا۔ تھوڑی دوری پر ایک کپڑے کا بینر لگا تھا جس پر لکھا تھا۔

'' مانوسیوا ہمیتی ''

اور وہیں ڈاکٹر مسز ریتا شاکر کرسی پر بیٹھی ہوئی پناہ گزینوں کے علاج میں منہمک تھی۔

☆☆☆

گھر سے باہر کرنیں

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

گھر سے باہر کرنیں نا چیں میرے گھر میں رات　　تیرے سوا سلجھائے آ کر کون مرے حالات
پائی پیسہ پاس نہ میرے جتا پھروں میں شاعر　　میں نے اس دنیا میں کھائی زرداروں سے مات
جس کو دیکھو غم کا مارا سکھی نہیں ہے کوئی　　جانے کب تک دکھیاروں کے بدلیں کے حالات
اپنے دکھ دردوں کی دنیا اپنے دل میں لے کر　　بستی بستی بھٹکے مسافر کوئی نہ پوچھے بات
میرے من مندر میں بیٹھا میرا ہی اک دوست　　پوچھ رہا ہے میرے من سے اپنے من کی بات
نگری نگری گھوم رہے ہیں انسانوں کے غول　　ڈال سے ٹوٹ کے تیز ہوا میں جیسے بکھریں پات
دل کا شیشہ کتنا نازک ہم اک غم سے چور　　اور زہیرؔ ہیں پتھر جیسے یہ بوجھل حالات

○

ملک زادہ جاوید (نوئڈا بھارت)

جو بونے تھے انہیں سجدہ کیا ہے　　ہمیں تنقید نے رسوا کیا ہے
مرے احساس کی پاکیزگی نے　　اصولوں کے لئے جھگڑا کیا ہے
گلابوں کی کئی شاخوں کو ہم نے　　ہوس نظروں سے بھی میلا کیا ہے
مرے گھر کے پرانے آئینوں نے　　نئے چہروں کو سنجیدہ کیا ہے
انھیں جاویدؔ تم مردہ نہ کہنا　　بزرگوں نے فقط پردہ کیا ہے

○

انوار فیروز (راولپنڈی)

دیپ روشن وہ کر گیا ہو گا　　نور بن کر بکھر گیا ہو گا
خشک آنکھوں میں کچھ نہیں باقی　　چڑھتا دریا اتر گیا ہو گا
اس نے چہرے پہ جو سجایا تھا　　وہ ملمع اتر گیا ہو گا
ہم عذابوں میں رہ کے زندہ ہیں　　وہ تو بزدل تھا مر گیا ہوگا
وہ جو زنداں میں مسکراتا ہے　　اس کا ہر زخم بھر گیا ہو گا
آج وہ بام پہ نہیں آیا　　حادثہ کچھ گزر گیا ہو گا
ساتھ میرے وہ چل رہا تھا مگر　　اب نہ جانے کدھر گیا ہوگا
ہم کو انوارؔ یہ خبر ہی نہیں　　کب وہ آیا کدھر گیا ہو گا

○

سیفی سرونجی (سرونج بھارت)

مجھکو خدا زمیں دے نہ کوئی مکان دے
دینا اگر ہے مجھکو تو جینے کی شان دے

خوشبو نہ دے سکیں گے یہ کمرے میں مت سجا
ہیں پھول سارے کاغذی ان پہ نہ جان دے

رہبر تجھے ملے گا کوئی خضر کی طرح
صحرا میں تو خلوص سے جا کر ازان دے

گویائی میری چھین لے ہے التجا میری
یا سچ میں کہہ سکوں مجھے ایسی زبان دے

وہ تو چلا گیا تجھے باتوں میں ٹال کر
سیفی نہ اس کی جھوٹی اداؤں پہ جان دے

پروفیسر صدیق شاھد (شیخوپورہ)

آگ کو پھول کہے جائیں خرد مند اپنے
اور آنکھوں پہ رکھیں دید کے در بند اپنے

لاکھ چاہا کہ غم و فکر جہاں سے چھوٹیں
جامۂ دل پہ یہ سجتے رہے پیوند اپنے

جن کو بخشا گیا اعجاز مسیحائی کا
صدف لب کی قسم رکھتے ہیں لب بند اپنے

شہر میں دھوم مچاتی رہی کیا تازہ ہوا
ہم نے دروا نہ کیا ہم ہیں گلہ مند اپنے

سطح قرطاس پہ اترے نہ تری گلبدنی
کتنے عاجز ہوئے جاتے ہیں ہنر مند اپنے

مرحلہ طے نہ ہوا اہل تذبذب سے کوئی
جرم تشکیک سے بیٹھے رہے پابند اپنے

ایسا کچھ گردش دوراں نے رکھا ہے مصروف
ماجرے ہو نہ سکے ہم سے قلمبند اپنے

ہم تو مر جاتے غم ہجر کے ہاتھوں شاھدؔ
وسعت آفاق میں ہوتے نہ اگر چند اپنے

ڈاکٹر محسن جلگانوی (حیدرآباد بھارت)

لہجہ وہجہ کا ہے کا اور جدت ودت کا ہے کی
چہروں کے بازار میں اپنی شہرت وہرت کا ہے کی

مکتب سے چھوٹے تو سمجھا' لوح و قلم سے چھوٹ گئے
حرف و ہنر نے باندھ رکھا ہے' فرصت ورصت کا ہے کی

ہم وہ پرندے ہیں جو اپنی شرطوں پر ہی جیتے ہیں
ہم کو سرحد و رحد کیسی' ہجرت وجرت کا ہے کی

دلی میں تھی جان ہماری' ہم کو دلی میں ڈھونڈو
صاحب اپنی ارض اودھ پر تربت وربت کا ہے کی

اسکو پڑھانے کے حیلہ سے اس کا چہرہ پڑھتے تھے
ورنہ ہمیں اوراق ادب سے نسبت وسبت کا ہے کی

آدمی بونوں کے سرکس میں' کاٹھ کا ایک کھلونا ہے
اسکی قامت وامت کیسی' قیمت ویمت کا ہے کی

کچھ لوگوں نے گھڑ رکھے ہیں' کچھ لوگوں کے بت ورنہ
ان کی ہیئت ویئت کیسی' مورت وورت کا ہے کی

حلق بریدہ' جسم دریدہ' کرب و بلا کے مارے ہیں
کوفے کی گلیوں میں ہماری عزت وزت کا ہے کی

باقی جتنے کام ہیں سارے جلدی جلدی نپٹا لو
آخری ساعت آ پہنچی تو' مہلت وہلت کا ہے کی

شعر سنانے کے بدلے میں داد وہش بھی پاتا ہے
شاعر کے آنے جانے میں' زحمت وحمت کا ہے کی

دیمک چاٹ رہی ہے محسنؔ' اردو کی بنیادوں کو
سارا تماشا ایک چھلاوا' خدمت ودمت کا ہے کی

کرامت بخاری(لاہور)

یہ جہان آب و گل ہے یہ نگر مٹی کا ہے — راستے سب گرد ہیں سارا سفر مٹی کا ہے
جی رہے ہیں ایک مدت سے کسی امید پر — اپنی اس سادہ دلی میں سب اثر مٹی کا ہے
یہ گزرتے لوگ یہ حیران کرتی صورتیں — آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے سب ہنر مٹی کا ہے
دیکھیے امید کی کشتی کا کیا انجام ہو — فکر ہے گہرا سمندر اور بھنور مٹی کا ہے
ڈر ہے یہ سیلاب گریہ میں نہ بہہ جائے تمام — تیرا غم سرمایۂ جاں ہے مگر مٹی کا ہے
کب تلک قائم رہے گا آخرش گر جائے گا — زعم ہو کس بات کا جب گھر کا گھر مٹی کا ہے

○

کرشن پرویزؔ (رودپر بھارت)

کیا پھول مسکرائے بہاروں کی گود میں — یا چاند ضوفشاں ہے ستاروں کی گود میں
کھولا ہے کس نے اپنی محبت کا بادباں — طوفاں سمٹ گئے ہیں کناروں کی گود میں
یوں مسکرا رہی ہے حوادث میں زندگی — جیسے شگفتہ پھول شراروں کی گود میں
کچھ اس قدر بڑھیں غم دوراں کی تلخیاں — مجھ کو نہ آئی نیند نگاروں کی گود میں
یہ کس کے انتظار میں گم صم ہیں منزلیں — ہم لٹ چکے ہیں راہ گزاروں کی گود میں
اے زیست ہم کو درد سے فرصت ملی تو ہم — خوشیاں بکھیر دیں گے ہزاروں کی گود میں
پرویزؔ یہ تو اپنے مقدر کی بات ہے — ہوتی کہاں ہیں راج دلاروں کی گود میں

○

ڈاکٹر شاہد رحمٰن (فیصل آباد)

زمین کہیں اور ہے' آسمان کہیں اور — رہنے کو ملا ہے ہمیں مکان کہیں اور
آسان نہیں کسی طور یہاں تیرا گزارہ — ڈھونڈ اپنا مقدر ارے ناداں کہیں اور
اس فکر میں بیٹھا ہوں حال اپنا سنا کر — لگ جائے نہ اب تیرا' دھیان کہیں اور
لے جاؤ کشتی ساحل پہ شام سے پہلے — آ جائے نہ ایسے میں طوفان کہیں اور
بس اتنا ہی کافی ہے محبت کا تماشا — ہو جائے نہ دنیا میں پہچان کہیں اور

○

پنہاں (یو۔ایس۔اے)

بہت قلب و نظر کے مسئلے ہیں — تمیز، خیر و شر کے مسئلے ہیں
رکیں تو بام و در کے مسئلے ہیں — چاہیں تو رہگزر کے مسئلے ہیں
بھرے گھر میں بھی تنہائی بھری ہے — سفر میں ہم سفر کے مسئلے ہیں
چمن اور آشیاں تو دور اے دل — ابھی تو بال و پر کے مسئلے ہیں
بہت سوچا تو بس اتنا ہی جانا — اگر کے اور مگر کے مسئلے ہیں
حقیقت میں تو خود زن کو جہاں میں — زمیں کے اور زر کے مسئلے ہیں
دُکھا ہے دل تو کیوں پلکوں پہ آنسو — رہیں گھر میں جو گھر کے مسئلے ہیں
غزل ہے شاعری کی جان پنہاں — مگر نازک ہنر کے مسئلے ہیں

○

شاہد عزیز (اے پی، بھارت)

یہ بھی تھی اک دنیا داری — منظر پہ تھا منظر بھاری
کتنے پتھر پھینکا تھا — کتنے کی تھی دہشت طاری
چاند ستارے ڈوب گئے — ہو گئی دنیا پھر اندھیاری
اپنوں نے ہی لوٹ لیا — دیکھو لوگوں کی عیاری
تم کو ہم کیا بتلائیں — زخم لگا ہے کتنا کاری
اب کیسے مٹ پائے گی — پھیلی گھر گھر یہ بیماری
مرتی ہے تو مر جائے — مر جائے یہ دنیا ساری

○

محمد ظہیر (لاہور)

میں پڑھنے کی ہوس میں گھٹ گیا ہوں — کئی شخصیتوں میں بٹ گیا ہوں
ہوا اشراف کے زمرے میں داخل — لہو کے سلسلوں سے کٹ گیا ہوں
غبارہ ہوں ' ہوا پر جی رہا ہوں — ہوا کے زوربی سے پھٹ گیا ہوں
یہ خواہش تھی بڑھوں کچھ اور آگے — مگر کچھ اور پیچھے ہٹ گیا ہوں
بلندی کی طرف اٹھے نہ پاؤں — نشیبوں کی طرف سر پٹ گیا ہوں
کبھی تنکا ہوں میں روشِ ہوا پر — کبھی طوفاں کے آگے ڈٹ گیا ہوں
ظہیر اک ابر بے مصرف ہوں میں بھی — برس پایا نہیں اور چھٹ گیا ہوں

○

حصیرؔ نوری (کراچی)

جلا تو دل یہ مگر شعلہ فغاں نہ اٹھا
نواحِ جاں سے ہمارے کبھی دھواں نہ اٹھا

شکستِ دل کا سبب بن نہ جائے بارِ گراں
دلِ حزیں سے کبھی اسقدر زیاں نہ اٹھا

گماں کی دھوپ سے گزرے ہیں بارہا ہم لوگ
سروں سے اب تو یقیں کا یہ سائباں نہ اٹھا

اٹھا چکا ہے بہت رنج تو زمانے کا
اب اور کوہِ الم سر پہ نہ مہرباں نہ اٹھا

چلے تو تھے خس و خاشاک آرزو لیکن
جو تھک کے بیٹھ گیا تھا وہ کارواں نہ اٹھا

تری صداؤں کے سب تیر خالی جائیں گے
فغاں و گریہ سے یوں سر پہ آسماں نہ اٹھا

یہ راہ تجھکو بیاباں میں چھوڑ دے گی حصیرؔ
اگر یہ سر سے ترے سایۂ گماں نہ اٹھا

○

اکرام تبسمؔ (لاہور)

بوجھ دنیا نے اس قدر ڈالا
میرے کاندھوں پہ اپنا سر ڈالا

زندگی نے ہماری قدر نہ کی
لوٹ کر ہم کو خرچ کر ڈالا

اپنی تصویر تو نہ تھی ایسی
رنگ بے رنگیوں نے بھر ڈالا

کیا تخلیق جب خدا نے ہمیں
دل بھی سینے میں توڑکر ڈالا

پگڑیاں ہوں گی اور نہ سر ہوں گے
ٹھوکروں میں ہمیں اگر ڈالا

ساری کوتاہیاں تو اپنی تھیں
سارا نقصان وقت پہ ڈالا

کیا تبسمؔ بتائیں دنیا نے
ہم پہ کتنا برا اثر ڈالا

○

صابر عظیم آبادی (کراچی)

کرتا رہا جو نفس کے لشکر سے سرد جنگ
میدانِ فکر میں بھی اسی نے بھری ترنگ

جتنے تھے ولولے مرے سینے میں سو گئے
حالات ایسے تھے کہ کہاں جا گئی امنگ

کیا دوسروں کو منع کریں اونچ نیچ سے
خود اپنی قوم و نسل سے ہم آ گئے ہیں تنگ

سینے میں چبھ رہی ہے تری یاد کی خلش
دل میں بنا رہا ہے تصور ترا سرنگ

مجھ کو فریب دینے کی کوشش نہ کیجیے
دیکھا ہے میں نے سارے زمانے کا رنگ ڈھنگ

ہے تم میں اور مجھ میں زمیں آسماں کا فرق
تم ہو کسی کی ڈور تو میں ہوں کٹی پتنگ

جن اسلحوں سے اٹھتا ہے بارود کا دھواں
ان اسلحوں کو دوستو لگنے دو اور زنگ

اپنے پرائے چھوڑ گئے مجھ کو راہ میں
اب دکھ ہی رہ گیا ہے مری زندگی کے سنگ

صابرؔ تغیراتِ زمانہ سے ان دنوں
اترا ہوا ہے چہرۂ انسانیت کا رنگ

○

شگفتہ نازلی (لاہور)

تحریر کس کی جس کا کہ مفہوم آپ ہیں
ایسے بھی ہیں مگر جنہیں معلوم آپ ہیں

بندوں کے کام آنا ' عبادت سے کم نہیں
کس نے ہے دل دکھایا ' کیوں مغموم آپ ہیں

کس کس کو رسم و راہ کی خواہش نہیں رہی
ہو جو کوئی بھی ' کم ہے کیا موسوم آپ ہیں

خدمت گزاری نے ہے یا طرفہ صلہ دیا
خادم کی طرح ہو کے بھی مخدوم آپ ہیں

ہو کے بھی مبتلا کسی رنگین جرم میں
کس کی نظر میں آج تک معصوم آپ ہیں

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
کیا کہیئے ایسے ظلم کے ' مظلوم آپ ہیں

اب تک تو آپ صرف ہیں منشور ہی ہوئے
پر پر چہ تازہ دیکھیے ' منظوم آپ ہیں

قسمت کے سارے کھیل بھی کیسے نیارے ہیں
کس کے نصیب ایسے کہ مقسوم آپ ہیں

ہونے نہ ہونے کا کسی کو کچھ پتہ نہیں
پھر کس لئے یہ روز و شب معدوم آپ ہیں!

○

علی آذر (کراچی)

چلتے ہوئے قدم نہیں رکتے ہیں راہ میں
رہتی ہیں منزلیں ہی ہمیشہ نگاہ میں

اِک آہ تو نکلتی ہے جب ہار جاتے ہیں
اِک حوصلہ چھپا ہوا ہوتا ہے آہ میں

تکلیف کے پہلو بہت مخفی ہیں انہیں دوست
لذت اگر چہ ہوتی ہے ہر اک گناہ میں

یوں دِلفریب سلسلے تسکین کے بہت
تسکین ملتی ہے مگر اسکی پناہ میں

کتنا تھا اسکو ڈھونڈا مگروہ نہیں ملا
اور مل گیا چلتے ہوئے اِک دِن وہ راہ میں

نظروں کا ہے فریب خیالوں کا ہے دھوکا
رکھتا نہیں ہے کچھ بھی نہ دولت نہ جاہ میں

یوں تو نہ جانے کتنوں کو چاہا علی آذر
کیسے کہوں جو بات تمہاری ہے چاہ میں

○

فیصل عظیم (کینیڈا)

اتنے ہنگامے میں کوئی میرا بھی کردار ہے کیا
نغموں کی اس گونج میں کوئی مجھ سا بھی بیزار ہے کیا

سنتے ہیں یہ آگ جلا کر کندن بھی کر دیتی ہے
لیکن راکھ میں ڈھل جانے کو اب کوئی تیار ہے کیا

خاموشی اور اتنی گہری خاموشی ہے دور تلک
میں جو کہتا اور لکھتا ہوں' وہ سب کچھ بے کار ہے کیا

سناٹوں کے مجمعے میں سب دیکھ رہے ہیں آج تجھے
شام ڈھلے تو چورا ہے پر نصب سرِ بازار ہے کیا

میری کہانی پھیکی ہے یا میرا لہجہ شوخ نہیں
یا دل کی چتا میں لازم اک فرضی کردار ہے کیا

کوئی سمجھنے والا ہو تو اس سے اک دن پوچھوں گا
میرا کہنا سننا بے معنی ہے یا دشوار ہے کیا

○

عرفان عابدی (کراچی)

زندگی کا سفیرو مسافر ہوں میں
اس زمیں پہ فقط تیری خاطر ہوں میں

ہر ورق پہ مرا اک نیا راز پڑھ
کتنا اندر ہوں میں کتنا ظاہر ہوں میں

لوگ ہیں خواہش سیم و زر کے اسیر
دل ابوذرؓ مرا' زر سے قاصر ہوں میں

دست بیعت لئے راہبر آئے ہیں
کیسی قوت ہوں میں کتنا قادر ہوں میں

جس کو اس دل نے سجدے پہ سجدے کئے
کیسے کہدے گا وہ ہائے کافر ہوں میں

رہ گئے در کھلے چشم حیران کے
شاید انسان ہوں اور نادر ہوں میں

آپ چاہیں تو کچھ داد دے دیجیے
میں کہ عرفان ادنیٰ سا شاعر ہوں میں

○

ڈاکٹر جواز جعفری (لاہور)

کچھ اس طرح ہمارا قصہ پاک کر دیا گیا
کہ جیتے جی ہمیں یہاں ہلاک کر دیا گیا

بس ایک لیر رہ گئی تھی جسم پہ وصال کی
اسے بھی فصل گل کا سن کے چاک کر دیا گیا

حنوط کر کے رکھ دی ہم نے شام اور اس کے بعد
ہمیشہ کے لئے وہ کمرہ لاک کر دیا گیا

کسی بھی چارہ گر نے میری روح پہ نظر نہ کی
دوا سے میرا جسم ٹھیک ٹھاک کر دیا گیا

ہمارے گھر میں اور کچھ نہ تھا بس ایک پیار تھا
اس ایک پیار سے بھی ہم کو عاق کر دیا گیا

ہمارے پاس دوسرا ٹھکانہ بھی نہیں ہے اور
تری گلی کا رستہ بھی بلاک کر دیا گیا

میں سوچتا ہوں ہنستے بستے آنکھوں کو دیکھ کر
ہمارا شہر بھی اگر عراق کر دیا گیا!

اب اس کا خواب جڑ پکڑ رہا ہے سب کی آنکھ میں
جواز جعفری سپردِ خاک کر دیا گیا

○

اختر رضا سلیمی (اسلام آباد)

اسی لئے تو جھجکتی ہے ہاتھ آتے ہوئے
دھنک نے دیکھ لیا تھا اسے نہاتے ہوئے

خیالِ کوزہ گری پہ لرز سا جاتا ہوں
میں آپ ٹوٹ نہ جاؤں تجھے بناتے ہوئے

انہی کو کرنی ہے تنظیم گردشِ دوراں
جو ہاتھ کانپ رہے ہیں سبو اٹھاتے ہوئے

پھر اس کے بعد سمٹنے میں ایک عمر لگی
بکھر گئے تھے ترا نقش پا اٹھاتے ہوئے

یہ کیسی خاک سے میرا خمیر اٹھایا گیا
کہ آنکھ سبز ہوئی جاتی ہے جلاتے ہوئے

نجانے کتنے گماں' کتنے خواب' کتنے یقیں
بھٹک گئے ہیں مجھے راستہ دکھاتے ہوئے

یہ رنگ و نور کا قصہ وہیں ہوا آغاز
جب اس نے دیکھا تھا مجھ کو نظر چراتے ہوئے

نجانے کونسی گلیوں میں چھوڑ آیا ہوں
چراغ جلتے ہوئے' خواب مسکراتے ہوئے

○

عبداللہ سلیم (لاہور)

یہ کارگزری ہے یا نا بکارگزری ہے — حیات اپنی سرِ نوکِ خار گزری ہے
تشلی ایسی کہ صبحِ بہار گزری ہے — وہ شام جو کہ سرِ کوئے یار گزری ہے
ہر ایک لحہ غلط کا ریوں کی نذر ہو — عجیب صورتِ اوقات کارگزری ہے
بجھے دیے نہ شبستاں میں کوئی بل چل تھی — شبِ فراق عجب وضع دار گزری ہے
ہجوم یاس میں شام و سحر برابر ہیں — خبر نہیں کہ خزاں یا بہار گزری ہے
نفس نفس ہے پریشاں نظر نظر بے چین — کسے کہیں کہ ناگوار گزری ہے
وہ ایک ساعتِ شریں جسے حیات کہیں — ہزار حیف کہ ناکردہ کارگزری ہے
مرے وطن کی فضا مرمریں سی ہے شاید — بہار ایکہ جو بے برگ و بار گزری ہے
سلیم صحن و روش میں تو خاک اڑتی ہے — ہمارا مالی یہ ضد ہے بہار گزری ہے

مشتاق شبنم (کراچی)

ایسے انسان جو خود پسند رہے — ذات کے دائرے میں بند رہے
جن سے چلتی ہے کائنات کی نبض — سب کہاں لوگ ایسے چند رہے
ہم کہ دیوانوں میں تھے دیوانے — ہوشمندوں میں ہوشمند رہے
ان کی شیرینئ سخن صد شکر — میرے ہونٹوں پہ زہر خند رہے
مصلحت ساز مصلحت اندیش — بزمِ دنیا میں ارجمند رہے
معتبر جس قدر تھی خواہشِ دل — اس قدر ہم بھی خود پسند رہے
غم کا اک پل بھی ناگوار رہا — عیش کے روز شب پسند رہے
ایک نعمت ہے زندگانی بھی — اس پہ بے جانہ قیدو بند رہے
پستیاں چاہتی تھیں کیا شبنم — ہم بہر حال سر بلند رہے

علی شاہ (سکیرہ بھکر)

رتجگوں کے عذاب بک جائیں — اور دیرینہ خواب بک جائیں
حق و باطل کا فرق کون کرے — شہر میں جب خطاب بک جائیں
قید خوشبو کبھی نہیں ہو گی — چاہے جتنے گلاب بک جائیں
آج دستار میں غرور نہیں — جیسے عالی جناب بک جائیں
ساری دھرتی پہ قہر ٹوٹے گا — جب سرِ راہ حجاب بک جائیں

عارف شفیق (کراچی)

رازِ ہستی کے جو مجھ پہ کھولتا ہے کون ہے
مجھ میں یہ میرے سوا جو دوسرا ہے کون ہے

اپنے دروازے پہ خود ہی دستکیں دیتا ہے وہ
اجنبی لہجے میں پھر وہ پوچھتا ہے کون ہے

بھیڑ میں دنیا کی جو کھونے نہیں دیتا مجھے
یہ جو میری ذات کے اندر چھپا ہے کون ہے

مجھ کو تو بیدار رکھتا ہے صداؤں کا ہجوم
شام کی دہلیز پہ جو سو گیا ہے کون ہے

لکھ رہا ہے جو مری تقدیر میں بربادیاں
وہ امیرِ شہر ہے میرا خدا ہے کون ہے

گرمیِ آغوشِ مادر کے لئے عارف شفیق
مجھ میں جو معصوم بچہ رو رہا ہے کون ہے

○

شارق بلیاوی (کراچی)

یہ تو بے حرف کی ہے اک تحریر
چھین سکتا نہیں کوئی تقدیر

اختلافی ہیں سارے احساسات
اک محبت ہی شے ہے عالم گیر

دل نہیں جو وفا سے ہو خالی
شمع ہوتی نہیں بلا تنویر

وہ تو چاہے ہوا کو قید کرے
ایسی ملتی نہیں کوئی زنجیر

دل ہے مجرم تو دل کو قید کرو
پاؤں میں کیوں پہناتے ہو زنجیر

خواب تعبیر کے ہیں امکانات
خواب رکھتے نہیں کوئی تعبیر

کسی تخریب کا جواز نہیں
ہو متحرک نہ جب تلک تعمیر

مفلسی سے کہیں یہ بہتر ہے
میں جو رکھتا ہوں درد کی جاگیر

اپنے شعروں کے رنگ سے شارق
زندگی کی بناتا ہوں تصویر

○

شہاب صفدر (ڈیرہ اسماعیل خان)

تو نے دیکھا نہیں انداز جہاں بانی کا
دور تک شہر سا آباد تھا ویرانی کا

اور کچھ بھی نہ سہی ساتھ سفر میں اپنے
ایک احساس تو ہے بے سروسامانی کا

کوئی دم خیر منا میرے نشیبی ہمزاد
رخ ادھر ہی کو ہے کم ظرف کی طغیانی کا

دو سخن اور مرے ہمدم نکتہ پرواز
ہمہ دانی پہ تری قرض ہے نادانی کا

جسے کھلنے کا سمے بیت گیا' اب تو شہاب
موسم آیا ہے مرے اجزا کی پریشانی کا

○

سجاد مرزا (گوجرانوالہ)

اگرچہ ہارنے والا نہ تھا لڑائی میں
مگر میں کود پڑا آگ کس پرائی میں

ہر ایک فرد پکارے ہے الاماں یارب !
یہ انقلاب بھی دیکھا تری خدائی میں

میں دعویدار تو چپ ہی رہا مگر اس نے
زمین بانٹ دی ہر ایک میرے بھائی میں

ملے جو وقت کبھی دیکھ تو ہمیں آ کر
کہ کتنے دکھ ہیں اٹھائے تری جدائی میں

ہوں ایک عمر سے سوچوں کے قیدخانے میں
نہ جانے دیر ہے کتنی مری رہائی میں

جسے بھی دیکھو وہی پاگلوں میں شامل ہے
کہ ایسا ہونا ہی تھا اس کی آشنائی میں

سخنوری کے حوالے سے بات کیا کرنا
خسارہ کتنا اٹھایا ہے اس کمائی میں

کہاں نصیب میں ان کے ہے منزلِ مقصود
چلے جو غیر کی سجاد رہنمائی میں

○

احمد ظہور (اسلام آباد)

منصف کے سامنے کوئی کب تک دھائی دے
انصاف ہو تو ہوتا ہوا بھی دکھائی دے

ظالم نے ہم سے قوتِ گویائی چھین لی
مظلوم کو زبان ملے تو گوائی دے

ہے شور حشر کوچہ و بازار میں بپا
کسی کو کسی کے درد کا نغمہ سنائی دے

نشتر دیا ہے تو نے مسیحا کے ہاتھ میں
یا رب تو اس کے دل کو بھی درد آشنائی دے

ہو میری آرزو کو عطا منزلِ مراد
یا قیدِ آرزو سے مجھے اب رہائی دے

○

پروفیسر ساحر (ایبٹ آباد)

اس بیری سنسار میں' کیوں کر جیئے فقیر
چلتی چکی دیکھ کر' رویا بھگت کبیر

اپنی اپنی بانسری' اپنا اپنا راگ
سادھو پکارے ہری ہری' رانجھا پکارے ہیر

کیسے بتلاؤں تجھے' کیا میرا حال
تجھ برہا کی آگ میں' جل بجھ گیا شریر

مجھ ایسا سنسار میں' اور نہیں ہے کوئے
کیوں نہ بہائے آسماں' میرے مرن پہ نیر

جو ہونا تھا ہو چکا' اب رونا بے کار
سانپ تو کب کا گزر گیا' پیٹے آپ لکیر

رہتا ہے ہر دم مجھے' ساحر اسی کا دھیان
مجھ اکھیں میں ہے بسی' ساجن کی تصویر

○

☆

اپنے پیارے وطن کے نام

☆☆☆

میرے پیارے وطن مل کے آپس میں آ، اپنے آلام کی آج باتیں کریں   درد رنج والم غم کے کوہِ گراں، اِس پہ دُشام کی آج باتیں کریں

میں بھی غمگین ہوں تو بھی رنجور ہے، میں ہوں زخموں سے گھائل تو بھی چور ہے   ہم کو بے دست و پا اپنوں نے کیا، میں بھی مجبور ہوں تو بھی مجبور ہے

دونوں اپنوں کے ہی ہیں ستائے ہوئے، تیر پر تیر دونوں ہیں کھائے ہوئے   نیم جاں اور بسمل ہیں لاچار ہیں، اور ستمگر کو کندھوں اٹھائے ہوئے

اب تو ہونٹوں پہ آ دے نہ فریاد ہے، ہر کوئی برباد ہے اور بے داد ہے   لاکھ کہتے رہیں پر نہ مانے کوئی، میں بھی آزاد ہوں تو بھی آزاد ہے

رہیں ملحوظ آداب جاہ و حشم، اور رسم ہے یہ سر کو جھکائے رکھو   کچھ نہ دیکھو سنو جی سکو تو جیو، اور زباں بیچ دانتوں دبائے رکھو

سارے اپنے ہمارے رقیب ہو گئے، دن تاریک اپنے نصیب ہو گئے   خوں میں سرخی وہی لالی پرانی وہی، مگر اس کے حاصل عجیب ہو گئے

لب تو وا ہیں مگر سب ہی خاموش ہیں، چلتے پھرتے ہیں لاشے بے ہوش ہیں   کچھ زبوں حال اتنے پریشان ہیں، کچھ ہیں خوشحال ایسے کہ مدہوش ہیں

ہم سا رسوا ہو کوئی خدا نہ کرے، ہم سا کوئی گرا ہو خدا نہ کرے   ایسی حالت میں کوئی خدا نہ کرے، ہم پہ آئے وہ وقت خدا نہ کرے

ساتھ آ دو بقا بے نوا کی دعا، یا خدا رحم کر اپنے اس حال پر   ہم پہ نظرِ کرم اور وہ بھی پیہم، یا خدا رحم کر اپنے اقبال پر

☆☆☆

محمد اقبال بھٹی (برمنگھم، یوکے)

☆

کافکا کی کہانی ...... ممتاز احمد (برمنگھم)

شاعر نے کہا تھا

حاصل عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بودم پختہ شدم سوختم

بیسویں صدی نے شاید برٹرینڈ رسل جیسا مفکر پیدا نہیں کیا۔ اس نے اپنی سوانح میں ایک جگہ لکھا:

''میری زندگی کے تین مقاصد رہے ہیں۔ علم کی تلاش، محبت کی جستجو اور غم دوراں''

ان ارفع مقاصد کا حصول تو بہت دور کی بات ہے۔ ہم جیسوں کو ان کے معنی ہی سمجھنے کیلئے ایک عمر درکار ہے۔ دنیا کے عظیم سائنس دان نیوٹن نے جب صدائے اجل کو لبیک کہا تو اس نے کہا تھا:

''لوگوں کا خیال ہے کہ میں علم کی تہہ تک پہنچ گیا ہوں جبکہ میری مثال اس طفل مکتب کی سی ہے جو علم کے بحر بے کنار کے ساحل پر کھڑا اپنے اردگرد بکھرے سنگ ریزوں میں سے اٹھا تا چند چمکیلے پتھروں کو چن لے''

فرانز کافکا شاعر تھا نہ فلسفی اور نہ ہی سائنس دان بلکہ حیران کن حد تک خوابوں کے سے خیالات میں الجھا خواب آلود سحر انگیز ایک صاحب طرز ادیب اور افسانہ نگار تھا۔

کسی تحریر کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ اسے ایک بار پڑھنے والا دوبارہ ضرور پڑھتا ہے اور دوسری بار پڑھ چکنے والا تیسری مرتبہ بالارادہ پڑھنے کی ضرور خواہش رکھتا ہے۔ دنیا کی تمام خوبصورت تحریروں کی اگر یہ ایک پہچان ہے تو یقینا ہے تو کافکا کی تحریر بھی ایسی ہی ایک تحریر ہے۔

'افسانے' کی کہانی لکھتے ہوئے کافکا کا اچھوتا انداز ملاحظہ ہو۔ لکھتا ہے:

''۔۔۔۔ یہ کہانی ساری کائنات کو احاطہ کرتی ہے۔ اسے دنیا کی ہر کتاب میں شامل کیا جاتا ہے۔ اسکول کے تختہ سیاہ پر بھی کہانی لکھی جاتی ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلاتے وقت اسی کے بارے میں سوچتی ہیں۔ نوجوان عشاق جوڑے بوس وکنار کرتے ہوئے سرگوشیوں میں یہی کہانی بیان کرتے ہیں سپاہی یہی کہانی دہراتے ہوئے میدان میں کود پڑتے ہیں۔ دکانداروں اور گاہکوں کی گفتگو میں اس کہانی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مذہبی تقاریر میں محراب و منبر پر اسی کا ذکر ہوتا ہے۔ یہ کہانی روزانہ اخباروں اور رسائل میں شائع ہوتی ہے اور مسافر اسے پڑھنے کے بعد ساتھ والے مسافروں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ مطالعہ گاہوں میں بیٹھے تاریخ داں اسی کہانی کی قدامت پر حیران ہوتے ہیں۔ ٹیلی گرام اسی لئے ایجاد ہوا کہ یہ کہانی دنیا میں زیادہ تیزی سے پھیل سکے۔۔۔۔''

''آثار قدیمہ کی تلاش میں ہونے والی کھدائیوں سے بھی کہانی برآمد ہوتی ہے۔ بلند و بالا عمارتوں کی سیڑھیاں اس کہانی کو چھت تک لے جاتی ہیں۔ غیر ملکی سیاح اجنبی جگہوں پر اس کہانی کا ذکر چھیڑتے ہیں لیکن ان سے پہلے وحشی نسلوں کے افراد وہاں لوگوں سے اس کا تذکرہ کر چکے ہوتے ہیں۔ آسمان پر یہ چاند اور ستارے یہی کہانی سناتے ہیں اور جھیلوں پر اسی کا عکس نظر آتا ہے۔ دریا کی لہریں اسے پہاڑوں کی چوٹیوں سے نیچے لاکر سمندروں میں ڈبو دیتی ہیں مگر بادل اسے دوبارہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہنچا دیتے ہیں اور تم۔۔۔۔ تم یہاں بیٹھ کر اس کہانی کے بے ربط ہونے کی شکایت کرتے ہو یقینا تم نے تلخ بچپن گزارا ہے۔۔۔۔''

پہاڑ کی طرح اٹل اور سخت گیر باپ کے سائے میں کافکا کی کہانی ادھوری رہ گئی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی تقریبا تمام تخلیقات نامکمل ہی رہیں اور کافکا کی اپنی زندگی ہی نامکمل حالت میں اختتام پذیر ہوئی مگر جس طرح ایک نہایت خوبصورت عورت کی کج ادائی بھی اس کی ایک ادا کہلاتی ہے کافکا کے فسانوں کی ناتمامی بھی اس کی ایک ادا کہلاتی ہے کافکا کے فسانوں کی ناتمامی بھی ان کی دلکشی میں مزید اضافے کا سبب بنی اور یہی کافکا کے فن کی خوبصورتی اور انفرادیت ہے۔

بحیثیت ادیب کافکا نے ایک نامعلوم سمت میں سفر شروع کیا۔ اس لحاظ سے وہ جدید فرانسیسی ادب کے دوستوں البرٹ کامیو اور سارتر کا پیش رو ہے اس لئے کہ جب یہ ادیب جرمن زبان کے اس خواب آلود عبقری کی تخلیق کردہ کربناک ادبی فضا میں داخل ہوئے تو حیرتوں میں گم واپس لوٹے کہ عام ادیبوں کے معروف ''بیانیہ'' راستے پر چلنے کے بجائے کافکا نے علامتوں کا پر پیچ اچھوتا اور منفرد راستہ اپنایا تھا۔

دنیا کا ہر فنکار کسی نہ کسی اعصابی مرض میں مبتلا ہوتا ہے مگر کافکا سے پہلے اس جیسے دلکش اور تہہ دار انداز میں دوسرا اور کوئی اپنا روگ بیان نہیں کر سکا اور یہی اس کے فن کا کمال ہے۔

خود فریبی کی اس سے بڑھ کر خوبصورت تصویر کشی اور کیا ہو سکتی ہے کافکا لکھتا ہے:

''۔۔۔۔ تھک آ کر میں خود سے باہر نکلا۔ ہوا میں
کے چلائے اور اپنے دشمن کو فنا کرنے کے بعد ایک
فاتح کی حیثیت سے پرسکون ہو کر میں خود میں واپس
آ گیا ہوں''

''۔۔۔۔ میری کہانیاں ثابت کرتی ہیں کہ ناقابل بیان' ناقابل بیان ہوتا ہے۔۔۔۔ مگر یہ بات تو سب لوگ پہلے ہی جانتے ہیں''

''۔۔۔۔ جو پیغام میں لکھ رہا ہوں وہ کسی کو نہیں ملے گا کیونکہ میری شکستہ تحریر پڑھنی ہی مشکل ہے۔ اگر پڑھ لی جائے تو سمجھنی مشکل ہے اسلئے کوئی میری مدد کو نہیں پہنچے گا''

''۔۔۔۔ کوئی نہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔ اگر جانتا بھی ہے تو اسے یہ معلوم نہیں کہ میں کہاں ہوں اور اگر یہ معلوم بھی ہو جائے تو اسے قطعی معلوم نہیں کہ میری مدد

کیسے کی جا سکتی ہے''۔

کافکا نے اپنے ناقابلِ بیان وسوسوں اوراندیشوں کیلئے علامتوں کا سہارا لیا اور پھر اس کے سہارے اپنے اندر کی دنیا کو یوں بیان کرنے لگا جیسے دنیا کے تمام بڑے ناول نگار شہروں' صحراؤں اور جنگلوں کی جزئیات بیان کرتے ہیں مگر کافکا کے اچھوتے اندازِ بیان نے فنِ قصہ گوئی کی روایت میں ایک ایسی جہت کا اضافہ کیا جو اس سے پہلے یکسر مفقود تھی۔

کافکا کے منفرد اسلوب سے افسانے کی دنیا میں اولاً خاموشی چھا گئی اور پھر ایک طوفان برپا ہو گیا۔ نازیوں نے اقتدار حاصل کرتے ہی جرمنی میں کافکا کے بڑھتے ہوئے اثرات کو دبانا چاہا مگر اس دوران کافکا کی تحریریں فرانس پہنچ چکی تھیں۔ فرانس پہنچنے پر تبدیلی بادِ مخالف میں کی واقع ہوئی۔ جب دھول بیٹھی تو کافکا کے اصل خدوخال واضح ہوئے۔ جدید فرانسیسی ادیبوں البرٹ کامیو اور سارتر نے یک زبان ہو کر جرمن زبان کے اس خواب آلود جینئس کی تخلیق کردہ مبہم ناک فضا کو ادب کیلئے ایک نیک فال قرار دے کر جرمن زبان کے اس ادیب کی عظمت کا اقرار کرتے ہوئے اسے شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

افسانہ نگاروں کا افسانہ نگار کافکا 1883 میں چیکوسلواکیہ کے شہر پراگ میں پیدا ہوا۔ پراگ کی عام زبان چیک تھی مگر وہاں جرمنی بولنے والوں کا بھی ایک طبقہ تھا۔ یہودی خاندان میں جنم لینے کے باعث کافکا اس یہود جرمن طبقے کی نمائندگی سے بھی محروم رہا۔ کافکا اقلیت در اقلیت تھا۔

''جب میرا خود ہی سے کوئی تعلق نہیں ہے تو یہودیت سے کیا تعلق ہو سکتا ہے''۔ اس نے لکھا۔ اقلیت کو تمام عمر دوسروں کا مذاق سہنے کے علاوہ کبھی کبھی خود ہی اپنی تحقیر بھی کرنی پڑتی ہے۔ کافکا کے تمام کردار کسی نہ کسی دردناک صورت حال سے نکلنے کی لایعنی جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کرداروں کے ذریعہ اپنی حالت بیان کرنے میں کافکا کا کوئی ثانی نہیں۔

ہر ادیب کی طرح کافکا بھی لکھنے سے سکون حاصل کرتا تھا۔ اسی لئے مضطرب کافکا دن رات لکھنا چاہتا تھا مگر مالی حالات اسے نوکری کرنے پر مجبور کرتے رہے۔ اس نے ایک جگہ لکھا:

''نوکری کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنے مقبرے کے لئے چندہ جمع کر رہا ہو'' وہ دوستوں سے اس طرح کی باتیں کرتا اور سارا دن ایک انشورنس کمپنی کے بدمزا ماحول میں بند ہو کر جینے پر مجبور رہا۔ کبھی کبھی وہ اس صورت حال سے بغاوت کر کے دیوانہ وار تحریر سے سکون حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ یہ بے چینی مقدس ہے۔ دنیا کی تمام بڑی کتابوں کے تمام خوبصورت جملے شاید اسی کیفیت میں تخلیق ہوتے ہیں۔ کافکا کی تحریر بھی اپنی انتہا کو پہنچ کر الہامی محسوس ہوتی ہے یکساں کیفیت سے جنم لینے والے الفاظ یکساں تاثیر رکھتے ہیں۔ کافکا کو ڈوب کر پڑھنے والے زندگی بھر کیلئے کافکا کے فن کے پرستار ہو کر رہ جاتے ہیں۔

افسانہ لکھنے کے دوران ۔۔۔کافکا اپنی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے ''۔۔۔ اکثر اوقات میں خود کو اپنی ہی پشت پر سوار کر کے چلتا ہوں ۔۔۔اور مجھے اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا پڑتا ہے''

آئن سٹائن اپنے دوست کو کافکا کے افسانوں کی کتاب لوٹاتے ہوئے مسکرا دیا۔ ''کافکا کے افسانے۔۔۔'' آئن سٹائن نے کہا' ''دماغ پر خراشیں ڈال دیتے ہیں'' انسانی تاریخ کے پرتخیل اور سب سے ذہین ریاضی دان کا یہ جملہ کافکا کے افسانوں کو بہت بڑا خراجِ عقیدت ہے۔

کسی بھی ادیب کی تمام تحریریں عظمت کے اعلیٰ درجے پر فائز نہیں ہوتیں اور کافکا بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں لیکن اس سے کافکا کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ ناقدین کے نزدیک اس کے ناول نہایت اچھوتے اور طاقتور خیال پر تعمیر ہونے والی کمزور عمارتیں ہیں۔ اس کے خطوط اور ذاتی ڈائری کے اوراق بھی جگہ جگہ چنگاریاں اڑانے کے باوجود مجموعی طور پر خشک ہیں مگر اس کے افسانے ذات کے پاتال میں چھلانگ لگا دیتے ہیں اور وجود کی تہ میں گم کر دینے والے پر پیچ جنگل اور اپنے اندر جذب کر لینے والی دلدل ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں شعور اور لاشعور کا تصادم اتنے دلکش اور پیارے انداز میں بیان کرتا ہے کہ کافکا کا قاری اسے دنیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔

کوئی افسانہ نگار کافکا سے زیادہ قدرت کی ستم ظریفی سے آشنا نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہر انسان پیدائش سے لیکر موت تک کڑی قید میں ہونے کے باوجود خود کو آزاد تصور کرتا ہے اور جب اسے احساس ہوتا ہے کہ محض خود فریبی کے سہارے وہ اب تک زندہ ہے تب تک انسانی زندگی تقریباً ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ خود کو بااختیار کُل سمجھنے والا انسان مجبورِ محض ہے اور یہی اس کا مقدر ہے۔

ع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

کافکا پر یہ حقیقت اس کی موت سے بہت پہلے منکشف ہو چکی تھی اور اس انکشاف کا اس نے اپنے افسانوں میں فنکارانہ اظہار کیا۔ ''ممکن ہے کچھ لوگ میرے بارے میں سوچتے ہوں مگر مجھے اس کا علم نہیں''

کافکا کی شہرت اس کی موت کے بعد شروع ہوئی اسلئے اس کے بارے میں جتنے لوگوں نے جو کچھ سوچا وہ اس سے باخبر نہ ہو سکا۔ کافکا کے فن اور شخصیت پر گزشتہ 80 برسوں میں لکھی جانے والی کتابوں کی مجموعی تعداد ایک ناقد کے بقول شیکسپیئر پر تین سو سالوں میں لکھی جانیوالی کتابوں سے زیادہ ہے۔

ع مر گئے ہم تو دنیا نے بہت یاد کیا

تپ دق میں مبتلا کافکا نے اکتالیس برس کی عمر میں آسٹریا کے شہر ویانا کے نزدیک ایک پرفضا قصبے میں انتقال کیا۔ مرنے سے کچھ ہی دیر پہلے اس نے اپنے دوست میکس براڈ سے فرمائش کی کہ اس کے بعد اس کی تمام تحریریں نذرِ آتش کر دی جائیں۔ یہ کافکا کی خوبصورت ادبی شخصیت کی آخری انوکھی ادا تھی۔

شاید کافکا ہی جیسی خوبصورت ادبی شخصیات کے لئے خواجہ حافظؔ جیسے باکمال شاعر نے صدیوں پہلے کہہ دیا تھا۔ ع

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

'' پیرہنِ عشق ''

ڈاکٹر اسماعیل آزاد (فتح پور،بھارت)

راقم کو شعری مجموعہ ''سوادِ حور'' ممتاز شاعر محترم غلام مرتضیٰ راہی کی وساطت سے نظر نواز ہوا۔ آج اس گھڑی سے پیشتر اس کا تخلیق کار راقم کے لیے بالکل اجنبی تھا' کتاب ہاتھ میں لی اور ورق گردانی کرنے لگا۔ آدھے گھنٹے کے کو تاہ عرصہ کے بعد شاعر اپنا سا لگنے لگا جیسے اس سے برسوں کی شناسائی ہو۔ ان چند لمحات کی جستہ جستہ ورق گردانی سے شاعر کی بابت جو تاثرات راقم کے جریدۂ قلب پر مرتسم ہوئے اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ شاعر موصوف کو اسلام اور شعائرِ اسلام سے کافی وابستگی ہے۔ وہ دل سے راست باز موحد اور نبی کی مرتبت ﷺ کا لائق رشک عقیدت مند معلوم ہوتا ہے نعت گوئی کو اپنا وتیرہ بنانا نبی امی ﷺ سے اس کی والہانہ عقیدت کا مظہر ہے۔ یہ ایک مسلمہ ہے کہ نعت کی وادی پر خار ہے اور وہ بذات خود ایک مشکل صنفِ سخن ہے' اس میں فوق و تحت دونوں جانب قدغن ہے۔ اگر بشریت اور عبدیت قابِ قوسین اوادنیٰ کی حد بندی توڑ کر الوہیت میں مدغم کردی گئی تو یہ امر غلط اور موجب تعزیر ہے اور اگر بشریت کو نور سے علیٰحدہ کر کے صرف بشریت کے جامے میں دیکھا اور دکھایا گیا تو وہ بھی گرفتنی اور لائق پشیمانی ہے۔ فی الواقع ایسے شعرائے نعت کو انگلیوں کے پوروں پر گنا جاسکتا ہے جو اپنی نعتیہ کاوشات کو افراط وتفریط سے بالاتر رکھ پائے ہوں۔ صفوت صاحب کی نعتوں میں چند لمحوں کے لیے ڈوب جانے پر اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ محترم صفوت ان معدودے چند وابستگانِ نعت میں ہیں' جنہوں نے شرعی حدود کے اندر رہ کر محبوبِ رب العالمین' حاصلِ کائنات اور گلِ سرسبدِ تخلیقات خداوندی سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اچھی اور صالح نعت کہہ لینا زور بازوئے سخن کا نہیں بلکہ فضلِ الٰہی کا ثمرہ ہوتا ہے۔ اسی بات کو صفوت کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں

پیرہن عشق کا الفاظ کو پہناؤں گا
اور فریاد کے رنگ سے اسے رنگواؤں گا
خوں عرب ہی کا سہی پر یہ زباں ہے عجمی
لفظ تعریف کے ایسے میں کہاں پاؤں گا
سن کے یہ دل نے کہا ہاتھ سے فوراً صفوت
تم اٹھاؤ تو قلم نعت میں لکھواؤں گا

موصوف کو آدابِ نعت سے اچھی خاصی آگاہی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا درج ذیل شعر قابل رقم ہے۔ ع

لو سانس بھی آہستہ کے ٹوٹے نہ مرا خواب
سرکار دوعالم مرے پاس آنے لگے ہیں

یقیناً وہ خواب لائق تکریم ہے' جس میں نبی اکرم ﷺ کی آمد آمد ہو۔ محمد عربی سرتاج انبیا ورسل کی ذات گرامی اصلاً نور ہے' بشریت کا جامہ آپ کو اس لئے عطا کیا گیا ہے کیونکہ نور غیر متشکل ہونے کی صورت میں غیر مرئی ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے خود فرمایا ہے'' انا من نور اللہ'' اسی لئے آپ ﷺ بغیر سحری و افطار کے چالیس چالیس دنوں کے روزے رہتے تھے اور جب آپ ﷺ کے اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی آپ ﷺ کے تتبع میں صوم وصال کا آغاز کیا تو آپ ﷺ نے انہیں اس سے باز رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا'' ایکم مثلی یطعمنی ربی ویسقینی (بخاری ومسلم روی) اول حضرت ابوہریرہ رضی اللہ علیہ) تم میں کون مجھ جیسا ہے' مجھ کو میرا رب کھلاتا پلاتا ہے۔ اس مختصری تمہید کے بعد صفوت صاحب کے اس شعر کی قراءت کریں۔ ع

فقط نور ہیں وہ ہمہ نور ہیں وہ
جسد تو یہ بن کر نقاب آرہا ہے

سوادِ حور ' کے تخلیق کار کا مذہبی مطالعہ بہت عمیق اور کافی وسیع ہے۔ موصوف حروف والفاظ کے انتخاب پر زبردست قدرت رکھتے ہیں اور ایجاز بیانی موصوف کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ طویل سے طویل مذہبی واقعات ودینی روایات کو ایک شعر کے دو مصروں کی ننھی سی دنیا میں محفوظ کرلینے کا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ابن عیینہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ مسجد نبوی میں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ اپنے دونوں انگوٹھوں کے ناخنوں کو اپنی آنکھوں سے لگا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک یا رسول اللہ ﷺ آپ ہیں ، جب حضرت بلالؓ اذان سے فارغ ہوگئے تو نبی رحمت ﷺ نے فرمایا کہ اے ابوبکرؓ میری ملاقات کے شوق میں جو کچھ تم نے کہا اور کیا' اس پر جو بھی عمل پیرا ہوگا' اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف فرمادیں گے گناہ خواہ نئے ہوں یا پرانے' عملاً ہوئے ہوں یا سہواً پوشیدہ ہوں یا آشکارا۔ ایک دوسرے موقع پر سیدی حبیبی محمد عربی ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اذان میں میرا نام سنا اور اپنے ہاتھ کے دونوں انگوٹھوں کے ناخنوں کو بوسہ دیا اور ان کو اپنی آنکھوں پر پونچھ لیا' تو وہ سدا حزن وغم سے محفوظ رہیگا۔ (تفصیل کے لئے جلالین شریف ص 357 حاشیہ 13, 12 کی طرف رجوع فرمائیں) اس تمہید کے بعد شاعر محترم صفوت

کا درج ذیل شعر سماعت فرمائیں۔

سنتے ہیں محمدﷺ وہ چومے ہے انگوٹھوں کو
کہتا ہے اسی سے تو آنکھوں میں اجالا ہے

سوادِحور کا شاعر تلمیحات اور رمز و کنایہ کا شہنشاہ ہے۔قرآنی و احادیثی تلمیحات میں اس کا درک کافی دم دار اور خاصا جاندار ہے۔آیت کریمہ ہے

''ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی طیا ایھا الذین آمنوصلوعلیہ وسلمو اتسلیما''

(بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی ﷺ پر درود بھیجتے ہیں' اے ایمان والو! آپ ﷺ پر درود و سلام خوب بھیجو) قرآنی آیت کو مدنظر رکھتے ہوئے شاعر موصوف کا درج ذیل شعر ملاحظہ فرمائیں ع

سنتے ہی محمدﷺ وہ بھیجے ہے درود ان پر
کہتا ہے خدا بھی تو جیتا ہی بالا ہے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نصف گھنٹے کے مطالعے کے ثمرہ میں صفوت صاحب کی غیر مذہبی شاعری بالخصوص ان کی غزلیہ شاعری کی بابت جو خیالات راقم کے ذہن میں سر اٹھا رہے ہیں' ان کو بھی بہت اختصار کے ساتھ قلم بند کر دیا جائے۔

صفوت صاحب کی شاعری کا مابہ الامتیاز عنصر ان کی اجتہادیت ہے۔ راقم کو ان کی شعری کاوشات میں بہت سے ایسے اشعار پڑھنے کو ملے ہیں' جن سے ان کی جدت طرازذہنیت کا اندازہ لگتا ہے۔وہ تقلید کے نہیں' اجتہاد کے قائل ہیں۔ اسی لئے خیالات کو نظم کرنے کا ان کا انداز نرالا اور اچھوتا ہے۔ان کی تشبیہات اور ان کی تلمیحات تازہ اور جدید ہیں۔صفوت کی جس خوبی نے راقم کو ان کا گرویدہ بنا دیا' وہ ان کی جرات اظہار ہے' جو اس دنیا میں کم شاعروں بلکہ کم انسانوں کے حصے میں آتی ہے۔اسی لیے نبی ای ﷺ نے سلطان جابر کے سامنے اظہار حق کو جہاد کے زمرے میں شامل کیا ہے۔''سوادِحور'' سے اس قبیل کے چند اشعار بشرف ملاحظہ پیش ہیں ع

یہ عیاری ' یہ مکاری یہ دھوکے
یہ خوں ناشر میں برطانوی ہے
ایک دن اچانک پھر تاجروں کے مندر میں
حشر کی ریہرسل کو اترے گرو یہاں
منسلک ہوں جنگوں سے فیل ہے نشاں جن کا
پھر نہ ہوں لا بلیں ' جھنڈا اک اڑاؤں میں
جمہوریت کے عشق میں یلغار دیکھنا
بش کا عراقیوں سے ذرا پیار دیکھنا
سب منتظر ہیں آمد عیسیٰ کے شہر میں

پر جانے کیا ہوا کہ یہ بش زاد ہو گیا
مری جانب سے جا کر آپ بش کے باپ سے کہہ دیں
کوئی اسلام کو مرہون منت کر نہیں سکتا

صفوت عصر حاضر کی مفسرہ پردازیوں اور انسانیت کے لیے سم قاتل کے اثرات رکھنے والے حالات سے بخوبی آگاہ ہیں۔وہ اس بزعم خود ترقی یافتہ معاشرہ کا موازنہ و مقابلہ عہد جاہلیت کے معاشرے سے کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہے زنا بالجبر صادر اب سزائے بے قصور
یہ ہمارے منصفوں کا اب طریقہ طور ہے
اس سے بہتر تھا کہ زندہ دفن کر دیتے تھے جب
عہد جاہل سے بھی جاہل یہ ہمارا دور ہے
خود اپنے کٹہرے میں کھڑی اب ہے عدالت
آئین اور آئین کی پرواز تو دیکھو
کیا تحائف ' کیا طوائف کیا وہ اوراق اہم
عزت و ناموس تک نیلام انٹرنیٹ پہ ہے

صفوت کے شعری مجموعہ میں کئی اشعار ایسے ملے ہیں' جن میں کائناتی صداقتیں اور آفاقی حقیقتیں کافی حسین اور دلاویز انداز میں نظم ہوئی ہیں۔طنز و مزاح اگر سلیقہ سے بے بہرہ ہے' تو وہ فن نہیں' پھکڑ پن ہے۔صفوت کے یہاں اس حقیقت کا اظہار ملاحظہ فرمائیں۔ ع

صفوت کے گھر میں ستھری ملائم ہے گفتگو
طنز و مزاح بھی ہے مگر اک وقار سے

زبان عالم کی زد سے آج تک کوئی بھی نہیں بچ پایا' اس کائناتی حقیقت کا اظہار صفوت کے یہاں کچھ اس طرح ہوا ہے ع

مثل یوسف آپ صفوت ہوں گے بھی معصوم اگر
تو بھی پیچھے سے لگائی جائے گی تہمت ضرور

اس شعر میں تہمت کا پیچھے لگایا جانا کافی دلاویز اور معنویت سے بھرپور ہے

آخر میں اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ کلام صفوت میں جو پاکیزگی اور رعنائی ہے وہ ان کے خلوص اور معاصی سے بچتے رہنے کی ان کے دل کی پکار اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔راقم اپنی اس مختصری تحریر کو صفوت ہی کے مقولہ ذیل شعر پر ختم کرتا ہے۔ ع

رسولوں کا بھی تھوڑا خون جیسے اس میں بہتا ہو
ہو جس میں فسق ہرگز کام صفوت کر نہیں سکتا

حادثۂ غم

حماد خاور (نیوارک)

جناب ماسون ایمن اردو شاعری میں منفرد مقام کے حامل اپنے شاعر ہیں جنھیں غزل، نظم اور رباعی میں ایک طرح سے یکتائی کا مقام حاصل ہے۔ برصغیر انڈو پاک کے علاوہ سمندر پار اردو کی نئی بستیوں میں جناب ماسون ایمن اپنے مقام پر فائز ہیں جو اساتذہ اور ناصحین کو حاصل ہوا کرتا ہے۔ گذشتہ دنوں جناب ماسون ایمن ایک بڑے صدمے سے دوچار ہوئے۔ آپ کے والد محترم علامہ ہارون رشید لاہور میں انتقال کر گئے۔ علامہ ہارون رشید نہ صرف اعلیٰ پائے کے عروض داں اور اعلیٰ علمی و ادبی حیثیت کے حامل بڑے شاعر تھے بلکہ ادبی انجمن اور ادبی سکول آف تھاٹ کے بلند مرتبے پر فائز تھے۔ آپ کے شاگردانِ سخن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ آپ کی اردو، فارسی اور اسلامیات کی چوبیس کتب سندھ، پنجاب اور سرحد میں بطور ٹیکسٹ بک شامل نصاب ہے۔

علامہ ہارون الرشید ارشد (مرحوم)

18 جنوری 1917ء کو الہ آباد (یوپی) کے ایک گاؤں میں پیدا ہونے والے ہونہار بچے کو والدین نے ہارون الرشید کا نام دیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے اور بعد میں دہلی سے حاصل کی۔ پاکستان کی تحریک شروع ہوئی تو آپ مسلم لیگ سے وابستہ ہو گئے۔ مسلم لیگ دہلی کے جنرل سیکرٹری رہے۔ پاکستان بنا تو آپ اپنے والدین کے ہمراہ دہلی سے لاہور آ گئے۔ یہاں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل، مولوی فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کر کے خود کو "علامہ" لکھنے کا حقدار بنایا۔ یوں آپ کا شمار اردو، فارسی اور عربی کے مستند لوگوں میں ہونے لگا۔ اس کے بعد لاہور میں ہی آپ درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے اور پھر ساری زندگی اسی شعبہ سے لو لگائی رکھی۔ دوران درس و تدریس آپ نے چوبیس کے قریب ٹیکسٹ بکس لکھیں جو آج بھی پنجاب اور سندھ کے سکولوں میں پڑھائی جا رہی ہیں۔ شمالی امریکہ کی معروف شاعرہ محترمہ ڈاکٹر صبیحہ صبا کے بقول انہوں نے فارسی علامہ صاحب کی ٹیکسٹ بکس پڑھ کر سیکھی۔ لاہور آنے سے پہلے علامہ صاحب نے مدرسہ رحمانیہ دہلی سے درس نظامیہ ختم کیا جس کے بعد آپ باقاعدہ مولوی بھی تھے اور حکیم بھی۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ اردو کے معروف شاعر جناب راغب مرادآبادی کے بقول علامہ صاحب بیس برس کی عمر میں ہی اپنی قابلیت اور علم کی بنیاد پر علامہ مشہور ہو گئے تھے۔ 1980ء میں علامہ صاحب امریکہ آ گئے آپ امریکن شہری تھے۔ پھر اسکے بعد آپکا امریکا اور پاکستان آنا جانا لگا رہا۔ امریکہ میں آ کر آپکا زیادہ وقت نیویارک میں گزرا۔ یہاں کی ادبی محفلوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے رہے۔ بہت سے استاد شعراء ان سے اصلاح لیتے تھے۔ علامہ صاحب بذات خود غزل کے بہت عمدہ اور استاد شاعر تھے۔ علم عروض پر عبور حاصل تھا۔ مشاعروں میں کلام ترنم سے سناتے اور انکا منفرد ترنم انکی پہچان تھا۔ علامہ صاحب محفل کی جان تھے۔ جہاں جاتے محفل لگا دیتے۔ اپنے بے پناہ علم اور تجربے کی وجہ سے کسی کو محفل میں بولنے کی جرات نہ ہوتی۔ علامہ صاحب کی انتہائی شفیق اور بردبار طبیعت کے مالک تھے۔ بہر حال میں خوش رہتے، کسی سے شکایت نہ کرتے۔ سینئر ترین شاعر ہوتے ہوئے بھی جونیئر شعراء کی صدارت اور سازشوں میں ملوث نہ تھے۔ آپ کا کوئی گروپ نہ تھا۔ جو دعوت دیتا آپ وہیں چلے جاتے۔ علامہ صاحب صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔

ذاتی زندگی میں علامہ صاحب باقاعدہ پہلوانی بھی کرتے رہے اور لاٹھی چلانا بھی خوب جانتے تھے۔ کھانے میں آلو گوشت اور بریانی شوق سے کھاتے تھے۔ کرتا پاجامہ آپکا پسندیدہ لباس تھا۔ موسیقی سے خاصا لگاؤ تھا۔ خود بھی ترنم میں کلام سناتے اور اچھا کلام اچھی ترنم میں سننا پسند بھی کرتے تھے۔ سیاست میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ آپ جنرل ضیاء الحق کے دلدادہ تھے۔ علامہ صاحب کو ڈھاکہ کھو جانے کا بے حد افسوس تھا اور وہ اسے خود غرض اور ناعاقبت اندیش سیاستدانوں کی نا اہلی قرار دیتے تھے۔ 1942ء میں دہلی میں عیسائی چرچ میں آگ لگ گئی۔ علامہ صاحب نے دوسروں کیساتھ مل کر اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر بہت ساروں کی جانیں بچائیں۔ اس پر آپکو اسوقت کا انڈیا کا سب سے بڑا اسولین ایوارڈ بمعہ گولڈ میڈل ملا جو آج بھی علامہ صاحب کے لواحقین کے پاس محفوظ ہے۔ علامہ صاحب مٹھائیوں کے بے حد رسیا تھے اسی لئے شاید شریں زبان تھے۔ علامہ صاحب نے آبشار کرم (نعتیہ کلام) اور آبشار غزل (غزلیات) لکھیں اور اسکے بعد انکی آخری کتاب نعتیہ کلام تھا جس میں انہوں نے صنعت غیر منقوطہ (بغیر نقطے کے) میں نعتیں کہیں۔ جو ایک بہت بڑا اعزاز اور فن ہے۔ اس میں انہوں نے اپنا تخلص ارشد کی بجائے احمد استعمال کیا۔ علامہ صاحب 26 اگست 2007ء کو تقریباً 90 برس کی عمر میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان للہ وان علیہ راجعون

علامہ صاحب کی صرف ایک شادی تھی اور اللہ تعالیٰ نے آپکو گیارہ بچوں سے نوازا تھا۔ جن کو انکے بڑے بیٹے شمالی امریکہ کے بابائے اردو، معروف شاعر، ادیب اور استاد ماسون ایمن نے انتہائی احترام و اہتمام کے ساتھ جلایا ہوا ہے۔ اور کون نہیں جانتا کہ علامہ صاحب کی بہو اور ماسون صاحب کی شریک حیات محترمہ شائستہ ایمن افسانے اور ناول لکھ کر اردو ادب کی خدمت سرانجام دے رہی ہیں۔

علامہ صاحب کے متعلق انکے چند ہم عصروں کی رائے آپکی خدمت میں حاضر ہے۔ نیویارک میں سالانہ نعتیہ مشاعروں کے بانی اور معروف بزرگ شاعر جناب صلاح الدین ناصر کے مطابق علامہ صاحب تمام عمر درس و تدریس سے منسلک رہے شاعری میں بھی انہیں کمال فن حاصل تھا۔ وہ فن عروض کے استاد تھے۔ غزل کے علاوہ حمد و نعت کہتے تھے اور صنعت غیر منقوطہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ عربی اور فارسی زبان و فن پر بھی دسترس تھی۔ محبت و شفقت سے پیش آتے تھے کہ اجنبیت کا احساس ختم ہو جاتا تھا۔ انکی وفات سے اردو ادب ایک مخلص استاد اور عظیم شاعر سے محروم ہو گیا۔ نیویارک کے ایک اور معروف شاعر اور کالمسٹ ڈاکٹر صفوت علی صفوت کے مطابق علامہ صاحب بہت ہی منجھے ہوئے شاعر تھے اور انکو شاعری کی باریکیوں کا نہ صرف علم تھا بلکہ اس پر مکمل عبور بھی تھا۔ میں ذاتی طور پر انہیں اساتذہ میں شمار کرتا ہوں۔ وہ دنیا بھر میں مشہور تھے۔ اپنے فن کے ماہر تھے۔ شفیق انسان تھے۔ وہ غزل کے بہترین شاعر تھے۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ مزاح نگار جناب خالد عرفان کے مطابق علامہ صاحب ایک علم و ادب کا چلتا پھرتا خزانہ تھے۔ انکا لہجہ استادانہ اور مشفقانہ تھا۔

☆☆☆☆

"چہارسُو"

معبود کے در پر

ستیہ پال (ستی پا)

ایک ہی موضوع پر دو نظمیں

آرتی

اس برس بھی وہ کھڑی تھی گھر کی چوکھٹ پہ
ہمیشہ کی طرح ہی آج کے دن!
تھال میں گھی کا دیا، صندل، سگندھی عود اور لوبان بھی تھے
اک اگر بتی سے ہلکی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی
زعفراں کی چٹیاں، سیندھور، "نوکھنڈ"۔۔
آرتی کے سب لوازم تھال میں تھے
گیلی دھوتی گورے گدرائے ہوئے انگوں سے
یوں چپکی ہوئی تھی، جسم کا حصہ ہو جیسے
گنگا میا کا یہی وردان تھا۔ اشنان کر کے
ہر برس معبود کے در پر پہنچ کر آرتی اس کی اتارے

ایک دستک

اور پھر جیسے کوئی اندر کھڑا ہی منتظر تھا۔ کھل گئے در
کوئی اس کے سامنے تھا!
اس کی نظریں پاؤں سے اوپر اٹھیں
چہرے پہ اک لمحے کو ٹھہریں۔ اور پھر
پیروں پہ ہی مرکوز ہو کر رک گئیں ۔۔۔۔
سیندھور، صندل، عود اور لوبان۔ "نوکھنڈ"
آرتی معبود کے چرنوں کی تھی، ٹیکا لگایا
آرتی پوری ہوئی تو
اس نے پھر اک بار اوپر دیکھ کر نظریں جھکا لیں
"آؤ، سواگت ہے تمہارا !
پر پجارن ساری سامگری کو چوکھٹ پہ ہی رکھ کر
اور خالی تھال کو ہاتھوں میں لے کر
الٹے پاؤں لوٹ کر گنگا کنارے جا رہی تھی !

رباعیات

عبدالعزیز خالدؔ (لاہور)

(1)

چہرہ ہے ترا حسرتِ خوبانِ جہاں
دیکھے جو اسے رہے وہ پہروں حیراں
ہے فرو فروغ اس کا کہیں ان سے زیادہ
کیوں ہوں نہ پریدہ رنگ لعل و مرجاں!

(2)

کس نازش و تمکیں سے یہ بات اس نے کہی
"میں آپ کی عاشق بھی ہوں معشوق بھی
اب اور کسی سے نہ بڑھانا ملت
اب اور کسی کو جگہ دینا نہ مری!"

(3)

میں نے جو کیا تھا اس صنم سے وعدہ
امکانی حد تک کبھی اس سے نہ پھرا
ہر چند بہت سوں سے رہ و رسم رہی
اک در سے مگر کسی کو بڑھنے نہ دیا!

(4)

جو شوخ مجھے "حبیب جاں" کہتی تھی
دیکھے ہوئے اس کو ایک مدت گزری
قائم ہے وہ اپنے عہدِ پارینہ پر ؟
یاد اس کو ہے وہ قدیم القاب اب بھی؟

(5)

عالم کا لقب علم فروشوں کو نہ دو
صوفی کا خطاب عیش کوشوں کو نہ دو
حکام اسی کو خود فروشی سمجھو
سررشتۂ کار خرقہ پوشوں کو نہ دو!

(6)

ہم کو نہیں ذوقِ عیب افسردہ
ہوتے نہیں منت کشِ رطل و کاسہ
کرنے دے گرانی نہ غمِ دوراں کر
کیا چیز ہے صہبائے سخن کا نشہ!

(7)

جس سانس میں ہے بقا اسی میں ہے فنا
ہے جس جگہ ہاؤ ہو وہیں آہ و بکا
جس مالا بھی وہی وہی طوقِ گلو
امرت قاری وہی وہی وِش کنیا !

(8)

کم ہو گا کوئی جاہلِ اجہل مجھ سا
یعنی مصداق : "تجہل استقارا !"
دل کو وجو منور کرے وہ نور ہے علم
لیکن مرے دل کا جھٹپٹا چھٹ نہ سکا !

ندا فاضلی (ممبئی' بھارت)

ابھی کچھ اور قصہ ہے

نہیں! اٹھو
ابھی پردہ نہیں کھینچو
ڈرامہ ختم ہونے میں ابھی کچھ سین باقی ہیں
یہاں تک تو
وہ مجرم ہے جو سولی پر لٹکتا ہے
یہاں تک تو
بدن ہے وہ
جو کیلوں سے کسکتا ہے
یہاں تک تو وہ غم ہے
ماں کی آنکھوں سے چھلکتا ہے
جواب تک ہو چکا ہے
کھیل کا وہ ایک حصہ ہے
یہاں سے آگے
جو لکھا ہے وہ کچھ اور قصہ ہے
تماشے کو تماشائی
یہیں گر چھوڑ بیٹھیں گے
جو رشتہ موت کا جیون سے ہے
وہ توڑ بیٹھیں گے

نوکیلا پتھر

گلی کے موڑ کا نوکیلا پتھر
لیے بیٹھا ہے جو ٹھوکر پہ ٹھوکر
سپاہی ہو
کہ شاعر
یا قلندر
گزرتے ہیں سبھی اب اس سے بچ کر
سبھی محفوظ راہوں کے ہیں خوگر
ہر اک گنتی ہیں
جو کم ہیں بہتر
انہیں کی آنکھوں میں
دیکھا ہے اکثر
گلی کے موڑ کا نوکیلا پتھر
جہاں پہلے تھا
ہے اب بھی وہیں پر

روحِ قائد کا پیغام

غالب عرفان (کراچی)

اگر یہ سچ ہے کہ میں نے تم کو شعور بخشا صدی کی طویل راہوں کی بے بسی کے کسی
دوراہے پہ میں ملا تھا ! تو یہ بھی سچ ہے '
خلوص و مہر و وفا کی تابندہ روشنی کا وہ طور بھی وہیں کھڑا تھا' جہاں کی روشن شفیق کرنوں کی ہر
کرن نے دلوں میں جذبے جگائے رکھے!
محبتوں کے سہانے سپنے سجائے رکھے!
یگانگی کی مہکتی خوشبو نفس نفس میں بسائے رکھی تو پھر یہ نفرت کی شعلگی کیوں؟
یہ کیسی وحشت ہے' کیا جنوں ہے!
یہ لاش کیسی؟ یہ کس کا خوں ہے! یہ کیسے نیرو کی بانسری تم بجا رہے ہو؟
اے میرے اہلِ وطن بتاؤ؟؟
کہ آج تم پھر کہاں کھڑے ہو؟
خود اپنا تم احتساب کر لو!
تمہاری تاریخ ہر قدم پر تمہارا ماضی دکھا رہی ہے مقامِ حیرت ہے' تم نے اب تک بھی کچھ
نہ سیکھا میں کیا کہوں تم سے' کیا بتاؤں؟
کہ میری محنت کے اس ثمر کو تمہارے قول و عمل کی دنیا نے کس بلندی سے کیسی پستی میں لا
کے پھینکا! وہ کون سا مرحلہ تھا پھر وہ کیسی بے نور ساعتیں تھیں جہاں پہ رک کر تمہارے
راہبر' مر تے دکھائے گئے سفر کو تیار کر کے منحرف ہوئے تھے' کہاں سے نکلے کہاں کی
گمراہیوں میں پھنستے چلے گئے ہو؟
یہ آج اپنی عقیدتوں کی جبیں پہ چسپاں عداوتوں کے نشان کیسے؟
تم اپنی تاریخ کے ورق در ورق ٹٹولو!
یہ آخری بات میری سن لو!
اگر تمہاری زمیں پہ ناحق لہو کی ایک بوند بھی گری ہے' اگر تمہاری نظر میں لی رفاقتوں کا سفر
نہیں ہے!
تو پھر وطن کی کوئی گلی معتبر نہیں ہے !!

وقت کی صلیب

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہؔ (دلی بھارت)

جب ذرا ان کی توجہ میں کمی پاتا ہے تو
مضطرب، افسردہ خاطر سا نظر آتا ہے تو

گوشہ نشیں ہونے پہ بھی، سوچتا رہتا ہے تو
کوئی تو آ جائے ملنے، آرزو کرتا ہے تو

لب و لہجے کا توازن، دیتا نہو، دل کا ساتھ
رنجشِ پنہاں کی رگ رگ میں اتر جاتا ہے تو

جن سے راہ و رسم تھی، ہو لئے موسم کے ساتھ
طوطا چشموں کے شہر میں، اجنبی لگتا ہے تو

اولاً فرصت کسے، اب دے تمہیں کوئی صدا
مصلحتاً آواز دے، مخلص پہچانتا ہے تو

دوریاں اپنوں کی جب دلکو ستاتی ہیں بہت
تارے پلکوں پہ سجا کر، سسکیاں بھرتا ہے تو

بھسم ہو جائے اگر باقی ہے کوئی تشنگی
جاں میں اِک الاؤ سا بپا رکھتا ہے تو

تنکوں کی مانند بکھرے، تیرے سب لختِ جگر
برگِ آوارہ کی صورت، در بدر پھرتا ہے تو

کون جانے ترے دکھ؟ دمساز بھی تیرا نہیں
لمحوں کاوش پیتا ہے، زندگی کرتا ہے تو

گم ہوں گے، زندگی میں، ہجرتوں کے سلسلے
رحم و کرم پہ دوستوں کے بس جئے جاتا ہے تو

زندگی ترے لئے ہے صورتِ آوارہ وطن
وقت کی صلیب پہ تشنہ ٹنگا رہتا ہے تو

ان گنت شکوے، گلے، نامختتم ہیں رنجشیں
زندگانی بانٹتا تھا، موت برساتا ہے تو

جب تعلق میں نہو، تشنہؔ ذرا بھی اپنا پن
کس سے پھر رشتوں کی کڑیاں جوڑتا ہے تو

ایک شام

قیصر نجفی (لاہور)

وہ شام آج بھی رہ رہ کے یاد آتی ہے
جو اتفاق سے گزری تھی تیرے ساتھ کبھی
میں جس کو اپنے تصور میں چھو نہ سکتا تھا
وہ تیرے قرب کا دامن تھا میرے ہاتھ میں

وہ شام اور وہ ماحول ذہن میں ہے ابھی
تو میرے سامنے جب پہلی بار آئی تھی
بکھر بکھر سا گیا تھا میں تیرے قدموں میں
سمٹ کے تو مرے احساس میں سمائی تھی

وہ شام اور وہ منظر ہے اب بھی آنکھوں میں
نظر میں جب ترے رخ کا گلاب مہکا تھا
فلک پہ چاند بھی گو مسکرا رہا تھا مگر
فضا میں تیرے تبسم کا نور پھیلا تھا

میں سوچتا ہوں کہ تو بھی سوچتی ہو گی
میں تیری بزم میں شامل تھا کس تعلق سے
کسی کو دیکھتی تھی جب تو بے خیالی میں
تری نگاہ میں حائل تھا کس تعلق سے

تجھے تو یاد بھی شائد نہ ہو وہ شام مگر
مری حیات کا سرمایہ بن گئی وہ شام
تھکن دلوں کی اترتی ہے چھاؤں میں جس کی
شجر مرے لئے اک ایسا بن گئی وہ شام

علوم کا بحرِ بیکراں

رفعت سروش (نوئیڈا بھارت)

ہیں میرے محسن ' محمد ایوب ' واقف ِ رمزِ حرف و معنی
ادیب ایسے کہ جن کے دم سے وقارِ حسنِ بیان ، یعنی

علوم کا بحرِ بیکراں ہیں ' وہ فکر و دانش کا آسماں ہیں
شعور کی موجِ رواں ہیں ، قلم کی عظمت کے ترجماں ہیں

سخن شناسوں میں فرد واحد' سخن وری میں کما ل ان کو
خدا نے بخشا ہے شرقیت کی رفعتوں کا جمال ان کو

قدیم اندازِ فکر و فن کو جدید سے ہمکنار کر کے
ہوے ہیں ممتاز نا قدوں میں ، روش نئی اختیار کر کے

ادب کا منبع ہے ان کے نزدیک باطنی چشمۂ معانی
جو طبعِ فنکار ہے فروزاں ' تو حرف ترسیل میں روانی

وہی ادب ہے جو روحِ انساں کو عزت و افتخار بخشے
سرور بخشے ، سکون بخشے، دل و نظر کو قرار بخشے

وہی ہے سچا ادیب و فنکار' آدمیت ہو جس پہ نازاں
جناب ِ واقف ہیں میرے نزدیک خوش بیاں' حق پرست انساں

مسافرِ منزلِ خودی ہیں' سفر تھا بیساں سے بمبئی تک
مگر دیارِ حرم میں پہنچے مقامِ عرفان و آگہی تک

بہت ہی سادہ مزاج ہیں وہ' سلامت انکے بیان میں ہے
دقیق معنی فصیح لہجہ' لطافت انکی زبان میں ہے

بہت لکھا ہے بہت لکھیں گے' قلم ابھی تو رواں رواں ہے
ہر ایک تحریر میں تجسس' کہ منزلِ آدمی کہاں ہے

وہ میرے ممدوح' میرے محسن' بیاں نہیں ہے یہ شاعرانہ
سروش وہ دل میں جاگزیں ہیں' مگر تعارف ہے غائبانہ

"مبارک ہو"

محمد سالم (امریکہ)

(مناظر عاشق ہرگانوی کے نام

سو کتاب مکمل ہونے پر)

رقم اب کیوں نہیں کرتے روایت کے مناقب آپ
نئی تھیوری کی خاطر کیا' ہوئے ہیں اس کے غاصب آپ

ادب میں ہر طرح کے تجربے پر' کی ثنا خوانی
مخالف ہوں ہوائیں بھی تو ان کے ہیں مناسب آپ

دیارِ غیر سے آواز دے دے کر پریشاں تھا
بنا کر گھر کو صحرا سا کہاں صاحب تھے غائب آپ

مبارک ہو کہ اب مالک ہوئے ہیں سو کتابوں کے
نمایاں ہو گئے ہیں نکتہ داں حلقوں میں صاحب آپ

اجاگر کرتے تھے پہلے مضامین محاسن کو
سمجھا دیتے ہیں لیکن اب متانت سے معائب آپ

اچھالی ہے قلم کی نوک سے جن جن کی پگڑی کو
مگر باندھیں گے ان ہی کو امامہ ہو کے نائب آپ

دکھایا ہے تماشہ بن کا اہل علم کو ، لیکن
تصوف کا کرشمہ دیکھئے ہو کر مراقب آپ

غزل شانِ مناظر میں ہے سالم کی یہ کیا کہنا
گذارش ہے عوض میں اب نہ ہوں اس کے محاسب آپ

آج وہ آفتابِ سخن ڈوب گیا

حمیدہ معین رضوی (نجمی آپا کے لئے ایک نظم)

رات میں سونہ سکی، دل تھا پریشاں بہت،
آخرش اٹھ گئی بستر سے، دریچے سے جو باہر دیکھا
چارسو سوکھے ہوئے پتے اڑے پھرتے تھے
جیسے روحیں ہیں، نکل آئی ہیں سب قبروں سے ۔
چاندآ زردہ بیار زمیں نم آلود، رات کی الجھی پریشاں زلفیں
کارواں سایوں کے تھے جنکی معیت میں رواں
گریہ کناں،
بین یہ پچھوا ہوا پھرتی تھی شاخوں پہ لئے ۔
کبھی چمنی سے تھی ٹکراتی الجھتی تھی درختوں سے کبھی
پھوڑتی سرتھی، دریچوں سے کبھی، در سے کبھی ۔
ان ہیولوں بھرے منظر کے سبب، دھند آنکھوں میں
مری بھرآئی
اوڑھنی بھیگ گئی۔
شہر دل میں ہوا تھا سانحہ لوگو: سرشام
جس سے بےخواب وپریشان یہ شب، غم سے نکھرآئی ہے۔
جب سنی یہ خبر بد مجھے محسوس ہوا،
کشتی جان مری، دوب گئی درد کے طوفانوں میں
دشت خاموشی کے اس پار میں آنکھیں گاڑے، ڈھونڈ
رہی ہوں اس کو۔
پیشوا فن کی جو تھی ۔کوئی کہتا تھا کہیں ۔
" آج وہ آفتاب سخن ڈوب گیا"

آہ راجارسالوجی!

یونس صابر (کولڈ میڈلسٹ تحریک پاکستان)

ر رائٹر گلڈ آف پاکستان کے

ا آہ! راجا جی بھی آخر چل بسے

ج جب تلک راجارسالوجی یہاں جیتے رہے

ا اردو اور ماں بولی پنجابی کی خدمت ہی رہاان کا مشن

ر رہنما اہلِ قلم، راجارسالوجی تھے خود میں انجمن

س سن کے رحلت کی خبر سارا پشاور رو دیا!

ا آپ ہندکو کانفرنس کے اک مہمان خصوصی تھے ابھی
بھولا نہیں

ل لاہور میں جب آپ نے مجلس میں مجھ ناچیز کو ویلکم کہا

و وہ کہ اب شہر خموشاں میں کہیں آباد ہیں پر
،وطن کو ان کے زریں کارنامے یاد ہیں!!

ممکنات

پروفیسر خیال آفاقی (کراچی)

اس سے پہلے کہ عالم کن میں
آفتابِ حیات ڈھل جائے
شام ہو جائے
اور اس کے بعد
وقت کے طاق پہ رکھے ہوئے شباب کی لو
دھیمی پڑ جائے اور بجھ جائے،
ایک لمحہ نکال کر اپنے
روز و شب کی ہزار باتوں سے
سوچنا، ''کیا کہیں وہ میں تو نہیں''؟
جس کو آواز دے رہا ہے کوئی
جس کی سانسوں کو سن رہا ہے کوئی
جس کے لمحوں کو گن رہا ہے کوئی
اس سے پہلے کہ بند ہو جائے
لمحہ لمحہ بپہ رقص کرتی ہوئی
دھڑکنوں کو شمار کرتی ہوئی
وہ گھڑی کہ جو ایک مدت سے
چلتی آئی ہے، چل رہی ہے ابھی
ایک ہندسے پہ آ کے رک جائے
پرچم زندگی ہی جھک جائے
تو اسے اپنا جان لے جاناں
اپنی گھڑی سنبھال لے جاناں
اپنی پونجی لپیٹ لے جاناں
اس سے پہلے کہ عالم کن میں
آفتابِ حیات ڈھل جائے
شام ہو جائے
رات ہو جائے۔

حسرت ناکام

ممتاز احمد (برمنگھم)

سوچا تھا کچھ لوگ ہمیں بھی
غالب سا فنکار کہیں گے

طے کر کے بالآخر اک دن
فن کی وادی میں جا نکلے

راستے میں دو حور شمائل
پریوں جیسی دلکش رعنا

نظم و نثر دو جڑواں بہنیں
ہنستی گاتی پاس سے گزریں

دل نے کہا کہ نظم ہے بہتر
پیاری نثر بھی کچھ کم نہ تھی

ہم نے کہا کہ خوب ہیں دونوں
ہر دو بہتر اپنی جگہ پہ

دونوں ہی کے عاشق ہو کر
ہر دو کو ہم دل دے بیٹھے

جب سے انوکھا پیار ہوا تھا
جینا تک دشوار ہوا تھا

دونوں کے ہم ناز اٹھاتے
دل کا کہنا کہہ نہ پاتے

آخر ہم نے قلم کو توڑا
لٹھ سے ہم نے رشتہ جوڑا

یوں پھر ہم نے بدلا کانٹا
ایک کو چیٹا ایک کو ڈانٹا

تب سے ہی مغرور ہیں دونوں
جانے کہاں مستور ہیں دونوں

اب ہم ہنستے نہ روتے ہیں
لمبی تان کے ہم سوتے ہیں

دوہے

بھگوانداس اعجاز (دلی بھارت)

ہم بھی اس جا ، جا بسے، بسے تو پھر پچھتائے
گھسیارا جس گاؤں میں، پنڈت جی کہلائے

جگہ جوتیوں میں ملی ، ہوا خوب ستکار
سچ ہے اندھوں نے چنا ، ہم کو راج کمار

چڑھ گیا بندر بانس پہ، چڑھا کریلا نیم
گاؤں پتا تو شہر میں ، پہنچا نیم حکیم

کوٹھے سے سو بہ کتیں ، سکھ آنند اسیم
نیا پالیہ، تھانہ چلے ، پلتے نیم حکیم

شاطر پلا کاٹھ کا ، اور اس پہ فسکوش
گھنٹی بلی کے گلے، چلا باندھے موش

مٹھی میں کرنے چلے ، ہم سارا آکاش
چڑھے تو ڈھائی سیڑھیاں، اترے پاؤں پچاس

یہی واہمہ دے گا دل کو گہرا گھاؤ
ہم بلتے بازار میں گگن چومتے بھاؤ

پوچھا تو ہنسنے لگے، خود کو رہے ٹٹول
سبھی کھلونے جانتے، اپنا اپنا مول

ہائیکو

انوار فیروز (راولپنڈی)

زیست ہے ایسا گھر
جس میں اک دیوار تو ہے
کوئی نہیں ہے در

کب سے ہوکا تھا
اسی نے بیچے بیج دیے
اور وہ کیا کرتا؟

کیا یہ
اسی نے ہنس کے دیکھا تھا
دل میں کھلے گلاب

مری کی تھی وہ شام
میں نے پیڑ پہ لکھا تھا
جاناں تیرا نام

سدا سہنے ہیں غم
لیکن یہ ہے فخر مجھے
بیچا نہیں قلم

میں ہوں بہت اداس
دور ہوں دل سے سارے غم
تُو آجا میرے پاس

'' میرے خدا ''

علی آذر (کراچی)

وہ شہر کے اک مال میں کھڑا ہوا
شکستہ دل، شکستہ پا
نہ جانے کیسے وہ وہاں پہنچ گیا
ہر ایک سمت روشنی کے قمقموں کے ضوفشانیاں
ہر ایک سو تھا خوشبوؤں کا کارواں
چمکتے اور دمکتے کپڑوں میں سجی
وہ ناریاں
تمام ہاتھوں میں لدی ہوئیں
نہ جانے کتنی قیمتی وہ تھیلیاں
اور مال کا وہ ریستوراں
جہاں پہ کام و دہن کی
ہر ایک لذتو جہاں
نئی نئی ڈیشیں وہاں
اور جیبوں سے نکلتی تازہ تازہ نوٹوں کی وہ گڈیاں
وہ باہر آیا مال سے
تو ساڑیاں
سواریاں
دو گھنٹوں میں وہ در در کی سواری
بس میں دھکے کھاتے کھاتے گھر پہنچ گیا
کہ جس میں ٹین کی چادریں
اور انتظار کا سماں
بچھا ہوا وہ دسترخواں
پھٹا ہوا، گلا ہوا
جو اپنے حالِ زار پر خجل خجل
بجھا بجھا
اور جسکے پاس چھوٹے چھوٹے بچے انتظار میں
کہ باپ دودھ لائے گا
کہ باپ کھانا لائے گا
اور ایک کونے میں پڑی ہوئی
مری ہوئی
وہ،
بوڑھیا
حرارت انہیں بھی تو آ گئی
دوائی بھی تو آئے گی
مگر ان خالی ہاتھوں میں ندامتوں کی کرچیاں
مرے خدا !
مرے خدا !

تخلیقِ عصر تازہ تصانیف کا تعارف عطیہ سکندر علی

میرے اندر ایک سمندر

''ستیہ پال آنند کی نظموں کا ایک اہم وصف یہ ہے کہ ان میں شاعر نے اساطیر یا مثالی حکایات یعنی PRABLES کو از سر نو خلق کیا ہے۔ شاعری میں محض اساطیر یا مثالی حکایات کا حوالہ دینے سے بات نہیں بنتی۔ اس سے شاعر کے مطالعے کی وسعت کا اندازہ تو ہو جاتا ہے لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ اس حوالے کو اپنے تجربے کا حصہ بھی بنا سکا ہے کہ نہیں۔ ستیہ پال آنند نے جب اساطیر اور مثالی حکایات کی تخلیق نو کی ہے تو انہیں اپنے شعری تجربے کے مدار میں لا کر ان کی قلب ماہیت پر انگلی رکھ دی ہے اور یوں اپنی نظم میں لطیف ابعاد کا اضافہ کر دیا ہے مگر ستیہ پال آنند نے اس عمل سے ہٹ کر اپنے باطن کے اس منطقے کو بھی مس کیا ہے جو META-MYTH کا دیا ہے یعنی جہاں اساطیر اور مثالی حکایات کی لانگ گرامر یا سسٹم موجود ہے ایسا کر کے ستیہ پال آنند نے مرتب فکشن سے استفادہ کر لیا اس کی تخلیق نو کے تجربے سے گذرنے کے علاوہ اپنے طور پر بھی نئی فکشن کی تخلیق کی ہے جو ابھر کی ان کتر نوں کی صورت میں ان کے شعری اسلوب میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ جن سے خود اساطیر اور مثالی حکایات مرتب ہوئی تھیں۔ اس عمل نے ان کے شعری متن کے معیار کو بہت بلند کر دیا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ ستیہ پال آنند جدید اردو نظم کے ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے بہت آگے آ چکے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ زندہ رہنے والی نظمیں تخلیق کرنے کے علاوہ انھوں نے جدید اردو نظم کے پرت کھولنے اور قاری کو نظم کے چھپے ہوئے ابعاد سے آشنا ہونے کی تربیت بھی دی ہے۔ اردو دنیا کو نظم فہمی کی تربیت مہیا کر کے ستیہ پال آنند نے ایک اہم خدمت انجام دی ہے.....'' ڈاکٹر وزیر آغا

ایک بڑے آفتاب نے دوسرے عظیم ماہتاب کو جس فراخدلی اور بلند آہنگی سے خراجِ تحسین پیش کیا ہے اس کے بعد ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی تازہ تخلیق 'میرے اندر ایک سمندر' پر کوئی کم علم اور بے خبر انسان ہی لب کشائی کی جراءت کر سکتا ہے۔ البتہ اس جانب اپنے قاری کی توجہ دلانا انتہائی ضروری ہے کہ انگریزی اور ہندی جیسی وسیع امکانات کی حامل زبانوں میں مہارت اور شناخت کے حامل ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے جس طور اردو زبان اور اردو ادب کو زندگی کا حصہ بنایا ہے اس کے لئے ڈاکٹر صاحب محترم کی خدمت میں ہر طرح کے انعامات اور اعزازات پیش کرنے سے بھی حق ادا نہیں ہوتا۔

ایک اور خوبی ایک اور وصف ایک اور روشن مثال ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی وسیع المشربی ہے۔ آپ دنیا کے تمام مذاہب مسالک اور عقیدوں کا احترام صدقِ دل سے کرنے کے ساتھ بنی نوع انسان کے لئے بھی اپنے دل میں بے پناہ محبت رکھتے ہیں، جس کی مثال ڈاکٹر صاحب کی تازہ تخلیق ''میرے اندر ایک سمندر'' میں شامل مندرجہ بالا نظموں سے دی جا سکتی ہے۔ یا بھی رشتہ' بے گھری' گورکون ہے' انا للہ وانا الیہ راجعون' جناب والا' خود کو میں کیسے پہچانوں' مجاز مرسل کی حد کہاں ہے' معجزے کیا اب نہیں ہوتے' پیغام رساں' سرمہ اور سرکہ' یہ ابولہول زمانے بھر کے۔

اگر آپ اپنے دل میں تڑپ' اپنے دماغ میں نئے جہانوں کا اشتیاق اور اپنے خون میں حرارت کی آرزو رکھتے ہیں تو آپ کو اولین فرصت میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی تازہ شعری تخلیق ''میرے اندر ایک سمندر'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جس کے لئے آپ کو ''جلی شرز اینڈ ایڈوٹائزرس F-14/21-D' کرشن نگر' دہلی' بھارت سے رجوع کرنا ہوگا جہاں فقط دو صد ہندوستانی روپوں کے عوض جدید نظم کا ایک جہانِ معنی آپ کا منتظر ہے۔

ادراک

ڈاکٹر محمد علی صدیقی علم و آگاہی اور فکر و تدبر کے ایسے مقامِ جلیلہ پر فائز ہو چکے ہیں جس کی آرزو' امید' جستجو اور لگن میں عمریں گذر جایا کرتی ہیں۔ یہ مقامِ اعتبار' یہ مرتبہ رفیع جلیل اور یہ ہنر دلعزیزی بہت ہی کڑے امتحان اور سخت میدانوں بلکہ صحرا اور ویرانوں کی خاک چھاننے کے بعد ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی شخصیت کا حصہ بنے ہیں۔ اپنی آواز کو آپ کی آواز سے ہم آہنگ کرنے کے شوق میں دو بڑے اہل قلم' اہل علم اور اہل بصیرت کو شریک محفل کر رہے ہیں۔

''جدید ترقی پسند نقادوں میں محمد علی صدیقی سب سے زیادہ ELOQUENT ہیں۔ ان کی آواز ہمارے معاشرے کی ترقی پسند آواز ہے۔ انھیں ہمارے فکری اور ادبی حلقوں میں جو اعتبار حاصل ہے وہ آج کسی اور نقاد کو حاصل نہیں ہے.....'' قمر جمیل

''جدید ترقی پسند نقادوں میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔ مغربی ادبیات تک ان کی رسائی کے علاوہ جدید تحریکوں کے حوالے سے بھی ان کے ہاں تعمق نگاہی موجود ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی لسانیات کا گہرا مطالعہ اور شعور رکھنے کے ساتھ سماجی علوم کے بارے میں بھی وسعتِ علم کے حامل ہیں.....'' ڈاکٹر انوار احمد

اب ذرا اس اقتباس پر توجہ فرمایئے جو ''ادراک'' میں شامل حرفِ چند کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب محترم نے رقم کیا ہے۔

''میرا ادبی نظریہ جدلیاتی ہے اور وہ متضاد نظریات کی بہتر اور زیادہ قابلِ قبول صداقت تک رسائی کو ضروری خیال کرتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ میں مشاہدۂ مطالعہ اور استقرائی منطق سے زیادہ متاثر رہا ہوں۔ ہر چند استقرائی منطق بھی فی زمانہ (PLURALILISM) کی خوگر ہو چکی ہے اور حتمی صداقت کا مرتبہ کھو چکی ہے۔ ''نقطۂ نظر'' کی اہمیت افلاطون (PALTO) سے دریدا (DERRIDA) تک مسلم ہے۔ مابعد جدیدیت کے اکثر و بیشتر وکلا اور خاص طور پر بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے مابعد جدیدی وکلا کا نقطۂ نظر واضح ہے۔ نسائیت (FEMINISM) بھی ادب اور زندگی کی تفہیم کے سلسلے میں اپنا نقطۂ نظر رکھتی ہے۔ جو حضرات اس خیال کے منادی تھے کہ اب ''نقطۂ نظر'' کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ بین الاقوامی امور اور بین الاقوامی ادب میں مخصوص ''نقطہ ہائے نظر'' کے بطن سے پھوٹنے والی حکمت عملیوں کی زد میں ہیں۔ اگر

آپ زیرِ نظر مجموعہ مضامین میں ''نقطۂ نظر'' کی کارفرمائی دیکھتے ہیں تو بجا طور پر دیکھتے ہیں۔ کیا یہ درست نہیں کہ ہم ہر نوع کے حقائق کے رد و قبول کی منزل میں اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق رائے دیتے ہیں اور ان آرا کا دوسروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ اس مجموعہ میں میرؔ غالبؔ سے لے کر صابر ظفر اور محبوب خزاں کی شاعری کے بارے اپنے نظریات کی مطابق' فنی محاسن اور مصائب پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ زیرِ مطالعہ ادبا' شعرا کے فن میں ان عناصر کو ذہن میں رکھا ہے جو عصر شناسی میں مدد و معاون ہو سکتے ہیں......'' ڈاکٹر محمد علی صدیقی

پانچ عالمی' علمی' ادبی' سماجی اور ثقافتی مضامین کے علاوہ چھبیس ادبا و شعرا کا یہ تنقیدی محاکمہ دو صد چالیس صفحات مجلد سے مزین ہے جس کی قیمت فقط دو صد پاکستانی روپے اور دستیابی کا پتہ: فضل سنز' ویلکم بک پورٹ' غضنفر اکیڈمی' اردو بازار کراچی اور پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ کراچی ہے۔

روشنی کا آدمی

جناب شمشاد احمد ہمارے ملک کے ایسے ممتاز منفرد اور باکمال افسانہ نگار ہیں۔ جو ایک جملہ میں بھی پورا افسانہ کہہ سکتے ہیں۔ ان کے پلاٹ' کردار اور اندازِ بیان ان کا اپنا تراشا اور تراشا ہوا ہے۔ جناب شمشاد احمد ادق قسم کے پلاٹ تخلیق کرتے ہیں نہ اجنبی کردار متعارف کراتے ہیں۔ ہمارے روز مرہ کو کہانی کے پیکر میں ڈھال کر اپنی طرح کے عام انسان کی تصویر مع اس کی خوبیوں' خامیوں اور لغزشوں کے ہمارے روبرو اس ڈھنگ اور اس چھب سے پیش کرتے ہیں کہ سب کچھ ہمارے سامنے ہوتا ہوا یا خود پر گزرا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ شمشاد صاحب کا اہم موضوع' فسادات اور مقصد بُرائی کے خلاف جہاد ہے جبھی ان کی کہانیوں کا مرکز عام محلے' گلی اور پسے ہوئے انسان ہوا کرتے ہیں جن کے خدوخال کبھی نشتر کی سی نفاست سے منظر کشی کے ذریعہ کبھی قلم کی نوک تیزاب میں ڈبو کر تیکھے اور ترش جملوں کی مدد سے نمایاں کیا کرتے ہیں۔ جناب شمشاد احمد کے تازہ افسانوی مجموعے ''روشنی کا آدمی'' میں بھی جا بجا اندھیروں کو نشانہ بناتے ہوئے اپنے قاری کو نئے احساسات' نئے تجربات اور نئی واردات سے اس طرح متعارف کرتے ہیں کہ پڑھنے والا قاری کے بجائے کہانی کا کردار بن کر رہ جاتا ہے۔

دوڑتے دوڑتے وہ ایک سال حج کی دوڑ بھی لگا آیا۔
اگر کوئی مرد پہلی ملاقات میں آپ سے قم پر آجائے اور اپنی
بیوی کا ذکر بھی کرے تو وہ بد نظر نہیں ہوتا۔
وقت کا بے رحم سانپ میرے سینے پر کنڈلی مارے اپنی لپلپاتی
زبان سے خوب مزے کے ساتھ مجھے چاٹ رہا تھا۔
پہلے خوف کی چھت پر ایک نئے خوف کے گدھ جمع ہونے لگے
پھر انھوں نے مجھے نوچنا شروع کر دیا۔
گورکن نے خوف و دہشت کم کرنے کے لئے مردے سے
بات چیت شروع کر دی۔
اللہ کا شکر ہے نئی نسل کو شرمسار ہونا آتا ہے ہم تو اس لعنت سے
بھی محروم رہے۔
نو دولتیوں کی اونچی دوکان پر تعلیم بک جائے تو ان کے ہیبت
میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے

گیارہ افسانوی مجموعوں کے خالق جناب شمشاد احمد کے تازہ افسانوی مجموعے ''روشنی کا آدمی'' سے مشتے از خروارے کے طور پر چند جملے تحریر کرکے آپ کو جناب شمشاد احمد کے مختلف اندازِ بیان اور انوکھے جملوں سے متعارف کرانے کا مقصد مصنف کی انفرادیت سے متعارف کرانے سے منسوب ہے۔ پچیس انوکھی' اچھوتی اور اپنے اندر غور و فکر کا بے پناہ سامان لئے ہوئے کہانیوں کا یہ مجموعہ دو صد چوبیس صفحات کو محیط ہے جس کی دستیابی ایک سو پچاس روپے کے عوض ویلکم بک پورٹ اردو بازار کراچی سے ممکن ہے۔

اکھر اں وچ گلاب

قومی زبان' قومی ادب' قومی تہذیب' قومی ثقافت اور قومی لباس اصل میں علاقائی سوچوں' علاقائی رنگوں اور علاقائی بود و باش سے وجود میں آیا کرتا ہے۔ بدقسمتی سے ہم نے اپنی علاقائی زبانوں' ادب' تہذیب' ثقافت' لباس' مزاج اور سوچ کو اس طرح سے قومی دھارے میں شامل نہ کیا جس طرح سے مہذب قومیں کیا کرتی ہیں۔ ہمارے قومی ڈھانچے میں یہ ایسا خلا ہے جو کبھی بھی فاصلے میں تبدیل ہو کر ہمارے لئے مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ ہر چند انفرادی کاوش کبھی بھی تبدیلی کا سو جب نہیں بن سکتی مگر بارش کے پہلے قطرے سے جس طرح روشن مستقبل کی امید باندھی جا سکتی ہے عین اسی طرح پروفیسر زبیر کنجاہی کے پنجابی شاعری کے نسخے ''اکھر اں وچ گلاب'' سے بہتر توقعات قائم کی جا سکتی ہیں۔ بلاشبہ یہ پروفیسر صاحب کی پہلی کاوش ہے اور نہ پنجابی زبان اور ادب کا پہلا حوالہ ہے البتہ اس زنجیر کی ایک کڑی ضرور ہے جو درد مند دل کے حامل اہلِ قلم کا ہے بقا ہے ''ماں بولی'' کے عشق میں گرفتار ہو کر کیا کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں انسان پر واجب ہر طرح کا قرض بروقت اور برمحل ادا ہونا چاہئے مگر زمین کا قرض اور زبان کا قرض ادا کرنا ایک طرح سے فرض کفایہ کے زمرے میں آتا ہے۔ اگر آپ پنجاب کے باسی ہیں اگر آپ پنجاب کی ہواؤں کے دوش پر پلے ہیں اگر آپ نے پنجاب کے دریاؤں کی روانی اور اس کے ردِ عمل میں زرخیزی سے استفادہ کیا ہے تو آپ پر پنجابی زبان' پنجابی ادب اور پنجابی ثقافت کی ترویج اور ترقی' فرض کفایہ کی مانند واجب ہے۔ اگر آپ ماں بولی میں نہیں لکھتے تو ماں بولی میں تحریر کردہ کتاب ضرور پڑھیں اور اس زبان اور ادب سے ہونے والی اس زیادتی کا ازالہ کریں جو اب تک اس قدیم اور ثروت مند زبان سے ہوتی آئی ہے۔ ''اکھر اں وچ گلاب'' ایک درد مند انسان' ایک ذمہ دار پاکستانی اور ایک پرشوق پنجابی اہلِ قلم کے دل کی ایسی داستان ہے جس میں مصنف نے اپنی اولین شناخت اسلام' اپنا وطن پاکستان اور اپنی دھرتی پنجاب کے کھیتوں' کھلیانوں' جھرنوں اور میدانوں اور ان میں بسنے والوں کا منظوم ذکر کچھ اسی انداز میں کیا ہے کہ پڑھنے والا دل اور دماغ کے آس پاس ایسی آہٹ محسوس کرتا ہے جو شاید اس سے پہلے اس کے محسوسات میں نہ آئی

ہوا۔ پروفیسر زبیر کنجاہی کے پنجابی کلام پر مشتمل شعری سوغات ایک سو ساٹھ مجلد اور آرٹ پیپر کے ساتھ صرف ایک سو پچاس روپے کے عوض: پنجابی مرکز' 7 'اے گلی 6' کوچہ محمدی' سلطان پورہ لاہور سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

میں تیری آواز بنوں گا

آرزو چھاؤں کی کس طرح کیجئے
پیڑ اونچے بہت ہیں یہاں دوستو
مہر دل پر ازل سے ہے شعلہ فگن دھوپ کا
دھوپ کا آتشیں سائباں ہے دوستو

جس پہ بوجھل رہی ہے حقیقت میری
اس نے محسوس کی ہے ضرورت میری
اس کو جس وقت میں نے لکھا مدلقا
وہ سمجھتا رہا ہے مروت میری

کتنے آزار لے کے آیا ہوں
راہ دشوار لے کے آیا ہوں
اس کی محفل سے اپنے ہونٹوں پر
چپ کی یلغار لے کے آیا ہوں

چاک ظلمت کی ردا کر کے
رات گذری خدا خدا کر کے
ہیں رواں جادۂ سخن پر ہم
اپنے جذبوں کو آشنا کر کے

غم مرا تیرے باب میں نکلا
چاند تھا آفتاب میں نکلا
عمر کی تشنگی کبھی نہ گئی
بحر ہستی سراب میں نکلا

''پروفیسر علی نقی خان کا شمار شعبہ انگریزی ادبیات گورنمنٹ کالج جھنگ کے نامور اساتذہ میں ہوتا ہے۔ آپ کی علمی حیثیت کا ایک زمانہ معترف ہے۔ انگریزی ادب کے ساتھ اردو ادب بھی آپ کے مزاج میں رچا بسا ہے۔ عمدہ شعروں سے مزین گفتگو کرتے شعر گوئی کی جانب مائل ہوئے۔ صوتِ شعر کا سہل ممتنع میں ڈھالنے کا فن آپ کی شخصیت کا اہم جز ہے۔ رواں بحریں اور سادہ بیانی آپ کی غزلوں کا امتیازی وصف ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ پروفیسر علی نقی خان بہت جلد اردو کے شعری حلقوں میں اپنی نمایاں پہچان بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے.....'' غلام شبیر اسد

ایک سو سولہ صفحات مجلد' عمدہ نفیس کاغذ اور روشن طباعت کا حامل پروفیسر علی نقی خان کا یہ شعری تحفہ مبلغ ایک صد بیس روپے کے عوض مثال پبلی شرز' رحیم مارکیٹ پریس سینٹر' نازائین پورہ' فیصل آباد پر دستیاب ہے۔

صحراؤں میں بہتے دریا

محمد سرفراز صاحب ایسے با صلاحیت' روشن دماغ اور پڑھے لکھے نوجوان دانشور ہیں جنہیں ظلم و نا انصافی سے شدید نفرت ہے اور اسلامی امہ کے زوال نے انہیں دلگرفتہ کیا ہوا ہے۔ وہ کرۂ ارض بالخصوص اپنی دھرتی' اپنے وطن اور اپنے لوگوں کو دوسری قوموں' ملکوں اور خطوں کی مانند ترقی یافتہ اور خوشحال دیکھنے کی آرزو میں ہر روز نئے سے نئے خواب بنتے اور ان کی تعبیر نہ پا کر بے چین و بے قرار ہو جاتے ہیں۔ وہ بہت کچھ کرنے کے آرزو مند ہوتے ہوئے بھی اپنی بے دست و پائی پر جب دل مسوستے ہیں تو ان کا خنی باطن روشن ہو جاتا ہے تب دنیا سے بے خبر ہو کر اپنا درد' اپنا غم اور اپنا کرب شعروں میں ڈھال کر کسی قدر پرسکوں ہو لیتے ہیں۔ مسئلہ ایک نیا اس کے بعد آن کھڑا ہوتا ہے جب ان کے شعر اپنے پیکر' اپنے نقوش اور خال و خد کا تقاضا کرنے لگتے ہیں۔ وہ پھر سے بے بسی اور بے بصری کے عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

حاضری

وسعتوں کے نقاب کھلنے لگے
بلندیاں پستیاں کو دینے لگیں
ثریا اٹھے خاک کو چومنے
سمٹنے لگیں سبھی پل صراط
جنتیں نیچے آ کر زمیں پر بسیں
حوروں کا مسکن یہی فرش ٹھہرے
تو ان لمحوں میں کیا ہو؟
عشق سزاوار ہو معراج کے لئے

''صحراؤں میں بہتے دریا'' ایک سو پچاس روپے کے عوض گلیکسی بک 45 کمرشل زون لبرٹی مارکیٹ گلبرگ 111 لاہور پر دستیاب ہے۔

دھرتی کے رنگ

"دھرتی کے رنگ" اردو کے بڑے ادبی مراکز سے ہٹ کر نسبتاً دور افتادہ اور کسی قدر پس ماندہ علاقے بھکر کی تحصیل منکیرہ سے تعلق رکھنے والے نوجوان صحافی' ادیب اور شاعر جناب علی شاہ کے اکتالیس علمی' ادبی' سیاسی' سماجی اور معاشرتی کالموں پر مشتمل ایسی کتاب ہے جس میں صاحب قلم نے اپنی تمام تر کوشش اور جستجو کو بروئے کار لاتے ہوئے وہ سب کچھ کہنے کی کوشش کی ہے جو ایک بڑے اور ترقی یافتہ علاقے کا بڑا اور نامور اہل قلم تحریر کر سکتا ہے۔ ہر چند ہماری خواہش جناب علی شاہ اور ان کی کتاب کی بابت اظہار

رس رابطے

(جتجو ترتیب تدوین)

وقار جاوید

گلزار جاوید صاحب! آداب و نیاز۔

"چہارسو" کی مرسلہ کاپیاں ملیں۔ جو کچھ کہا گیا' احسن ہو گیا۔ میں اکثر شاعر دوستوں میں اپنا یہ شعر پڑھتا ہوں۔ ع

امید ہے کم چشم خریدار میں آئے
ہم لوگ ذرا دیر سے بازار میں آئے

آپ نے اور چہار سو کے اس خصوصی شمارے نے اس بات کو غلط ثابت کر دیا۔ اب نے چشم خریدار سے شکایت ہے اور نہ دیر سے بازار میں آنے کا شکوہ۔ شمارے کا مطالعہ اور مشاہدہ جوں جوں آگے بڑھ رہا ہے ووں' ووں مجھے شدت سے یہ احساس ہو رہا ہے کہ اگر میں عزیزہ حنا محمود صاحبہ کے اصرار پر آپ سے قلمی تعاون نہ کرتا تو اپنے ساتھ زیادتی کرتا۔ چلتے چلتے آپ کی کامیابی اور کامرانی کی دعا کے ساتھ اپنا یہ شعر جو میں خاص خاص موقعوں پر خاص خاص لوگوں کی نذر کرتا ہوں آپ کی نذر بھی کرنا چاہتا ہوں۔ ع

تجھ سے ملتے نہ ہم تو لگتا ہے
زندگی میں بڑی کمی رہتی

شہر یار (علی گڑھ بھارت)

برادر م گلزار جاوید صاحب! اسلام علیکم۔

شہر یار کے اعزاز میں چہارسو کا یہ شمارہ حسب معمول شاندار ہے اور ادب کے طلبا کے لیے سود مند بھی۔ میں نے پہلے بھی لکھا تھا اب پھر لکھ رہا ہوں "چہارسو" کو پاکستان کی ہر لائبریری میں جانا چاہیے اور خصوصیت کے ساتھ کالجوں اور سکولوں کی لائبریریوں میں۔ معلوم نہیں اسلام آباد میں ہوتے ہوئے آپ اس کے لئے کوشش کیوں نہیں کرتے۔ میں اگر وہاں ہوتا تو اب تک یہ کام کر چکا ہوتا۔ کیا آپ کا کوئی ایسا دوست نہیں ہے جو یہ کام کر سکے۔ میرا مطلب ہے وفاقی وزیر تعلیم اور دوسرے وزرا ثقافت وغیرہم سے مل کر چہارسو منظور کرالیا جائے۔

مشکور حسین یاد (لاہور)

پیارے بھائی گلزار جاوید! اسلام علیکم

"چہارسو" کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ اب تو اس رسالے کو دیکھنے اور پڑھنے کے لئے آنکھیں بیقرار رہتی ہیں۔ آپ کی دور رس اور کامیاب ادارت نے اسے برصغیر ہندو پاک کا انتہائی مقبول ترین رسالہ بنا دیا ہے۔ اس بار کا "قرطاس اعزاز" خوش فکر اور معتبر شاعر جناب شہر یار کے حصے میں آیا ہے۔ میں اسے ان کی خوش قسمتی اور خوش بختی پر مشتمل اس لئے قرار دیتا ہوں کہ ان کا گوشہ برصغیر ہندو پاک کے ایک ایسے رسالے نے شائع کیا ہے جس کے قارئین (Readers) کی تعداد اطمینان بخش ہے' سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس رسالے کو پڑھنے والے دونوں ملکوں کے علاوہ اردو کی عالمی بستیوں میں جوق در جوق دستیاب ہیں۔ ورنہ پاکستان کے پرچے پاکستان تک' ہندوستان کے پرچے ہندوستان تک اور عالمی بستیوں کے پرچے اردو کی عالمی بستیوں تک ہی عام طور محدود رہتے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ جناب شہر یار گمنام قسم کے شاعر تھے اور ماہنامہ "چہارسو" نے ان پر گوشہ نکال کر انہیں شہرت اور مقبولیت عطا کر دی ہے۔ شہر یار ہمارے عہد کے یقیناً بڑے اور اہم شاعروں میں شامل ہیں۔ لیکن میں جناب شمس الرحمان فاروقی کا ہم خیال بنکر انہیں اس عہد کا سب سے بڑا شاعر کہنے کی جسارت تو نہیں کر سکتا۔ کسی کو سب سے بڑا شاعر یا فنکار کہتے ہوئے تو مجھے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ عیوب اور خامیاں بشریت کا خاصہ ہوا کرتی ہیں یہ شہر یار کی بات نہیں زمین کے ہر انسان کی بات کر رہا ہوں۔ میں اس عقیدے پر ایمان رکھتا ہوں کہ رسول عربی کو چھوڑ کر خدا کی اس دھرتی کا کوئی بھی انسان مکمل نہیں ہے۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میرا کہنا صرف اتنا تھا کہ بڑی شاعری کا حامل ہونے کے باوجود ضروری نہیں کہ شہر یار کی شاعری ہر شخص کی دسترس میں ہو' "چہارسو" نے ان پر گوشہ نکالکر ایک بڑے حلقے تک ان کی شاعری کو پہنچا دیا ہے۔ یہ سعی اور یہ خدمت "ماہنامہ چہارسو" کی قابل تعریف بھی ہے اور قابل تعظیم بھی۔ گوشہ شہر یار کے بارے میں اس حقیر اور ہیچمدان کی رائے صرف اور صرف یہ ہے کہ یہ ایک کامیاب اور لائق ستائش گوشہ ہے۔ صاحب گوشہ کی شخصیت اور شاعری کی افہام و تفہیم کے سلسلے میں اس سے خاطر خواہ مدد ملے گی۔ آپ کا سوالنامہ حسب سابق چہار طرفی اور بھرپور ہے۔ شہر یار نے ان سوالوں کے بحتاط جوابات دیے ہیں لیکن کہیں کوئی جواب تشنہ نہیں ہے۔ ان کے جوابات نے ان کے تعلق سے میری معلومات میں اضافہ کیا ہے۔

رسالے کے دیگر رشحات قابل توجہ ہیں۔ آپ کا ڈرامہ "آج کی تازہ خبر" جس وسیع تر مقصد کی تکمیل کے تحت لکھا گیا ہے وہ مقصد پورا ہوا ہے۔ دیگر تحریروں کے ساتھ رس رابطے کے زیر عنوان جو خطوط دیے گئے ہیں ان کا مطالعہ بلا کا لطف دے گیا۔ عطیہ سکندر علی کے تازہ کتابوں پر تبصرے جامع اور متوازن ہیں۔

محمد ایوب واقف (ممبئی بھارت)

گرامی قدر گلزار جاوید صاحب! اسلام علیکم

چہار سو کی اطلاع مجھے میرے دوست گوپال کرشن مانک تالہ دے چکے تھے۔ آپ نے ان سے متعلق نمبر مجھے بھیج کر میری عزت افزائی کی ہے۔ رسالہ بہت پسند آیا۔ تھوڑا تھوڑا کر کے دنوں پڑھوں گا۔ یہ شمارہ اردو کے دو محسنوں نند کشور دت اور مانک تالہ کو خراج عقیدت کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔ میں دونوں میں سے ایک سے بھی نہیں ملا ہوں۔ پشت کی تصویر غالباً موثر اندکر کی ہے۔ اچھا ہوتا کہ سرورق کی تصاویر کے نام بھی اندر دیئے ہوتے۔ رسالے کا صفحۂ اول اپنی جگہ یونیک ہے۔ خاص طور سے مجلس مشاورت جو آپنے چنی ہے اور زر سالانہ جو آپنے رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپکو اور چہار سو کو صحت اور زندگی بخشے۔ آمین

پریم چند پر کام ہم دونوں نے کیا ہے اور یوں ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ چہار سو کے ہمراہ ''مٹی کے متوالے'' اور ''براہ راست'' کا تحفہ بھی ملا۔ ''مٹی کے متوالے'' کے بیان میں نوینتا ہے مگر براہ راست کا جواب نہیں۔ حال ہی میں گیان چند جین صاحب کا انتقال ہوا ہے جس کی اطلاع ''سب رس'' (بھارت) سے لی۔ میں نے سب سے پہلے گیان چند جین صاحب کا انٹرویو پڑھا۔ ان پر جو بحث آج کل چل رہی ہے اسے سمجھنے میں آپ کا انٹرویو بڑے کام کی چیز ہے۔ اس کے علاوہ دلاور فگار مرحوم انور سدید اور کئی دوسرے زعما کے انٹرویو بھی لطف دے رہے ہیں۔ کتاب کی پشت پر آپ سے ملاقات بھی اچھی رہی۔

ڈاکٹر سید حسن مظہر (حیدرآباد سندھ)

میرے بھائی گلزار جاوید! خوش رہو!

اس مرتبہ شہریار کی گرفتاری کا خوب خوب مزہ آیا۔ اور چونکہ اور کوئی بھی شعر اسمیں شامل نہ رہے اس لئے ان کی شعری تخلیقات اور بھی زیادہ مزہ دے گئیں۔

ٹائٹل پر ان کی غزل امراؤ جان فلم کی یاد تازہ کر گئی۔ ویسے تو ایک ایک لفظ ان پر لکھا جانے والا خوب ہے مگر نگاہوں کے سامنے امراؤ جان ہی چھائی اور رقصاں رہی۔ مگر معلوم نہیں ان کی یہ غزل کچھ زیادہ ہی اچھی لگی۔ ع

کشتئ جاں سے اتر جانے کو جی چاہتا ہے
ان دنوں یوں ہے کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

اور پھر کیسی مجبوری اور لاچاری ہے اس کوچے میں جا نہیں سکتا مگر جانے کو جی چاہتا ہے ایک ایک شعر اپنی جگہ نگر رہے۔ ان کے نام جناب مہتاب حیدر نقوی کی نظم بھی خوب ہے۔ بھولی بسری یادوں کی بارات اور بربند پاؤں سے لیکر آپکے انتخاب کی داد دینے کو جی چاہتا ہے اور پھر ع

یوں تو مرنے کے لئے زہر سبھی پیتے ہیں
زندگی تیرے لئے زہر پیا ہے ہم نے

براہ راست میں آپ کے سوال کے جواب میں شہریار کا جواب کہ ہندوستانی ادب میں پاکستانی ادبا راہ تو پا گئے مگر پاکستانی ادب میں کسی طور در نہ آ ئے۔ ادب تو ادب ہے۔ اسمیں تفریق کا مقام کہاں!

شہریار پر لکھے گئے تمام مضامین خاص طور سے گوپی چند نارنگ صاحب کا مضمون ہم سے خلوت گزیدہ تنہا کا رپسند آ ئے۔ اور پھر

سینے میں جلن' آنکھوں میں طوفاں سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

گو اسمیں باقی شعر اشامل اشاعت نہ رہے مگر ایک کام اچھا ہوا کہ شہریار کی شاعری کا خوب خوب مزہ رہا۔ اور ابوالکلام قاسمی کا مضمون تمام شہر آ گ کی لپیٹ میں بھی پسند آیا ہے۔

افسانوں کا حصہ بھی اچھا رہا۔ شمشاد احمد صاحب کا بوڑھا اور نِل جمیل احمد عدیل کا آخری لمحہ' دیپک کنول کا سنتا کی گوری اچھے ہیں۔ ستیہ پال آنند کا مضمون حقیقت ریلو پر اچھا لگا اور آپ کا ڈرامہ آج کی تازہ خبر' آپ نے فلمی دنیا سے متعارف کروادیا اور لڑکیوں کی آپسی گفتگو بھی خوب خوب رہی اور آخر میں حادثہ" آپ نے ڈرامے میں بھی جھٹکا دے ہی دیا۔ آپ نے اس ڈرامے میں خوب محنت کی ہے مبارک ہو قصہ کا ہ اس بار چہار سو اور بھی اچھا لگا اور سبقت لینے میں کسی طور پیچھے نہیں رہا۔

یوگیندر بہل تشنہ (دہلی بھارت)

محترمی گلزار جاوید! اسلام علیکم

''چہار سو'' کا تازہ شمارہ ستمبر اکتوبر 07 ملا۔ پرچے سے مل کر ایسی خوشی ہوئی جیسی کسی دیرینہ دوست یا قریبی عزیز سے مل کر ہوتی ہے ابھی پرچہ پورا پڑھا نہیں۔ مگر چند مضامین پڑھے۔ بہت معیاری ہیں۔ مگر افسانے صرف تین! گلزار صاحب! زندگی کا ہر لمحہ ایک چھوٹی موٹی کہانی کو لیکر آگے چلتا ہے تو پرچے میں کہانیوں کے حوالے سے اتنا اختصار؟ بہت جی چاہتا ہے کہ اس خوبصورت موسم میں راولپنڈی آیا جائے مگر حالات ایسے ہیں کہ خوف آتا ہے۔ انتظار ہے ایک بہتر موسم کا۔ آپ بھی دعا کریں۔ ہمارا تو کام ہی اب دعا کرنا ہے کہ کیا قدیم زمانہ کی رت ہمارے ملک کو واپس آتی جا رہی ہے۔

سلطانہ مہر (یو کے)

پیارے گلزار جاوید، خوش رہو!

آج ہی جناب انل ٹھکر کے توسط سے ''چہار سو'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا شکریہ۔ قرطاس اعزاز شہریار کے نام بہت اچھا لگا۔ براہ راست

میں شہریار کی شاعری اور شخصیت کے کئی دلچسپ پہلو نمایاں ہوئے ہیں۔ اس قسم کے مکالمے سے آپ نے ایک انفرادی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ عام مکالموں میں یہ سب باتیں نمایاں نہیں ہوتیں۔ شہریار پر مضامین بھی خوب ہیں اور ایسے ہیں جس کے وہ مستحق ہیں۔ شہریار کی اپنی ادبی شخصیت بڑی ہے اور لکھنے والے لوگ بھی بڑے وقد آور ہیں۔ دیگر شعری تخلیقات کے علاوہ "دل دھڑکنے سے تھا" عنوان کے تحت شہریار کے منتخب اشعار شائع کر کے آپ نے پڑھنے والوں کو خوبصورت سوغات دی ہے۔

شمارے کے افسانوی حصے میں دیپک کنول کا سنتا کی گوری بہت خوب افسانہ ہے جس میں دیہاتوں کی خوشبو ہے۔ ستیہ پال آنند کو بنیادی طور پر میں افسانہ نگار ہی مانتا ہوں وہ اپنی شاعری میں بھی کہانی کی روایت اور جدیدیت کی کہانی ہی بیان کرتا ہے۔ یہ مضمون بہت محنت، سنجیدگی اور سچائی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اچھا لگا۔ پرماتما ستیہ پال آنند کو صحت عطا کریں کہ اردو زبان ادب کا پرچم ان سے بلند ہے۔ عطیہ سکندر علی نے تخلیقِ عصر کے عنوان کے تحت کتابوں کے تبصروں کا جو نیا انداز اپنایا ہے وہ دلچسپ ہے۔ "آج کی تازہ خبر" مجھے تو مکالماتی کہانی ہی لگی بیشک آپ نے اسے ڈرامے کی تکنیک سے تحریر کیا ہے۔ اس کہانی پر ایک اچھی فلم بن سکتی ہے۔ مبارکباد...... آخر میں نند کشور وکرم صاحب کی وہی تجویز ہے جو ایک بار فون پر میں نے پیش کی تھی کہ ایک میان میں دو تلواریں نہ ڈالیں۔ ایک "چہار سو" میں ایک شخصیت کا گوشہ ہی شائع کریں۔ امید ہے آپ غور کریں گے۔

ڈاکٹر کیول دھیر (لدھیانہ بھارت)

برادرم۔ سلام مسنون

تقریباً سال بھر کناڈا میں گزارنے کے بعد 11، اگست کو وطن کی سرزمین کو قدموں نے چوما اور دل میں اطمینان کی ٹھنڈک پہنچی۔

یہاں جو کتب اور رسائل میرے انتظار میں تھے ان میں "چہار سو" کے تین شمارے محمود ہاشمی نمبر۔ وحید قریشی نمبر اور ندا فاضلی نمبر۔

ہاشمی صاحب کی کتاب "کشمیر اداس ہے" برسوں پہلے پڑھی تھی اور گرویدہ ہو گیا تھا۔ اب ان کے بارے میں بہت سی معلومات کے ساتھ ان کی چند تحریریں بھی چہار سو میں محفوظ ہیں۔ جن کو سانس لینے کے بعد پڑھتا رہوں گا۔

وحید قریشی صاحب۔ جب مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین ہو کر کراچی تشریف لائے تھے تو مرحوم مشفق خواجہ صاحب کے ذریعہ کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں اور موصوف نے غریب خانے کو بھی رونق بخشی تھی اور میرے والد مرحوم حضرت صبا سے بھی ملاقات کی تھی اتفاق سے میرے والد کے دوست مرحوم خورشید انصاری فریدآبادی بھی موجود تھے۔ پھر مشفق خواجہ مرحوم کے وسیلے ہی سے صبا صاحب کے اس شعر پر ؎

چونک اٹھا سن کے عکس کی آواز
آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

قریشی صاحب کی رائے حاصل کی تھی۔ اس شعر پر اب تک میرے پاس تقریباً ایک سو (100) سے زیادہ اکابر ادب کی آرا موجود ہیں۔

ندا فاضلی صاحب سے کناڈا میں کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں جب وہ سجاد ظہیر کے سلسلے میں منعقدہ کانفرنس میں تشریف لائے تھے۔

بہرحال یہ تینوں شمارے پڑھنے کے لئے میں نے سرہانے رکھ لئے ہیں۔ پڑھتا رہوں گا اور خوش وقت ہوتا رہوں گا۔

آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنا وقت اور پیسہ ادب کے لیے وقف کرتے ہیں۔ اللہ آپ جیسے دیوانوں کو سلامت رکھے۔ بیا جاوید کو بہت سی دعائیں۔

سلطان جمیل نسیم (کراچی)

محترم گلزار جاوید صاحب! سلام و رحمت!

آپ کا معتبر بلکہ تہلکہ خیز چہار سو تشنہ صاحب کی وساطت سے دستیاب ہوا۔ شمارہ ہذا، "محمود ہاشمی" کے نام ہے موصوف محترم کی ادبی شخصیت "کہکشانِ اردو میں" "قطب ستارے" کی مانند اٹل اور غیر متزلزل ہے۔ ان کے علمی حیات، ادبی نکات اور تحقیقی ابعاد کی بناء پر ہر قلمکار و فنکار نے بقدرِ ظرف و ذوق کسبِ نور ضرور کیا ہے، اس ادبی ہمالیہ قامت شخصیت کے فکر و فن پر ممتاز احمد، انور سدید، جعفر بلوچ، رفیع الدین ہاشمی، انعام الحق جاوید، احمد صغیر صدیقی، اقبال بخشی اور بذاتِ خود بقلم خود آپ نے جس طرح اور جتنی گہرائی اور گیرائی سے کھدم ہیں، پہچان و پرکھ، تلاش و تحقیق اور جستجو و جاں کاہی کی ہے، اس کی داد نہ دینا یقیناً بیداد ہوگی!!

عزیزم، آپ کے تنقیدی ذہن کی تجدیدی سوچ اور اپروچ بھی لائقِ صد آفریں ہے کہ آپ نے اپنے جریدے کے ذیلی عنوانات بھی خوب تراشے بلکہ تلاشے ہیں مثلاً، متاعِ چہار سو کے تحت، قرطاس اعزاز، قلب سیم، شبی معرکہ، شبی معطر، نشانِ راہ، آئینہ فن، شبی آفتاب، تخلیق عصر، شبی ماہتاب اور آخر میں رس رابطے جیسے جدید ترین، دل نشین، عنبرین اور آفرین سرنامے تجویز کئے ہیں۔ یہ بھی آپ کے اجتہادی، انفرادی دماغ کے غماز ہیں! یہ خوبیاں، محبوبیاں، غالبِ دوراں کی مانند، آپ کی انفرادی، اجتہادی اور اختصاصی روش و راہ پر گامزن اور کاربند ہونیکا خوب سیرت اشاریہ کہی جا سکتی ہیں! آپ کی یہ ذہانت، فطانت، فراست، فصاحت اور فعالیت (راقم السطور کے خیال میں) عنقریب "فسوں" کے مرتبہ و امتیاز پر ضرور فائز ہوں گی اور آپ مملکتِ اردو کے بے تاج شہنشاہ!! مختصراً یوں سمجھئے کہ آپ کے دسترخوان

''چہار سو'' میں ہر نوع کا ادبی شعری تنقیدی تحقیقی تدریسی تصریحی تشریحی تبصراتی اور مکتوباتی پکوان اپنی اشتہا انگیزی اور خوشبو کے معنی ''بے خاک کدے ہم'' اس کے مطالعے پر مجبور کر دیا اور میں نے ندیدیوں اور بھوکوں کی طرح 'از اول تا تمت' اس کو پڑھا ہی نہیں بلکہ بقول شخصے ایک ہی نشست میں چاٹ ڈالا (اخیر ڈکار لئے) (آپ کو مزے کی بات بتاؤں' 29 جولائی 2007 کی صبح 11 بجے میری فلائیٹ پالم ائیر پورٹ دلی سے سری نگر طے تھی' کشمیر یونیورسٹی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام کا سہ روزہ' حکیم منظور سیمینار پہلے سے طے تھا' میرا زاد راہ صرف اور صرف آپ کا یہی جریدہ ''چہار سو'' میرے شریک سفر تھا۔

ڈاکٹر خالد حسین خان (میرٹھ' بھارت)

بھائی گلزار جاوید اسلام علیکم

چہار سو کا تازہ شمارہ ایک بار پھر اپنی مسافت کے اہم سنگ میل پر نظر آیا کہ محمود ہاشمی جیسی نابغہ شخصیت پر ''قرطاس اعزاز'' پیش کرنے کی تاریخ اپنے نام لکھ گیا اور ہم جیسے علم و ادب کے رسیا کو ایک اہم شخصیت کی تفصیل دے گیا۔ یوں تو ''براہ راست'' سے لے کر ''آئینہ بادبہاری'' تک رسالے کے صفحات ان کی مختلف الجہات ہستی کے بارے میں' میری معلومات میں اضافہ ہی کرتے رہے لیکن ڈاکٹر انور سدید کی تحریر ''مشرقی تہذیب کا امین'' مجھے زیادہ جامع اور ''حق بحقدار رسید'' لگی۔

''درد'' جنید بلو کا میری نظر میں پہلا افسانہ ہے جو مجھے اس لئے بھی زیادہ پسند آیا کہ یہ ہمارے آج کے دکھ درد کی بات ہے بھگوان ان کو ان کا یہ نیا موڑ کسی مثبت راہ پر لگا دے۔ کیدا ناتھ کا ''مجرب نسخہ'' دوسرا افسانہ ہے جو مجھے اس لئے بھی زیادہ پسند آیا کہ یہ ہمارے معاشرے کی اس دکھتی رگ پر انگلی رکھ رہا ہے جس نے اپنا دکھ سارے معاشرے پر ایک نئے ڈھنگ سے منعکس کر دیا ہے۔ گلزار جاوید کا ''جمہور فیا رکی والا'' بھی عقیدت کے صدیوں پرانے نظام کو نئے بوسوں سے آراستہ کرتا دکھائی دیا۔ مبارک ہو۔

شاعری میں خیال آفاقی کے قطعات (بالخصوص آخری قطعہ) اور پروفیسر زبیر کنجاہی کی نظم 'صدائے بیگانگی کا مراقبہ' پسندیدہ رہے۔

غالب عرفان (کراچی)

عزیزم گلزار جاوید تسلیمات

زیر نظر چہار سو سے قبل شہریار کی شاعری پڑھنے کا بہت کم اتفاق ہوا۔ اسکی وجہ یہ کہ شہریار پاکستانی رسالوں میں بہت کم چھپے۔ اور ان کے کلام سے شناسائی نہ ہو سکی۔ جبکہ کمار پاشی کا کلام تخلیق اور فنون میں برابر چھپتا تھا کمار پاشی نے 1966 میں اپنا پہلا مجموعہ کلام بھی مجھے بھیجا تھا۔ بہر حال خوشی ہوئی کہ آپ کی وساطت سے شہریار کا اتنا کلام پڑھنے کو ملا بہت اچھا لکھتے ہیں بعض خیال بعض بندشیں۔ بعض ترتیبیں پڑھتے محسوس ہوا کہ میں بھی ایسے ہی کہتی۔ جانے تخلیق کاروں میں کیا چیز مشترک ہوتی ہے جو انسان کہہ اٹھتا ہے یہ بھی میرے دل میں تھا۔ میں انتخاب کرنے بیٹھی تو بہت مشکل محسوس ہوا کیونکہ غزل اور نظمیں سارا کلام کہہ رہا ہے۔

شہریار بہت اچھے شاعر ہیں۔ اور میں نے بار بار ان کے کلام کو پڑھا۔ تینوں مقالے۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ بیدار بخت' اسلوب احمد انصاری نے حق ادا کر دیا ہے۔ شمیم حنفی اور گوپی چند نارنگ کے تجزیے بھی پسند آئے اب تو ان کی شاعری کی کتابیں بھی لائبریری میں ڈھونڈنی پڑیں گی۔ تاہم اس گوشے میں منتخب تمام کلام واقعی منتخب ہے اور ان کے لئے باعث افتخار ہے۔

ستیہ پال آنند نے جنید بلو کے فن و فکر کا اچھا تجزیہ کیا ہے۔

افسانے اس دفعہ کچھ کمزور لگے آپکا ڈرامہ اچھا ہے مگر طوالت کا شکار ہو گیا ہے مختصر کرنے سے تھوڑا چست بھی ہو جائے گا ویسے موضوع دلچسپ ہے

اچھا ہوا آپنے دوسرے لوگوں کا کلام شائع نہیں کیا۔ شہریار کے کلام کی چکاچوند میں ویسے بھی سب ماند پڑ جاتے۔

انور سدید سے فون پہ بات کرتے ہوئے یہ موضوع زیر گفتگو آیا کہ کیا لکھا جا رہا ہے انھوں نے فرمایا کہ لوگوں نے سنجیدہ مضامین لکھنا تو در کنار پڑھنا بھی چھوڑ دیا ہے اور علم اور فکر و فن کا ذکر کم ہو رہا ہے۔ انھوں نے ثبوت کے طور پہ رابطہ خطوط کی طرف توجہ دلائی۔ غور کیا تو ان کا خیال سو فیصد درست معلوم ہوا

چہار سو۔ شاعر۔ اور بہت سے دوسرے رسائل میں بھی صرف شاعری یا افسانے پہ بحث ہوتی ہے وہ بھی تجزیاتی کم اور ستائشی زیادہ۔

حمیدہ معین رضوی (یو کے)

کرمفرمائے بندہ۔ سلام و رحمت

جولائی۔ اگست 2007 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ کھولتے ہی پہلے صفحہ پر نظر رک گئی۔ آپ کا انتساب یا یوں کہیے کہ درد بھری آواز ''ارض پاک'' ہی کے لیے نہیں پورے برصغیر کے لیے ہے۔ یہ پیاسے' بھوکے اور ننگے خط افلاس کے نیچے تو ہیں ہی آزادی کے ساٹھ برس گزر جانے کے باوجود علم کی روشنی سے بھی محروم ہیں۔ تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ کروڑ پتیوں کی تعداد میں دن دگنا رات چوگنا اضافہ ہو رہا ہے اس میں مذہبی ٹھیکیدار اور سیاسی اجارہ دار سب شامل ہیں۔ آمدم بر سر مطلب۔ آپ فی الحقیقت ادب کی خدمت کر رہے ہیں اور جیسا کہ پچھلے مکتوب میں آپ نے تحریر فرمایا تھا دونوں ممالک کے درمیان پل سازی کا کام بھی کر رہے ہیں۔ تخلیق کاروں کی فہرست سے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رسالہ ہندوستان کا ہے کہ

پاکستان کا۔ بھارت کے تمام بڑے قلم کار آپ کے ساتھ ہیں اسے آپ کی شخصیت کا جادو اور ادب کے لئے خلوص ہی کہا جائے گا۔

آپ اپنے رسالے میں جن قلم کاروں کو جگہ دیتے ہیں ان کا قد بڑھا دیتے ہیں۔ کوپل چندا رنگ صاحب کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر کمپوزنگ کا کام بھی مکمل ہوگیا ہے۔ آپ کا مضمون شامل ہے جا رنگ صاحب کو آپ کے مضمون کی اطلاع دے دی تھی۔ یہ کتاب بھی دسمبر تک شائع ہو جائے گی۔ کاروانِ ادب کا تازہ شمارہ پریس میں ہے۔

کوثر صدیقی (بھوپال بھارت)

محترم جناب گلزار جاوید صاحب

اسلام علیکم۔ اکتوبر کا ''چہار سو'' چھبیسویں روزے کو ملا۔ ستائیسویں رات ساری رسالہ پڑھنے میں گذاری۔ جب سحری کھانے کا وقت آیا تو صرف آپ کا ڈرامہ ''آج کی تازہ خبر'' رہ رہا تھا۔ سحری کھانے کے بعد جب اسے پڑھ لیا تو جو کچھ کھایا تھا سب ہضم۔ سوچا! اب کیا ہوگا؟ کیونکہ روزہ تھا۔ پھر کہا چلو اللہ مالک ہے دن گذر ہی جائیگا۔ یقین جانیئے اتنا کامیاب دن کبھی نہیں گذرے آرام سے دن گذر گیا۔ دن بھر میں چار غزلیں اور تین نظمیں لکھیں۔ سب چہار سو کو بھیجوں گا۔ کیونکہ اسی کے مطالعہ کے بعد لکھی ہیں۔ ''شہریار'' کو پڑھنے کی بڑی خواہش تھی مگر کلام کہیں سے مل نہیں رہا تھا۔ سنگ میل پبلیکیشنز والوں کے پاس بھی نہیں ہے آپ کے سجائے ہوئے گوشے اور انٹرویو دیکھ کر بڑی حسرت ہوتی ہے مگر کیا کیا جائے جن کے گوشے آپ لگا رہے ہیں میں ان کی خاک پا بھی نہیں۔

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

عزیزم گلزار جاوید صاحب

''چہار سو'' نظر نواز ہوا۔ اور حیرت بھی ہوئی کہ اسقدر دیدہ زیب اور بہترین تخلیق کاروں کی تخلیقات سے آراستہ جریدہ صرف ''دلِ مضطرب' نگاہ شفیقانہ'' کے عوض جاری ہے۔

اور آپکی تحریر سے احساس ہوا کہ آج کے نا مساعد حالات اور دور میں بھی آپ قدیم زمانوں کی روش پر چل کر تھکن محسوس نہ کرتے ہوئے گام زن ہیں۔ حیرت نے مسرت میں تبدیل ہو کر دعاؤں کی سوغات لٹا دی۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ بخدا ''چہار سو'' کو اجنک اپنے احباب' تلامذہ اور ادبا کو دکھا کر ان میں جذبہ خدمت اردو اور بے لوث خدمت ادب کا احساس جگانے میں مشغول ہوں۔ خدا سے دست بہ دعا ہوں کہ پروردگار آپکی اور تمام رفقائے کار کی محنت اور لگن کو ہر قدم پر کامیابی عطا فرمائے۔ آمین

رضا رامپوری (بھوپال بھارت)

مرکز احترام اسلام علیکم

مزاج بخیر۔ ''چہار سو'' شمارہ جولائی اگست 2007 وصول پایا۔ محبتوں اور نوازشوں کیلئے ممنون ہوں۔ حسب معمول حصہ نظم و نثر خوب ہے آپ ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ خدا اجر اسے خیر دے (آمین)

محترم ستیہ پال آنند' یوگیندر بہل تشنہ' سجاد نقوی اور دیگر احباب نے جن خیالات کا اظہار کیا۔ بصد احترام شکرگزار ہوں۔ ہمیں تو پاکستان کے ساتھ ساتھ انسان سے شدید محبت ہے۔ ع

گلشن گلشن پھول بکھیرو افسانوں میں رنگ بھرو
پیار کی خوشبو نے دنیا میں کیا کیا رنگ نکھارے ہیں

تاہم تمام لوگوں کو تسلیم شدہ ملک کے احترام کا خیال رکھنا چاہیے۔ مثلاً کیبل پر بھارت کا ایک پروگرام ''INDIAN IDOL'' ہے۔ جہاں فنکار کھڑا ہوتا ہے مذکورہ لفظ فنکار کے پاؤں تلے آتا ہے یہ اچھا نہیں لگتا۔ اس بارے میں خیال رکھا جائے۔

ماجد سرحدی (پشاور)

عزیزی گلزار جاوید! اسلام علیکم

دعا گو ہوں کہ خدا آپ کے رنگ و بو میں اور اضافہ کرے' حسب دستور پرچہ ملا۔ شکریہ' چہا سو سیر کی' پورا ماحول باغ و بہار نظر آیا' افسانوں میں جتندر بلو کا الکوحل میں بسا ہوا افسانہ ''ورد مغرب'' کے ایک بہت بڑے المیہ کی کہانی سناتا ملا۔ نورالحسنین صاحب نے کھڑکی سے آنے والا جھونکا'' میں ثابت کر دکھایا کہ ''بات کا بتنگڑ'' بنانا کسے کہتے ہیں' تاہم انہیں کسی بات کو بیان کرنا آتا ہے' دیپک بدکی نے وہ کام کیا جو کرنا چاہیئے' ہم لکھنے والوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنی تحریروں کو وقت حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کریں' معصوم علی افسانہ نہیں ایک ایسی حقیقت ہے کہ جسے اب تلخ اور دلخراش بھی نہیں کہہ سکتے' تمام دنیا کی زبانوں کی لغات میں بھی وہ لفظ نہیں مل پائے گا جو اس المیے پر چسپاں ہو سکے۔ دیپک بدکی کو خبر ہو کہ وہ اس المیہ کو بیان کرتے رہے اور میں روتا رہا اور یوں میں ان کے بچوں کا ''ہم مشرب'' بن گیا۔ ''جھورا فیاری والا''، گلزار جاوید کی جذبات نگاری کا شاہکار ہے' بیٹھے بیٹھے کراچی ایسے دور دراز شہر میں' پنجاب کی دیہی زندگی کی سیر کرا دی' میرا خیال ہے وہ لوگ جنہوں نے کبھی ذرا بھی پنجاب کے اندرون علاقوں میں ''سیاحت'' کی ہے وہ جھورا فیاری والا کے ساتھ اپنی خوشگوار یادوں کو تازہ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ میں اس مسرت افزا تجربات سے بار ہا گذر چکا ہوں اس وجہ سے جھورا فیاری والا کو نثر کے طور پر بار بار پڑھنے کو دل کیا۔ جھورا اور اسکے ہم عصر پھیری والوں کی ''کردار سازی'' نے کہانی کو کامیاب اور کہانی کار کو پختہ کار ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ محمود ہاشمی کا گوشہ پر مغز ہے' بہرحال اس طرح کے لوگوں کی ستائش ان کا استحقاق ہے' اور آپ حقوق کی ادائیگی میں نہایت

فرض شناس اور سریع الحرکت واقع ہوئے ہیں' خدا آپ کو اسی طرح فعال اور با کار رکھے۔ نظم کے حصے میں سب سے پہلے تو میں نعت کے دو اشعار کی طرف تخی سے آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ نہایت قابل گرفت ہیں' سبز گنبد پہ کھڑے ہوں گے' یہ کیا انداز بیان ہے' قطعاً خلاف آداب ہے' دوسرے شعر میں پھر کھڑے ہونے کا لفظ ہے جو خود حضور کے لئے ہے' یہ بھی آپ کے شایانِ شان نہیں' آخری شعر میں' اپنے آقا بھی وہاں شان سے آتے ہوں گے' حضور ''بھی'' کے زمرے میں نہیں آتے آپ کے لئے ''ہی'' مناسب لگتا ہے باقی سارا جہاں ''بھی'' میں شمار ہوتا ہے' لہذا میری درخواست ہے نعت رسول لکھنے والوں کے لئے کہ وہ ان نزاکتوں کا خیال رکھ سکتے ہیں تو حضورِ رسالت مآب میں لب کشائی کریں ورنہ آپ پر درود و سلام پڑھ کر ہی آپ سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ شبنم شکیل کی پوری غزل اپنی صنف سے انصاف کرتی نظر آتی ہے' جاوید شاہین صاحب اگر بدن کی ناک جھانک کی بجائے اس انداز کی شاعری کریں جیسی کہ یہ زیر نظم غزل ہے تو، ''تو خود ہونے لگے کا احتساب آہستہ آہستہ''۔ ڈاکٹر صابر آفاقی کا یہ شعر'

فریب صبح کاذب تم نہ کھانا قافلے والو
ابھی تک دیکھ لو پنچھی ٹھکانوں سے نہیں اترے

ایک اچھی تمثیلی شبیہ ہے۔ برادر غالب عرفان کا یہ شعر' اس کے لہجے میں اشتعال سہی

اپنے بس میں زبان رکھنا ہے
راج اعلام ہونے کی شان رکھنا ہے

اس خاکسار کی غزل کے دو اشعار کمپوزر کی ''فرینڈلی فائر'' کا شکار ہوگئے۔ پانچویں شعر کے پہلے مصرعہ میں رنگ سے پہلے ''ہم'' رہ گیا۔ صحیح یوں ہوگا نہیں تھا کوئی بھی ہم رنگِ خونِ دل لیکن۔ چھٹے شعر کے پہلے مصرعہ ''کس'' کو ''کسی'' بنا دیا گیا ہے۔ صحیح یوں پڑھا جائے گا۔ ''ابھی لٹاتے ہیں ہم کس طرح سے جاں اپنی۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی غزل شروع تا آخر حسین تعلی کا ''حسین نمونہ'' ہے۔ ماجد سرحدی کی نظم گذری ہوئی المناک خبروں کی یاددہانی ہے کہ اس کا اظہار' اور بار بار ہونا ضروری ہے۔ آخر میں دو باتیں' ایک یہ کہ دیپک بدکی سے غالباً سہو ہوا ہے' اپنی کہانی میں ''عوام'' کو تذکیر کی بجائے تانیث پیش کیا ہے۔ دوسری بات یہ شکوہ کہ میرے مکتوب کو گھر میں رکھ لیا' چہار سو میں جگہ نہ دی' سبب نہ معلوم' شکایت باقی۔

خیال آفاقی (کراچی)

محترمی جناب گلزار جاوید صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ

جولائی۔ اگست کا چہار سو اس بار ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ صاحب کے توسط سے ہدست ہوا۔ پہلا شمارہ مجھے جنوری فروری کا ملا تھا۔ اس کے بعد رسالے کی ترسیل میں تاخیر ہوئی تو میں نے اُتل ٹھکر صاحب سے رابطہ کیا اور پتہ چلا کر چہار سو پابندی سے جاری ہے۔ بہرحال اس عنایت کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میری تخلیقات آپ کو مل چکی ہیں۔ زیر نظر شمارہ بھی حسب سابق وقیع اور معیاری ہے۔ خصوصاً قرطاس اعزاز کے تحت محمود ہاشمی صاحب کی شخصیت اور فن پر جس شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اس کے مطالعے سے صاف ظاہر ہے کہ موصوف کے ادبی کارنامے تاریخ ادب میں سنہرے لفظوں میں لکھے جانے کے لائق ہیں۔

چہار سو کے ذریعہ آپ دونوں ملکوں کے عوام اور خاص طور سے اہل قلم حضرات کے درمیان محبتوں کو فروغ دینے کی جو کوشش کر رہے ہیں وہ بلاشبہ لائق تحسین ہے۔ میری دعائیں اور نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ اس نیک مشن کو کامیابی سے ہمکنار کرے۔

سعید رحمانی (اڑیسہ' بھارت)

جانِ برادر گلزار جاوید صاحب

اسلام علیکم۔ چہار سو مل رہا ہے خوشی دیتا ہے مجھے اس محبت کا جواب آج نہیں تو کل دینا پڑے گا۔ کیونکہ آپ کے خلوص اور شدت خلوص سے میں ہمیشہ خائف رہا ہوں۔ کاش یہ معاشرہ محبتوں کا جواب نہ دینے کی نااہلی پر خائف ہونے کا رویہ اپنا لے۔ تو اس میں گھٹن کی کیفیت میں خاطر خواہ فرق آ سکتا ہے۔

اللہ کرے۔ آمین

اسلم کمال (لاہور)

گلزار جاوید بھائی اسلام علیکم عید مبارک

ابھی میں محمود ہاشمی جیسی نابغہ روزگار شخصیت کا براہ راست (آپ کے توسط سے) اور بالواسطہ ممتاز احمد' انور سدید' جعفر بلوچ' احمد صغیر' اقبال بھٹی اور رفیع الدین ہاشمی جیسے صائب الرائے حضرات کے حوالے سے تعارف حاصل کر رہا تھا کہ اگلا شمارہ شہریار پر چلا آیا۔

محمود ہاشمی صاحب سے میں اس وقت سے متاثر ہوں جب انہوں نے وحید اختر کے شعری مجموعے کو گلدا گری کے میگنا کارٹا قرار دیا تھا۔ پہلی بار دہلی میں AIR کی اردو مجلس کے لئے اپنا کلام ریکارڈ کرنے کے لیے جب میں گیا تو محمود ہاشمی صاحب سے نیاز حاصل ہوا تھا۔ ان کی تحریر کی کاٹ ''شب خون'' ہی برداشت کر سکتا تھا۔ وہ اپنی شرعی ضرورت کے تحت حیدرآباد بھی آیا کرتے تھے۔ بہرحال آپ نے چہار سو میں ان کے بارے میں اتنا کچھ مواد جمع کر دیا ہے کہ ادب کے طالب علم کے لیے کافی وشافی ہو سکتا ہے۔

ایک معتقری کیا اپنا بھی یہی خیال ہے کہ

غزل یہ وہ ہے کراچی اگر ہوا جانا — تو میں سناؤں گا عبدالعزیز خالد کو

لگتا ہے ان کا ''سخن آفتاب'' شفق سے نبرد آزما ہے ورنہ ان کا حریف قلم کون ہو سکتا تھا محمود ہاشمی کے فوری بعد شہریار کا گوشہ بھی خوب ہے۔ بس علمی و فلمی کا فرق ہے۔

رؤف خیر (حیدرآباد بھارت)

برادرِ عزیز گلزار جاوید صاحب

''چہارسو'' نظر نواز ہوا ''شہریار'' کے حوالے سے تخلیقات، تحریریں، مضامین اور اشاریہ پڑھ کر کافی معلومات میں اضافہ ہوا اگرچہ ان کی شخصیت اور کام سے پہلے بھی آگاہ تھے، مگر ایک اچھا تعارفی گوشہ سامنے آیا ہے اللہ تعالیٰ انھیں مزید توفیقات عطا فرمائے۔

نند کشور وکرم صاحب، یوگیندر بہل تشنہ صاحب، جوگیندر پال صاحب، محترم علیم صبا نویدی صاحب اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں، اردو کی شمع روشن رکھتے ہیں یہ ان کی عظمت ہے میرے والد صاحب تلوک چند محروم کے شاگرد رہے ہیں، رام لعل بھی ہمارے علاقے سے تھے، یعنی میانوالی، عیسیٰ خیل، کلورکوٹ، اور بھکر، اس کے علاوہ گوپی چند نارنگ صاحب بھی لیہ رہے ہیں، محترم علیم صبا نویدی صاحب کی نظموں اور غزلوں کی ایک ابتدائی دنوں کی کتاب میرے پاس ہے میں ان کی شاعری کا مداح ہوں'

کرامت بخاری (لاہور)

برادرم گلزار جاوید صاحب

کل فون پر آپ کو جناب محمود ہاشمی صاحب پر قرطاسِ اعزاز کی اشاعت پر مبارکباد دے چکا ہوں۔ اقبال بھٹی صاحب نے پرچہ بھیجا تھا ان کا شکریہ بھی فون کر کے ادا کیا۔ جناب محمود ہاشمی کو خوبصورت سا کارڈ بھیج کر مبارک سلامت لکھا۔ ان سب باتوں کے پیچھے وہ خوشی ہے کہ وطن میں یہاں بے آباد ایک بلند پایہ قلم کار کا اعتراف کیا گیا۔ وہ تو بہت سینئر ہیں اعلیٰ مقام پر پہلے سے ہی فائز تسلیم کیے جا چکے ہیں۔ اللہ انھیں زندگی و صحت دے۔ آمین

اجازت دیجیے کہ عرض کروں یہاں میرے جیسے چھوٹے موٹے اور بہت سے قلمکار ہیں جن سے برادرِ وطن واقف نہیں۔ ان کو برصغیر میں متعارف کرانے کے لیے ''سخن'' جاری کر رکھا ہے۔ اس کے ذریعے باہمی شناسائی سے 'مرے خیال میں' اردو زبان و ادب کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اسی لئے معتبر اور نامور ناقدین سے یہاں کی تخلیقات پر تبصرے/تجزیے وغیرہ کرائے جاتے ہیں۔ اس طرح ہم وطن میں رواں ادبی رجحانات' نئے تجربوں/تکنیک سے واقفیت حاصل کر کے کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ابھی تو پردیسیوں کی ان کاوشوں کے بارے میں کئی لوگ تحفظات رکھتے ہیں اور تعاون سے ہچکچاتے ہیں لیکن کل انشاء اللہ اس مشق کی افادیت سبھی پر عیاں اور آشکار ہو جائے گی۔

مقصود الٰہی شیخ (یو کے)

پیارے بھائی گلزار جاوید السلام علیکم!

چہارسو ملا، گویا آپ آئے۔ چہارسو قدرِ مختلف لگا۔ آپ کی قدر شناسی کا میں تو اب بھی قائل ہوں آپ ذرہ کو آفتاب بنا دینے پر قادر ہیں۔ آپنے جس شخصیت کو چہارسو میں آراستہ کیا ہے دعا گو ہوں کہ اس کا کلام اور وہ اربابِ علم و ہنر کے لیے باعثِ طمانیت ہو! میں امرِ تنقیح طلب کو تقویت دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ موصوف کی ایک غزل کا آخری شعر ؏

اس حادثے کو کون کرے گا یقین کوئی — سورج کو ایک جھونکا ہوا کا بجھا گیا

اس کا اولیٰ مصرع میں لفظ یقیں کتابت کی خطا سے یقین ہو گیا ہے تاہم یقیں کو یقین رہنے دیا جائے اور لفظ کوئی کو کون کر دیں پھر شعر ملاحظہ کریں۔ برادرم! گزارش ہے کہ اشاعت کی گنجائش کے پیشِ نظر تحریر یا اس کی عبارت کا خیال بھی ناگزیر ہوتا ہے میں شاکی نہیں خائف ہوں کہ میری تحریر یا اس کی چند عبارتیں مبادا کہ پہلے کی طرح کچھ کی کچھ ہو جائیں پلیز دھیان رکھیے گا۔ اس بار چہارسو میں رس رابطے اور آپ کا ڈرامہ آج کی تازہ خبر زیرِ مطالعہ ہے ہنوز۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ کی ساری توجہ ڈرامہ پر ہے زورِ قلم اور زیادہ!

اسلم راہی (اسلام آباد)

محترم گلزار جاوید صاحب، سلام محبت!

''چہارسو'' کا یہ شمارہ بہت خوبصورت اور معیاری ہے برادرم جتیندر بلو۔ دیپک بدکی اور آپکے افسانے بہت پسند آئے۔ شعری حصہ خوب جاندار ہے مگر ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی نظمیں بہت عمدہ لگیں۔ ڈاکٹر آنند غزلیں کم ہی لکھتے ہیں مگر اس بار انہوں نے پنجابی غزلیں پیش کر کے کمال کر دیا ہے خدا ان کی تخلیقی توانائیوں کو مزید جلا بخشے۔ آمین!

گلشن کھنہ (یو کے)

گلزار جی!

السلام علیکم۔ امید ہے آپ خیر و عافیت سے ہوں گے۔ تازہ ''چہارسو'' کی ترسیل کے لیے آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ جناب شہریار پر قرطاسِ اعزاز ہمہ رنگ' ہمہ صفت اور ہر لحاظ سے بھرپور ہے۔ زندہ پرستی کی آپ نے جو مثالیں قائم کی ہیں۔ ان کا جواب نہیں! بے شمار اہلِ قلم کا شہریار کے حوالے سے اظہارِ خیال ان کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ اور قابلِ رشک بھی' آپ کی محبتیں میرے لئے باعثِ اعزاز ہیں۔

سجاد مرزا (گوجرانوالہ)

قابلِ احترام جاوید بھائی۔ آداب!

جشنِ آزادی کے ساٹھ سال مبارک۔ جولائی ۔ اگست کا شمارہ موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔ ہر بار کی طرح یہ شمارہ بھی اپنی روایت کے مطابق معیاری اور جاندار ہے اور آپ کی صلاحیتوں کی غمازی کرتا ہے۔

سبھی افسانے دلچسپ اور جاندار ہیں۔ ''مجرب نسخہ'' شاید مرحوم کدارناتھ شرماجی کا آخری افسانہ ہے۔ ''کھڑکی سے آنے والا جھونکا'' عام آدمی کی سوچ اور فطرت کو بہت خوبی سے بیان کرتا ہے۔ آخر تک دلچسپی بنی رہتی ہے۔ ''معصوم علی'' میں دیپک بدکی صاحب نے جنگ کے نتائج جو عام آدمی کو سہنے پڑتے ہیں اس کی تصویر دل کو چھو جاتی ہے۔

''جھورا منیاری والا'' میں منظر کشی بہت ہی خوبصورت ہے۔ پنجاب کے گاؤں کو لفظوں میں اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کا ہر کردار زندہ جاوید نظر آتا ہے گاؤں کی گلیوں میں گھومتا دکھائی دیتا ہے۔ منظر کشی کا ہنر آپ کے افسانوں کی جان ہے۔ ''میلے'' میں بھی آپ نے اسی خوبی سے منظر کشی کی تھی جو قاری کے ذہن میں دیر تک اپنا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ آپ نے گھر بیٹھے بٹھائے گاؤں کی سیر کرا دی۔

''کیول دھیر کے ادبی سفر کے پچاس سال پر ایک مختصر سے کالم میں آپ نے سب کچھ بہت خوبی سے بیان کر دیا ہے۔ شعری حصے کا مزا ایک ایک شعر پڑھ کر لیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر ریتو بہل (چندی گڑھ بھارت)

محترم گلزار جاوید صاحب' تسلیمات۔

میری غیر حاضری کے باوجود ''چہارسو'' مسلسل مل رہا ہے لہٰذا آپ کی بے پایاں محبت کی داد دینا پڑے گی۔ یقیناً چہارسو برصغیر کے اہم ادبی جرائد میں سے ایک ہے ''قرطاسِ اعزاز'' کے سلسلے نے اس کے قد و قامت میں مزید اضافہ کیا ہے۔ قرطاس اعزاز کے لیے شہریار صاحب کا انتخاب قابلِ قدر ہے۔ پاک و ہند کے باقی اہل قلم کی طرح شہریار صاحب کی کتابیں بھی یہاں کم کم ہی دستیاب ہیں مگر انڈین فلموں کے ذریعے وہ ہم تک مسلسل پہنچتے ہیں۔ بالخصوص ''امراؤ جان'' کی خوبصورت غزلوں نے ہمارے ہاں ایسی دھوم مچائی کہ جادو آج بھی سر چڑھ کے بول رہا ہے اور آئندہ اترنے کی بھی فی الحال امید نہیں۔

دو تین سال قبل شہریار صاحب ہندوستانی ادیبوں کے ایک وفد کے ساتھ پاکستان آئے تھے، جس میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے علاوہ بعض دوسرے نامور اہل قلم بھی شامل تھے۔ اردو سائنس بورڈ کی طرف سے دیے گئے استقبالیے میں ان سے ملاقات رہی۔ مجھے وہ بڑے معصوم اور محبت کرنے والے انسان نظر آئے۔ اس مختصر سی ملاقات کے دھندلے سے نقوش آج تک میرے ذہن پر ثبت ہیں۔ اس محفل میں ہندوستانی اہل قلم نے بڑی بڑی باتیں کیں مگر شہریار صاحب تقریباً خاموش رہے مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ بہت کم گو آدمی ہیں۔ آپ نے شہریار صاحب کو اعزاز بخش کر پوری اردو شاعری کو اعزاز بخشا ہے۔

ڈاکٹر جواز جعفری (لاہور)

برادرم گلزار جاوید صاحب۔ آداب:

''چہارسو'' اور آپ کا محبت نامہ مجھے پچھلے مہینے ملا تھا۔ جواب تاخیر سے دے رہا ہوں، اسکے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل میں ایک مہینہ کشمیر میں تھا اسلئے جواب دینے میں کاہلی ہوئی۔

جانے سے پہلے میں نے آپ کی کہانی ''جھورا منیاری والا'' پڑھی۔ اس کہانی کے کیف و سرور میں ایسا ڈوبا کہ اب تک نشہ اترنہیں پا رہا ہے میرا یقین کیجئے میں آپ کو خوش کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ سچ ہے کہ آپ کی کہانی ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ کاش میں ایک آدھ ایسی کہانی لکھ پاتا۔

دیپک کنول (ممبئی' بھارت)

مدیرِ محترم' سلام و رحمت!

ستمبر' اکتوبر کا ''چہارسو'' شہریار صاحب کے قرطاس اعزاز' کے ساتھ موصول ہوا۔ جسکا سرورق...... کلام شاعر' تصویر شاعر' کا خوشگوار آہنگ لئے ہوئے تھا' غزل کے بھی شعر توجہ کو سبذول' مربوط و متاثر کرنے والے۔ انہی میں سے ایک۔ میں جسم کے حصار میں محصور ہوں ابھی۔ وہ روح کی حدوں سے بھی آگے چلا گیا۔ جناب حیدر نقوی صاحب نے انہیں خوب صورت منظوم توصیف سے نوازا۔ ''چہارسو'' کا انتساب بھی اندھیروں کو اجالوں میں بدلنے کے لئے عمل کی دعا سے مربوط ہے۔

مشیر نیازی صاحب کا تحریر کردہ خط اور ان کے لئے لکھی گئی نظم مشیر نیازی کی یاد میں' باہمی خلوص و محبت کی روشنی میں شعری رشتے کو مزید تابانی عطا کرتے ہیں ان شخصیات کے مابین تحیر کا عنصر حیرانی کی کیفیت کی متاثر کن قدر مشترک ہے۔ نیازی صاحب کہتے تھے کہ شعر کی سب سے بڑی صفت۔ موضوعات کی توسیع کا منفرد پیرایۂ اظہار میں خود کو محسوس کروانا ہے جس کے باعث اس کی تاثیر قاری کو نئے نئے چہرے دکھائے (کہ تنوع و جدت حیرتوں کا اک جہان اپنے اندر لئے ہوتے ہیں)

تمام خلق خدا دیکھ کے یہ حیراں ہے
کہ سارا شہر مرے خواب سے پریشاں ہے

'ورقِ آرزو' سے مختلف ادوار کے ادیبوں و دانشوروں کے ان کے کلام کے مختلف اسالیب سے متعلق مخلصانہ دلپسند یدہ تاثرات پڑھنے کو ملے۔ ''براہ راست'' میں کئے گئے سوالات کے جوابات سے صاحب قرطاس اعزاز

کی ذاتی شعری شخصیت کے کئی ابواب اور شاعری سے متعلق نکتۂ نظر کے کئی دریچے کھلے جو تفہیم و تجزیے کو سہل بناتے گئے۔ دنیا کا طلبگار نہیں میں شہریار صاحب کی دونوں جہتوں کا بحیثیت شاعر اور انسان نہایت اخلاص مندی سے احاطہ کیا گیا...... ''زرد پتے نحیف شاخوں پر'' میں بھی ان کی فکر انگیز نظموں اور غزلوں کا مطالعہ تاثر منفرد شعری محاسن و شاعرانہ نزاکتوں کے ساتھ اس تجزیے کو ہمہ گیر کر گیا۔ میرے حصے کی زمیں' میں ان کی غزل کا تقابل مفہوم کے اشتراک مگر مختلف اظہار بیان کے ساتھ...... تنہائی کی کیفیت کا شعری تلازمات کے ساتھ تجزیہ' توجہ طلب غزلوں کے مطلع ساتھ سونے پہ سہاگہ رہا۔ ''چاند بنا پیراہن' میں بھی معاصرین و تخلیق کاروں نے جداگانہ اسلوب میں بجا طور پر ان کے فن کی ستائش و تحسین کی ہے۔

'Imagination Unchained' میں اردو نظموں کے تراجم نہایت فطری اسلوب کے باعث' حقیقت سے قریب تر اور بزبان دیگر ہو کے بھی پر لطف رہے......

آج کی تازہ خبر' میں طالبات کی نفسیات کو بڑی مشاقی اور چابکدستی سے اجاگر کیا گیا ہے طالبعلمانہ تناظر سے گھریلو ماحول اور پھر فلمی چکا چوند تک کے مختلف مراحل سے گذر کر ڈرامہ اختتامی موڑ پر مرکزی کرداروں کے کلوز اپ پر تحیر انگیز لطف آمیز کیفیت سے دوچار کرتا ہے......

محترم یوگیندر بہل تشنہ کا غزل کی پسندیدگی کے لئے بہت شکریہ

اور سچ تو یہ ہے کہ موجودہ ''چہارسُو'' شہریار صاحب کے لئے قرطاسِ اعزازی نہیں بلکہ شمارہ اعزازی انفرادیت بھی لئے ہوئے ہے......

کیا کوئی نئی بات نظر آتی ہے ہم میں
آئینہ ہمیں دیکھ کے حیران سا کیوں ہے!

شگفتہ نازلی (لاہور)

مکرمی و محترمی گلزار جاوید صاحب' اسلام علیکم

تحفۂ جاں فزا ''چہارسُو'' ستمبر اکتوبر 2007 ءبصد مسرت ہوا اسبار ''چہارسُو'' کا رنگ روپ کچھ بدلا بدلا سا ہے سچ تو یہ ہے کہ ''چہارسُو'' بہروپ میں ہر رنگ میں یکتا ہے نام کی طرح شمال جنوب مشرق مغرب ساری دنیا کے ادب میں اس کی خوشبو پھیلی ہوتی ہے۔ ہر ذہن و دل کو معطر کر رہا ہے۔ گوشہ شہریار خوب ہے۔ آپ میرا کلام شائع ہو یا نہ ہو رسالہ بھیج دیتے ہیں مالک کا کرم ہے۔ آپکی عنایت ہے میں تو آنکھیں بچھائے منتظر رہتا ہوں۔

یوگیندر بہل تشنہ کو میری نظم ''زندگی'' پسند آئی میں اس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ یقیناً ایسے ہی کلمات سے میرے حوصلوں کو جلا ملتی ہے۔ ''آج کی تازہ خبر'' آپکا لکھا ڈرامہ بڑا اچھا لگا۔ آپکی یہ بات مجھے بڑی اچھی لگتی ہے کہ آپ کسی قسم کا امتیاز برتے بغیر پاکستانی ہندوستانی قلمکاروں کو ایک ساتھ شائع کرتے ہیں یہ زبان سے لگاؤ اور محبت کی زندہ مثال ہے۔ آپ نے ماہنامہ تخلیق لاہور کا پتہ ارسال کیا ہے شکریہ۔ میں اپنا کلام ماہنامہ تخلیق کے لئے بھی ارسال کر رہا ہوں پتہ نہیں شائع فرماتے ہیں کہ نہیں شائع بھی کریں تو رسالہ بھی بھیجتے ہیں یا نہیں۔ کیا ضروری ہے کہ ہر کوئی آپکی طرح مخلص ہو۔ ایک شعر آپ کی نذر کرتا ہوں۔ ع

تمہیں اس دور کا انسان کیسے مان لیں آخر
ریا کاروں میں رہتے ہو ریا کاری نہیں کرتے

حفیظ انجم کریم نگری (کریم نگر بھارت)

بڑے بھائی گلزار جاوید' احترامات

ابھی کل کی بات ہے میں' آپ' نند کشور وکرم اور گلزار دہلوی قرۃ العین حیدر کے مکان پر ان سے گفتگو میں مصروف تھے آپ نے ''چہارسُو'' کے لئے انکا انٹرویو بڑی ذہانت سے قلم بند کیا تھا محترمہ قرۃ العین میں کتنی آگ اور توانائی تھی اسکا اندازہ ہم لوگوں کو کچھ ہی پل میں ہو گیا تھا زندگی اور سماج پر انکا نظریہ ہو' ہندوستان اور پاکستان کے بٹوارے کا نظریہ ہو' موجودہ ادب پر انکی آرا ہو ہر شئے پر وہ اپنے منفرد نظریات سے سمجھوتا نہیں کرتی تھیں' اکثر انک میڈیا ہو یا پرنٹ میڈیا لوگ انکے مکان کا طواف کیا کرتے تھے کہ انکا انٹرویو لے لیں مگر وہ ہر کسی کو منہ نہیں لگاتی تھیں کیونکہ انکا ماننا تھا کہ انٹرویو لینے والا صاحب انٹرویو سے' انٹرویو لینے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اردو ادب پر انکی نگاہ ہو میرے قرۃ العین حیدر صاحبہ سے نوئیڈہ میں رہنے کے سبب مراسم بہت اچھے تھے وہ مجھے عزیز رکھتی تھیں اگر میں کافی دنوں تک ان سے نہیں مل پاتا تھا تو وہ مجھے فون کر کے میری خیریت دریافت کرتی تھیں میں کئی لوگوں کو ان سے ملوانے کا کام بھی انجام دیا کرتا تھا شعراء اور ادبا نوئیڈا میں جب آتے تھے انکی ایما پر میں انھیں لیکر قرۃ العین صاحبہ کے گھر جایا کرتا تھا میری وجہ سے ان حضرات کی رسائی آسانی سے ہو جایا کرتی تھی ایک ادبی نشست میں اردو کے ایک ادیب نے آپا سے کہا کہ آپا کل آپ کیا کر رہی ہیں' میں آپ کے گھر آ کر آپ سے کچھ ادبی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

قرۃ العین حیدر صاحبہ نے انھیں برجستہ جواب دیا میں اپنے گھر پر غیر ادبی گفتگو کرنا پسند کرتی ہوں؟...... آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کی گفتگو انکی بات چیت کے دوران چٹکیاں لینے کا انداز' مسکرانا' اور بات بات پر سامنے والے کی بات کو رد کرنا یاد آتا ہے انکی تحریریں کتابی شکل میں موجود رہنگی جو اس بات کا ہمیں احساس دلاتی رہنگی کہ ایک بڑی شخصیت اردو ادب نے پیدا کی تھی جو اپنے زمانے سے آگے کی چیز تھی؟

ملک زادہ جاوید (نوئیڈا بھارت)

☆☆☆